پاکستان کی فعال خواتین

# فصیلوں کے اُدھر

ش۔ فرخ

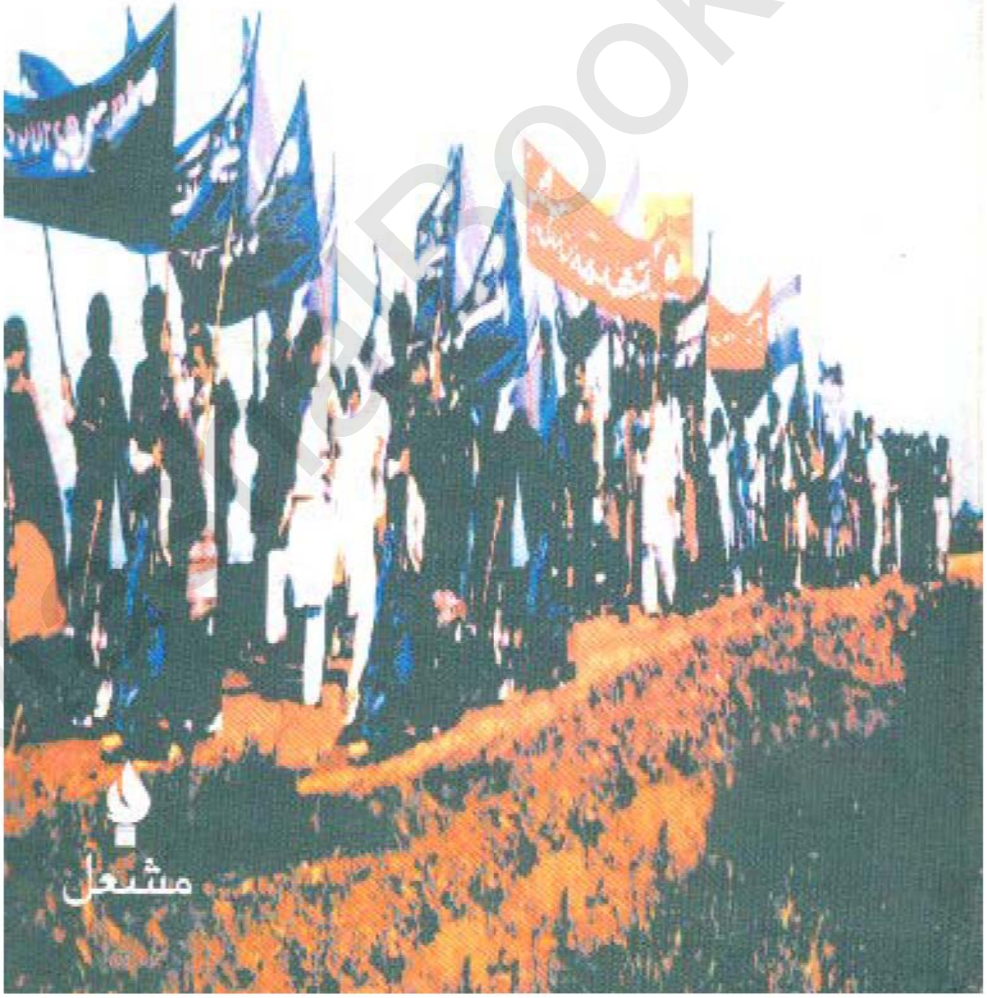

مشعل

MyUrduBooks.org

# فصیلوں کے اُدھر

## پاکستان کی فعال خواتین

ش۔فرخ

مشعل
آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور54600' پاکستان

MashalBooks.org

# فصیلوں کے اُدھر

ش۔فرخ

کاپی رائٹ اردو (c) 2000 مشعل

ناشر: **مشعل**
آر۔بی۔5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان
فون وفیکس:042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

رضیہ بھٹی کے نام

رضیہ بھٹی نے کبھی راست گوئی سے انحراف نہیں کیا۔ یہ اس کی پالیسی نہیں ایک اصول تھا۔ وہ آہنی عورت نہ تھی مگر اس کی ضرب کاری تھی۔ وہ امن کی عورت تھی جو تشدّد کی وادی میں مہربانی کی تلقین کرتی تھی۔

بہ شکریہ: تہمینہ احمد

MashalBooks.org

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
(فیض)

MashalBooks.org

# فہرست

تعارف: ش فرخ 9
دیباچہ: صادقہ صلاح الدین 15
تحریک و تنظیم 19
سنگ میل 27
پیش رفت 33
زری سرفراز 35
فاطمہ شاہ 39
شیریں رشید جان 43
ممتاز نورانی 45
طاہرہ مظہر علی خان 48
زرینہ فضل بھائی 52
انیتا غلام علی 56
رشیدہ پٹیل 60
سلیمہ احمد 64
شمیم کاظمی 68
بلقیس ایدھی 72
شمیم زین الدین 76
تموّج 79
رضیہ بھٹی 81
نجمہ بابر 86

MashalBooks.org

| | |
|---|---|
| عاصمہ جہانگیر | 91 |
| کشور ناہید | 96 |
| نگہت سعید خان | 100 |
| حنا جیلانی | 104 |
| شہلا ضیاء | 108 |
| فریدہ شہید | 111 |
| نسرین اظہر | 115 |
| فریحہ ظفر | 119 |
| خاور ممتاز | 123 |
| فریدہ شیر | 126 |
| روبینہ سہگل | 130 |
| فرزانہ باری | 134 |
| نیلم حسین | 138 |
| سلیمہ ہاشمی | 142 |
| انیس ہارون | 146 |
| ثمینہ رحمٰن | 151 |
| لالہ رخ | 155 |
| مہناز رفیع | 158 |
| کوثر -ایس- کے | 161 |
| نجمہ صادق | 164 |
| طاہرہ عبداللہ | 168 |
| شگفتہ علی زئی | 172 |
| شہناز احمد | 175 |
| کوثر شیخ | 178 |
| زبیدہ مصطفیٰ | 181 |
| زہرہ یوسف | 185 |


MashalBooks.org

ہلڈا سعید 188
نفیسہ ہود بھائی 191
صبا گل خٹک 195
شیما کرمانی 198
مدیحہ گوہر 202
ہما صفدر 205
ثمینہ احمد 208
عظمیٰ نورانی 211
نفیسہ شاہ 214
نوشین احمد 217
دانش زبیری 220
عمل آرائی 223
سیمیں عالم 225
ابان مارکر 229
سنیعہ حسین 233
زیبا زبیر 237
شیریں پاشا 241
فریال علی گوہر 244
نائلہ قادری 248
عنیزہ نیاز انور 252
شفا نعیم 255
عنبرین احمد 259
ذکیہ سرور 263
سیما ملک 266
سفینہ صدیقی 270
امبر علی بھائی 273


MashalBooks.org

| | |
|---|---|
| شمیم ہلالی | 276 |
| جویریہ خالد | 280 |
| نور ناز آغا | 283 |
| پامیلا روڈرکس | 286 |
| رفیعہ خانم ملک | 289 |
| جہاں آرا حیؔ | 292 |
| سیمیں کمال | 295 |
| مہر مارکر | 298 |
| بیگم جان | 300 |
| مریم بی بی | 303 |
| سلمیٰ علی خان | 306 |
| غزالہ نگار اورکزئی | 310 |
| زبیدہ جلال | 313 |
| ثریا امیر الدین | 316 |
| فوزیہ دیبا | 318 |
| ساجدہ قریشی | 321 |
| سلمیٰ جعفر | 324 |
| مسرت ہلالی | 327 |
| ناہیدہ صفدر | 330 |
| فرخندہ اورنگزیب | 333 |
| پروین سکندر | 336 |
| بشریٰ گوہر | 339 |
| فرحت پروین | 342 |
| شکیلہ عبدالقادر | 345 |
| حنیفہ بی بی | 347 |
| مصنفہ کا تعارف | 350 |


MashalBooks.org

# تعارف

''زندگی سانس نہیں، بلکہ عمل ہے۔ ہماری حسیات، ذہن اور اپنے وجود کے ہر اس حصے کا استعمال جو ہمیں ہونے کا احساس دلاتا ہے۔''۔ (روسو)

ایک کانفرنس میں کچھ ایسے سوال اٹھائے گئے تھے:

عورت کے ناطے سے آپ کی پہچان؟

کارکن کی حیثیت سے آپ کی پہچان؟

وہاں سے لوٹنے کے بعد کالم لکھنے بیٹھی تو کاغذ پر جو الفاظ درج ہوئے وہ یہ تھے:

چھوٹے موٹے کام کرنے والیاں
ہم معمولی سی عورتیں
گھسی پٹی روایتوں
سماج کی علامتوں سے نمٹنے والیاں
ہم معمولی عورتیں
جگرے والی عورتیں
نہ رکنے والی عورتیں
ہوا کا رخ بدل دیں گی
ارادہ تو یہی کیا
کہیں تو پہنچ پائیں گی
شناخت کی تلاش میں
ہم معمولی عورتیں

MashalBooks.org

کچھ ایسی ہی بات ہلڈا سعید نے اس طرح لکھی تھی:

''میرے پاس اپنے شناختی کارڈ نمبر ہے مگر میری اپنی کوئی شناخت نہیں''

مشعل پاکستان سے مسعود اشعر کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ میں ان کے لئے ملک کی اہم عورتوں کے بارے میں ایک کتاب لکھوں۔ ذہن میں سوال اٹھا: کون سی اہم عورتیں؟ کس شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے بارے میں لکھوں؟ ادب، فن، درس و تدریس، تحقیق و تنقید، ملازمت پیشہ۔ مطلب یہ کہ وجہ اہمیت کیا ہو؟

چوبیس سال بعد اخباری ملازمت کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر کچھ خواتین سے ملاقات ہوئی۔ انہیں کانفرنسوں میں سنا۔ ان کی جہتوں سے شناسائی ہوئی۔ ان کے ارادوں اور کارکردگی کو دیکھا۔

میں نے مسعود اشعر کے خط کے جواب میں لکھا: میں نے سوچ لیا ہے کہ میں ان عورتوں کے بارے میں لکھوں گی جن کی وجہ اہمیت ان کا ایکٹوزم ہے۔ اپنی ذات، اپنی ضروریات، اپنی اغراض سے نکل کر کسی اور کے لئے کچھ کرنا کہ موجودہ صورت حال میں بہتر تبدیلی لانے کے لئے عملی اقدام کرنا ایکٹوزم کی ابتدا ہے۔ پھر اس کی نوعیت، سمت اور وسعت کا انحصار وقتی تقاضوں پر ہے، حالات پر ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد کوئٹہ کی شیریں رشید جان جب اپنی گھوڑا گاڑی میں دکانوں پر جا کر مہاجرین کے لئے ضروریات کی اشیاء جمع کرتی تھیں تو وہ اس وقت کا تقاضا تھا، ایک ضرورت تھی۔ عملی اقدام کی یہی صورت، ایکٹوازم تھا۔ ہجرت کی دھول بیٹھی تو یہ لازم تھا کہ وہ لوگ جو اپنے گھروں، اپنے کھیتوں، اپنے کاروبار کو چھوڑ کر پاکستان کے خطہ زمین پر آباد ہونے کے لئے آئے ہیں ان کے ہنر اور جوہر کو بروئے کار لایا جائے عورتوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ملکی معیشت کی بہتری کے لئے کردار ادا کریں۔

آج عاصمہ جہانگیر کے ہاتھ میں انسانی حقوق کا پرچم ہے۔ حنا جیلانی اور شہلا ضیا نے عورت کو آئینی حقوق دلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ نگہت سعید خان نے گزشتہ برسوں میں جو کچھ سیکھا، جو کچھ جانا اسے اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کے لئے ویمنز اسٹڈیز کا ادارہ قائم کر دیا۔ انیس ہارون، کراچی میں دہشت گردی اور ماورائے عدالت ہلاکتوں اور بلاامتیاز گرفتاریوں کے بعد دکھی گھرانوں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیواؤں کی بدحالی کو

سنوارنے، انہیں حوصلہ دینے، بے گناہ بچوں کی رہائی کا چارہ کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

پاکستان میں جب ضیاء دور میں عورتوں کے حقوق پر شدید زد پڑی اور ویمنز ایکشن فورم کی تحریک وجود میں آئی تو برسوں تک عورتوں کی تنظیموں نے امتیازی قوانین کو ختم کروانے کے لئے جدوجہد کی لیکن بقول شہلا ضیا کے گزشتہ پندرہ برس سے پاکستانی قوانین پر بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ مگر نہ موجودہ قوانین میں کوئی تبدیلی لائی گئی اور نہ ہی کوئی نیا قانون بنایا گیا۔ فریدہ شہید نے بھی مایوسی کے عالم میں کہا کہ اپنے ملک میں خواتین کی تحریکوں کے بارے میں یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک ہی جگہ پر دوڑ رہے ہوں۔ اس لئے کہ ایک طرف عورتوں کا قوانین میں تبدیلی کا مطالبہ ہوتا تو اس کے فوراً بعد مذہبی بنیاد پرستوں کی جانب اس مطالبے کے خلاف کوئی فتویٰ صادر کر دیا جاتا۔ اب تک تمام حکومتیں مصلحت پسندی کی بنا پر گریز کا راستہ اختیار کرتی رہی ہیں۔ فریدہ شہید نے اپنے ہاں کی عورتوں کے مسائل کے حل کے لئے ایک اور راہ تلاش کی۔ دیگر ممالک میں مسلم قوانین کے تحت رہنے والی عورتوں سے رابطہ اور تحقیق کی، تاکہ بوقتِ ضرورت ٹھوس دلائل سے حریف پر سبقت حاصل کرنا آسان ہو۔

اس کتاب کے ضمن میں تحقیق کے دوران ایکٹوازم کے بارے میں متضاد رائیں معلوم ہوئیں۔ انیس ہارون کا کہنا ہے کہ این جی اوز کلچر نے ایکٹوازم کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے اور یہی بات نگہت سعید نے کچھ اس طرح کہی کہ اب ایکٹوازم 9 سے پانچ بجے تک کا رہ گیا ہے۔ اگر کبھی پانچ بجے کے بعد انقلاب آ گیا تو کوئی ایکٹوسٹ نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس خاور ممتاز کی رائے یہ ہے کہ کسی این جی او کے ذریعے عورتوں کے حوالے سے مختلف مسائل اور موضوعات پر تحقیق کے بعد دستاویزات کو پالیسی سازی کے لئے حکومتی سطح تک لے کر جانا، عام عورتوں سے رابطہ کرنا اور ان میں خود مدد کی تحریک پیدا کرنا ایکٹوزم کی ہی ایک صورت ہے۔ اسی طرح زہرہ یوسف پاکستان انسانی حقوق کمیشن کے نیٹ ورک کے ذریعے کیئے گئے فلاحی کاموں کو ایکٹوزم قرار دیتی ہیں۔

بہرحال اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ عورتوں کی سرگرمیوں اور پاکستان میں عورتوں کی تحریکوں کے بارے میں معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستانی عورتیں کس قسم

MashalBooks.org

کے کاموں میں مصروف رہیں۔ دیگر حصے ''پیش رفت'' ''تموج'' اور ''عمل آرائی'' کے زیرِ عنوان ہیں۔ یہ تقسیم محض وقت یا دور اور کام کی نوعیت کی بنا پر کی گئی ہے۔ ہر ایک کے اپنے اپنے محاذ ہیں۔ ہر ایک نے مسائل سے نمٹنے کے لئے وقت کے تقاضوں کے مطابق مختلف طریقہ کار اختیار کیا لیکن سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

یہ امر واضح طور پر سامنے آیا ہے کہ شعوری بلوغت کے بعد مسائل کا حل مختلف انداز میں تجویز کیا گیا۔ مثلاً قیام پاکستان کے فوراً بعد جو عورتیں جنسی تشدد یا زنا بالجبر کا شکار ہوئی تھیں اس وقت یہی بہتر خیال کیا گیا تھا کہ ناجائز حمل گرا دیئے جائیں۔ حقیقت چھپا دی جائے اور منہ بند رکھا جائے لیکن اس کے 40-45 سال بعد ''وار'' نے سوال اٹھایا کہ یہ عورت زنا بالجبر کا شکار کیوں ہوئی؟ مجرم کون ہے؟ عورت کو کس طرح انصاف دلایا جائے؟ ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب ایک نومولود بچے کو مسجد کی سیڑھیوں پر سنگسار کر دیا گیا تھا۔ اس معاشرے میں جہاں بنیاد پرستی اور تنگ نظری کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہو وہاں بلقیس ایدھی کا جھولا ایک انقلابی قدم تھا۔

''تموج'' کے حصے میں زیادہ تر وہ خواتین ہیں جنہوں نے عورت کے ساتھ ناانصافیوں اور امتیازی سلوک پر حکومت سے ٹکر لی۔ حکومتی فیصلوں کو للکارا۔ ان میں معاشرتی تبدیلی کے لئے جوش و جذبہ ہے۔ تموج کو ویف چیپٹر، کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ویمنز ایکشن فورم پاکستان کی پہلی تحریک تھی جس نے پاکستانی عورتوں کے ایکٹوزم کو ایک نیا رنگ دیا۔ اس فورم سے عورت کو احساس دلایا گیا کہ سماجی کاموں سے زیادہ اہم کام یہ بھی ہے کہ حکومتی سطح پر کئے گئے فیصلوں پر نظر رکھی جائے کہ عورت کے مستقبل کا دارومدار اس پر بھی ہے کہ اسے اپنے ملک کے کیا حقوق حاصل ہیں اور اسے کیا کردار ادا کرنا ہے۔ کوئی بھی موقع ہو ان کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے۔ حالانکہ اس گروہ میں مایوسی پیدا ہوئی ہے۔ انہیں بار بار احساس ہوتا ہے کہ عورتوں کی تحریکوں کی جیسے روح ختم ہو گئی ہو۔

عمل آرائی کی بڑی سمتیں ہیں، تنوع ہے۔ سیمیں عالم کا پنجاب یونیورسٹی کے بنیاد پرست عناصر سے تصادم ہو یا زبیدہ جلال اور بیگم جان کا علاقائی روایتوں سے ٹکراؤ، عورت متحرک نظر آتی ہے۔ وہ دوسری عورت کو جگانا چاہتی ہے۔ اسے ترغیب دیتی ہے کہ وہ اپنے اور دوسروں کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ ان تمام کاوشوں سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑا ہے۔

کچھ نہ کچھ بہتری کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

یہ سب کچھ ناکافی سہی لیکن اس سے یعنی تنظیموں اور تحریکوں کی بدولت عورت اپنی جگہ سے اٹھی ہے اور آگے کی طرف بڑھی ہے۔ ان کا اثر کسی نہ کسی وسیلے سے ہر طبقے کی عورت تک پہنچا ہے، جس کی دو مثالیں شکیلہ عبدالقادر اور حنیفہ بی بی کی ہیں۔ حنیفہ نے نہایت روایتی گھرانے میں آنکھ کھولی اور محض اپنے بل بوتے پر اقتصادی خودمختاری حاصل کی۔ شکیلہ کے لئے عورت کے گھریلو کردار سے نکلنا مشکل تھا۔ اس علاقے میں جہاں مسجدوں سے اعلان کئے جاتے تھے کہ عورتوں کو گھروں سے نہ نکلنے دیں شکیلہ نے برسوں سے بلامعاوضہ اپنے علاقے اور اس کے باسیوں کے لئے بہت سے ترقیاتی کام کئے ہیں اور آج بھی مسلسل عمل پیرا ہیں۔

میں اپنی یہ چھوٹی سی کاوش رضیہ بھٹی کے نام معنون کرتی ہوں۔ برسوں تک، ضیاء دور میں خصوصاً کوئی بھی احتجاجی جلسہ ہو، کوئی بھی موقع ہو اس اجتماع میں وہ دو چہرے ضرور نظر آتے تھے جواب کہیں نہیں ہیں۔ رضیہ بھٹی اور نجمہ بابر کے چہرے۔ کوئی مظاہرہ ہے، تپتی ہوئی کولتار کی سڑک پر ہم سب کے ساتھ وہ دونوں ہمیشہ موجود ہوتیں۔

رضیہ بھٹی کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے لئے میں ریحانہ حکیم ایڈیٹر نیوز لائن اور نجمہ بابر کے بارے میں مواد کے لئے بابر ایاز کی ممنون ہوں۔

میرے اس کام میں ہاتھ بٹا کر میری ساتھیوں اور انٹر پریس کمیونی کیشن کی ارکان ریحانہ افتخار اور حمیرا اطہر نے دیرینہ رفاقت کا مان رکھا ہے۔

ایک روز کراچی پریس کلب میں لنچ کے دوران نفیسہ ہود بھائی کے سامنے اپنے موجودہ پراجیکٹ کا ذکر کیا تو انہوں نے فوری پیشکش کی کہ ان کے پاس جو مواد ہے میں اس سے استفادہ کرنے کی مجاز ہوں اور پھر کئی برسوں پر مشتمل اپنی محنت، یعنی اخباری تراشوں کی فائلیں، میرے سپرد کر دیں۔ ''ورق ورق'' کا باب انہی کا مرہون منت ہے۔ میں نفیسہ کی احسان مند ہوں۔

میں صادق صلاح الدین کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے مصروف شب و روز میں سے وقت نکال کر کتاب کا دیباچہ لکھا۔

ایک بڑا احسان فیض کا بھی ہے۔ کتاب کے کئی نام رکھے اور مٹا دیئے گئے کہ

اچانک فیض کے اس شعر پر نظر پڑی۔ جیسے فال نکل آئی ہو:

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

ش۔فرخ کراچی

یہ کتاب ۱۹۹۸ کے آخر میں تیار ہو گئی تھی لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ اس عرصے میں بعض ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ زبیدہ جلال نئی حکومت میں وزیر تعلیم بن گئی ہیں، کشور ناہید سرکاری ملازمت سے فارغ ہو کر خواتین کی دست کاریوں کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں اور فریال گوہر اقوام متحدہ کے ایک ادارے کے ساتھ منسلک ہو گئی ہیں۔

ش۔ف

MashalBooks.org

# دیباچہ

''فصیلوں کے اُدھر'' پاکستانی خواتین کی پچاس سال پر محیط تگ و دو کو ایک جگہ سمیٹنے کی کامیاب کوشش ہے۔ کتاب کے ابتدائی ابواب تحقیق و تجزیہ کا نتیجہ ہیں، جن میں مختصراً، خواتین کی جدوجہد خاص خاص تحریکوں اور تنظیموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ بڑی بڑی تنظیموں کی پیدائش اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اہم واقعات اور سنگ ہائے میل کا بیان ہے۔ قائدین کی خدمات کا اعتراف ہے اور اس سب کے ساتھ ساتھ پس منظر میں اس وقت حالات اور تقاضوں کا جائزہ ہے۔ صرف یہ تین ابواب پڑھنے سے ہی قاری کو پاکستانی خواتین کی بتدریج کوششوں کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان تنظیموں اور تحریکوں کی کہانیوں کی یوں تو بے شمار پہلو ہیں۔ مگر ان میں تین رجحانات خاص طور سے نظر آتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ایکٹوسٹ خواتین نے اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے تنظیم کاری کو سہارا لیا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر، ہم خیال عورتوں کے تعاون سے اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔ دوئم یہ کہ پچاس سال پر محیط یہ تنظیمیں اپنے اغراض و مقاصد میں ایک دوسرے سے خاصی مختلف نظر آتی ہیں۔ پاکستان کی ابتدائی دو دہائیوں کی تنظیموں میں زور Service Delivery یا خدمات پہنچانے پر تھا۔ خواہ وہ خدمات دستکاری کے اداروں کی صورت میں ہوں یا صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز کی شکل میں۔ ستر کی دہائی سے رجحان میں تبدیلی محسوس ہوئی اور نئی تنظیموں نے معلومات کی فراہمی اور عورتوں کی ترقی پر زور دیا جبکہ آخری دو دہائیوں میں ترجیح شعور کی بیداری، امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج اور حقوق کی جنگ کو دی گئی۔ سوئم یہ کہ ابتدائی دو

دہائیوں کی قیادت عام طور پر ان قائدین کے ہاتھ میں تھی جو اپنے قریبی مردوں کے حوالے سے پہچانی جاتی تھیں جبکہ آخری تین دہائیوں میں خواتین کی تنظیموں اور تحریکوں کی قیادت ایسی شخصیتوں نے کی جن کی پہچان کے نہ کوئی حوالے تھے، نہ خاندانی سیاق و سباق اور نہ سرکاری ناطے۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، متمول گھرانوں سے تعلق رکھنے والی ترقی پسند سوچ کی مالک اور معاشرتی تبدیلی کے خواب دیکھنے والی خواتین ہیں۔

ابتدائی تین مختصر ابواب کے بعد کتاب کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے جو تقریباً نوے ایکٹویسٹ خواتین کی شخصیات کے بارے میں ہے۔ علاوہ چند کے تمام خاکے مصنفہ کی ان شخصیات کے بارے میں ہے۔ علاوہ چند کے تمام خاکے مصنفہ کی ان شخصیات سے ذاتی ملاقاتوں پر مبنی ہیں۔ اس تصنیف کے لئے خواتین کا انتخاب یقیناً ایک مشکل مرحلہ رہا ہوگا۔ اتنی بڑی تعداد میں ایسی خواتین کا انتخاب کرنا جنھوں نے اپنی ذاتی اور تنظیمی حیثیت میں مثبت تبدیلی کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی ہوں، آسان کام نہیں تھا اور پھر اس انتخاب میں توازن کا خیال اس عمل کو مزید دشوار بنا دیتا ہے۔ مصنفہ نے جس مہارت سے مختلف پیشوں، نسلوں اور علاقوں میں توازن برتا ہوتا ہے وہ انھی کا کام ہے۔ اس فہرست میں آپ کو ڈاکٹر، ماہر نفسیات، ماہر تعلیم، صحافی، قانون دان، فن کار، غیر سرکاری تنظیموں کے بانی اور اہم کارکن شخصیات ملیں گی جن کا تعلق ملک کے چاروں صوبوں سے ہے اور جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں خواتین تحریکوں کی قیادت کی ہے۔

ان شخصیات میں ایک کثیر تعداد خواتین کی ہے جو خواتین محاذ عمل یا ویمنز ایکشن فورم کی بانی یا سرگرم اراکین ہیں۔ ان میں تقریباً تمام نے ضیاء الحق کے بھیانک دور کا ذکر کیا ہے، جس کا ظلم WAF کے قیام کا باعث بنا۔ بقول سلیمہ ہاشمی، پاکستان کی عورتیں ضیاء دور کی سب سے بڑی فاتح بن کر ابھری ہیں۔ ان فاتحین کو اپنی کامیابیوں کو بجا ناز بھی ہے۔ حنا جیلانی کہتی ہیں۔ ہمارے شور شرابے کی وجہ سے عورت کی افادیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے قومی ایجنڈے پر لایا گیا۔ ہم نے عورتوں کے حقوق کو عدالتوں تک پہنچایا۔ انہیں سیاسی پارٹیوں کے منشور کا حصہ بنایا گیا۔ ٹھیک ہے ہم حدود آرڈیننس جیسے قوانین کو ابھی تک سرے سے ختم کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن وہ قوانین جو تسلیم شدہ تھے وہ متنازعہ ضرور بنے ہیں۔

اسی قسم کی چھوٹی بڑی کامیابیوں کا ذکر اکثر علاقوں میں ملتا ہے۔ خاور ممتاز کہتی ہیں کہ پاکستانی خواتین کی جدوجہد کے اثرات کچھ نہ کچھ ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بقول کوثر ایس کے ''ناکامی کا احساس نہیں البتہ تھکن اور تکلیف کا احساس ہے کہ اتنی جدوجہد کے بعد ہم رویوں میں مثبت تبدیلی نہیں لا سکے۔'' خواتین کی تحریکوں کے باعث اگر ایک محاذ پر فتح ہوتی ہے تو اس اثنا میں چار اور محاذ کھل جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی انیس ہارون کہتی ہیں کہ ''اگر چار قدم پیچھے جاتے ہیں تو دو قدم آگے بھی بڑھتے ہیں۔'' یہ دو قدم آگے بڑھنے کا احساس ہی اس تحریک میں جان ڈالے ہوئے ہے۔

مصنفہ نے ملاقاتوں کا احوال انتہائی دلچسپ پیرائے میں قلم بند کیا ہے اور سوال کچھ اس طرح پوچھے گئے ہیں، جن کے جوابات سے اس دور کی سیاسی اور معاشرتی صورتحال کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور اس طرح ہر تنظیم اور ہر تحریک کو سیاق وسباق کے حوالے سے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں کیا چیلنجز تھے۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں کیا ایشوز اٹھائے گئے اور پھر ضیاء الحق کے دور سے اب تک کیا ہوتا رہا، یہ سب کچھ ان ملاقاتوں میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

تحریک چلانے میں تحقیق کی کیا اہمیت ہے؟ اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ایک تنظیم کی تو وجہ تسمیہ ہی نیلم حسین نے یہ بتائی کہ ''تحقیق سے حاصل ہونے والے حقائق کو اپنے ایکٹوزم میں شامل کر کے ہی خود کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔'' نیلم کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین اس کتاب میں شامل ہیں جو تحقیق وتربیت میں بہت نام پیدا کر چکی ہیں اور جن کی تحقیق نے ان کی تنظیموں اور تحریکوں کو تقویت بخشی ہے۔

بہت سارے مسائل حل کرنے کے باوجود ان خواتین کا یہ خیال ہے کہ بہت کچھ کرنے کو باقی ہے۔ دراصل ضرورت رویوں میں تبدیلی کی ہے۔ بقول فریدہ شیر کہ ''اصل مسائل اس وقت حل ہو سکتے ہیں جب رویوں میں تبدیلی آئے۔ سوچ میں تبدیلی آئے لیکن یہ ایک طویل المدت کام ہے۔''

پاکستان کی یہ باعمل خواتین اس طویل المدت چیلنج کو قبول کئے ہوئے ہیں اور اپنی تحریک کی نئی سمت کے بارے میں سوچتی ہیں۔ اس سلسلے میں خاور ممتاز نے بہت اہم بات کہی ہے کہ ''معاشرتی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی کے لئے صرف عورتوں کی سیاسی گری کافی

MashalBooks.org

نہیں۔ اس کی خاطر ایک یونائیٹڈ فرنٹ بنانا ہوگا۔ جس میں ملک کے تمام مظلوم طبقے شامل ہوں ان میں ٹریڈ یونینز ہوں، مزدور ہوں، ہاری ہوں۔ یعنی باقی سول سوسائٹی سے رابطوں کی اشد ضرورت ہے اور اب میں خطوط افراد وتنظیموں کو سوچنا ہوگا۔ اگر وہ کسی بڑی تبدیلی کے خواب دیکھ رہے ہیں تو پھر ان تمام قوتوں کو مل کر جدوجد کرنی ہوگی جو ایک سیاسی جمہوری عمل کے ذریعے تبدیلی میں یقین رکھتے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت کچھ ہو چکا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ باعمل خواتین ہمیں یہ بھی احساس دلاتی جاتی ہیں کہ ابھی بہت طویل سفر باقی ہے۔ طاہرہ مظہر کہتی ہیں کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کا شعور بڑھا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔''

یہ کتاب بہت کچھ کرنے کے لئے قاری کو ترغیب دیتی ہے اور یہی اس کا مقصد اور اس کی کامیابی ہے۔

''فصیلوں کے اُدھر'' کی اشاعت پر نہ صرف مصنفہ بلکہ ''مشعل'' بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔ جس نے اس موضوع پر لکھنے کے لئے ایک بہت جانی پہچانی مصنفہ کا انتخاب کیا۔ آخر میں اس کتاب کی ایک کمی کی جانب اشارہ کرنا چاہتی ہوں۔ اور وہ یہ کہ اس میں ان گمنام، خاموش صداؤں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی جو اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پاکستان کے دیہی علاقوں اور شہری کچی بستیوں میں حالات کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میرا اشارہ یہاں خواتین کی عوامی سطح کی تنظیموں سے ہے جن کی تعداد پورے ملک میں دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ان تنظیموں کی قائد خواتین گو کہ جدید علم سے زیادہ آشنا نہیں لیکن اپنے علاقے کی پائیدار ترقی کی ضامن ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ کسی اور موقع پر ''مشعل'' ان صداؤں کی جانب بھی توجہ دے گا اور یہ گمنام سپاہی بھی اپنی سوچ اور اپنے خوابوں کو الفاظ میں ڈھال سکیں گے۔

صادقہ صلاح الدین

# تحریک و تنظیم

## پس منظر

''وہ دن گزر گئے جب یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پنجاب کی مسلم عورتیں صرف کھانا پکانے اور بچے پالنے کے لائق ہیں۔ اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں اپنے مرد ساتھیوں کی ذمہ داریوں میں بھرپور شرکت کریں۔''

لیڈی مراتب علی کا خطاب۔ 13 جنوری 1942ء

یہ وہ دور تھا جب محمد علی جناح کی سربراہی میں تحریک پاکستان زور پکڑ رہی تھی۔ جناح کو عام مسلمان عورتوں کی پستی کا پورا احساس تھا۔ وہ عورتوں کی کمیٹیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے اور سیاسی میدان میں عورتوں کی شرکت کی ضرورت کو تسلیم کرتے تھے۔

لیکن تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہوئے ذرا پیچھے کی طرف جائیں تو اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مسلمان عورتوں کا عملی میدان میں آنے کے ضمن میں تحریک خلاف نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ہندوستان کے ہر مسلمان مرد عورت اور بچے کو درج رجسٹر کیا گیا تھا اور یہ برصغیر کا پہلا واقعہ تھا جب عورتوں نے سیاسی تحریک میں شرکت کی۔ ابتدا میں عورتوں کے علیحدہ اجلاس لکھنؤ اور دہلی میں منعقد ہوتے جن سے علی برادران کی والدہ بی اماں خطاب کرتیں اور حاضرین میں ممتاز مسلمان مردوں کی مائیں اور بیویاں ہوتیں۔

1917ء میں بی اماں نے تمام روایات توڑتے ہوئے، اپنے بیٹے (محمد علی) کی جگہ، جو برطانوی حکمرانوں کی حراست میں تھے،صرف مردوں پر مشتمل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا۔ بے شک بی اماں کا خطاب پردے کے پیچھے سے تھا،لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مسلمان عورت نے اتنے پرہجوم اجلاس سے خطاب کیا تھا۔ بی اماں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کی مذمت کرنے اور خلافت تحریک میں شریک ہونے کی تلقین کرتی رہیں۔ 1921ء میں لاہور کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنا نقاب اٹھا دیا۔

دوسرا بڑا واقعہ ہے جب مسلمان عورتیں بڑی تعداد میں اس وقت سیاسی تحریک میں شامل ہوئیں جب تصور پاکستان واضح ہو رہا تھا۔مسلمان مردوں اور عورتوں نے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے مضامین لکھے اور اجلاس منعقد کئے گئے۔مسلم لیگ نے عورتوں کا شعبہ قائم کیا اور 23 اپریل 1940ء کو مسلمان لیڈروں کی گرفتاری اور خاکسار تحریک پر پابندی لگانے کے خلاف لاہور میں ایک تاریخی جلوس نکالا گیا۔ بے شک اس وقت عورتوں کے حقوق کا مسئلہ زیرغور نہ تھا لیکن یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مسلمان عورتیں سڑکوں کی سیاست میں ملوث ہوئی تھیں اور اس وقت کے پریس نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اسے عورتوں کا زوال قرار دیا تھا۔

## اولین تنظیم سازی

پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کو پاکستان میں عورتوں کی تنظیموں کی خاتون اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے 1948ء میں ویمنز والینٹری سروس (WVS) کا آغاز کیا۔ اس وقت اہم درپیش مسائل میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے پناہ گزینوں کی آبادکاری، فرسٹ ایڈ، غذا کی تقسیم، صحت کے مسائل اور دیگر متعلقہ امور سے نمٹنا تھا۔ رعنا لیاقت علی کی تنظیم سازی کی اس پہلی کاوش کو بہت سراہا گیا اور کثیر تعداد میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر اس کی رضاکارانہ خدمات میں شرکت کی اور بھرپور کردار ادا کیا۔ اسی سال جب کشمیر میں ہندوستان کے ساتھ جنگ شروع ہوئی تو رعنا لیاقت نے عورتوں کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیش کیا جس پر پاکستان ویمنز

MashalBooks.org

نیشنل گارڈ (PWNG) اور پاکستان ویمنز نیول ریزرو (PWNR) کا قیام عمل میں آیا۔ رعنا لیاقت نے ایک موقع پر پی ڈبلیو ڈی این آر کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کے دفاع، ترقی اور بہتری کے لئے کام کریں۔ یہ وقت نہیں ہے کہ پاکستان کی 40 ملین عورتیں گھروں میں خاموش بیٹھی رہیں۔ انہیں کام سیکھنے کے لئے اپنے گھروں سے نکلنا ہوگا تاکہ پھر وہ اسے دوروں کو سکھائیں۔''

رعنا لیاقت کی سربراہی میں آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کا قیام 22 فروری 1949ء کو عمل میں آیا۔ ویمنز والینٹری سروس میں بڑی تعداد میں عورتوں کی شمولیت حوصلہ افزا تھی۔ رعنا لیاقت کا مطمع نظر تھا کہ اگر عورتیں اپنے گھروں میں واپس چلی تو یہ ایک بڑا زیاں ہوگا۔ انہوں نے کراچی میں ایک کانفرنس بلائی جس کے اختتام پر اپوا کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔

ویمنز والینٹری سروس کے زیر اہتمام پناہ گزینوں کی آبادکاری کا کام بخوبی نمٹایا جا چکا تھا۔ یہ ایک طرح سے حکومتی کاموں میں ہاتھ بٹانے کا عمل تھا۔ تقریباً اسی نوعیت کے منشور کے ساتھ اپوا کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ بے شک اس کا مقصد ملک کے معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی لانا نہ تھا۔ بہرحال اس کے تحت پاکستانی عورت کو معاشرے کا سودمند رکن بنانے کے لئے خاطر خواہ اقدامات کئے گئے اور ملک بھر میں اپوا کی قائم کردہ شاخوں کے زیر اہتمام تعلیم و تربیت تعلیم و تربیت اور صحت کے بارے میں بہت سے منصوبوں کا آغاز کیا گیا اور انہیں احسن طریقوں سے پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔

اپوا کی کارکردگی میں عورتوں کی تعلیم اور ہنرمندی کو فروغ دینا، اسکول کالج اور انڈسٹریل ہومز کھولنے کے علاوہ عورتوں کے حقوق اور قانونی معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے عورت کی حیثیت کے ضمن میں کئے گئے اقدامات بھی شامل ہیں۔ عائلی قوانین کے بارے میں اپوا نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس تنظیم کی جانب سے 1953ء میں صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں عورتوں کی دس نشستوں کو دس سال کے لئے وقف کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

اپوا کی سرگرمیاں ہمیشہ نیم گرم انداز میں جاری رہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں نیا خون شامل نہیں کیا گیا۔ یوتھ ونگ کا قیام محض برائے نام تھا۔ رعنا لیاقت کے

MashalBooks.org

انتقال کے بعد تنظیم کی ڈور ہمیشہ عمر رسیدہ خواتین کے ہاتھوں میں ہی رہی جن کے لئے بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں سے نمٹنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

بہرحال رعنا لیاقت کو آج کی عورت کی جدوجہد میں شمولیت کا اعزاز اس طرح حاصل ہے کہ جب ویمنز ایکشن فورم نے ضیاء دور میں وضع کئے گئے امتیازی قوانین کے خلاف دستخطی مہم چلائی تو اس پر سب سے پہلا دستخط رعنا لیاقت کا تھا۔

سنہ 78ء میں رعنا لیاقت کو اقوام متحدہ کی جانب سے انسانی حقوق کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا تھا ''اپوا اپنی جدوجہد آنے والے عشرے اس کے بعد کے عشرے اور اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک کہ پاکستانی عورت اقتصادی، سماجی، سیاسی اور دیگر زنجیروں کو توڑ کر نہ ابھرے گی۔ اس کے سامنے ایسا مستقبل ہوگا جس پر کوئی ایسا سایہ نہیں ہوگا جو اس کی انتہائی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔''

قیام پاکستان کے بعد اولین دور میں اپوا کے علاوہ دیگر کئی تنظیمیں عمل میں آئیں۔ ان میں سے چند ایک کا قیام خصوصی مقاصد کے تحت کیا گیا تھا جو مختلف شعبوں میں سرگرم عمل تھیں۔ ان میں فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان، گرل گائیڈز ایسوسی ایشن، ینگ ویمن کرسچئن ایسوسی ایشن (YWCA) قابل ذکر ہیں۔

وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے 1899ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جس کی شاخیں تقسیم ہند سے پہلے ہی پاکستان کے مختلف شہروں میں موجود تھیں۔ اس تنظیم نے نہ صرف کارکن عورتوں کو ہوسٹلز کی سہولت فراہم یک بلکہ سیکریٹریل کام اور دفتری ایڈمنسٹریشن کی تربیت بھی فراہم کی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد عیسائی لڑکیوں نے شہری علاقوں میں سیکرٹری کے کام کی ذمہ داریاں بخوبی طور پر سنبھالیں۔ وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے نے ان کی تربیت کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔

اس زمانے کی دیگر اہم تنظیموں میں فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن اور کراچی بزنس اینڈ پروفیشنل ویمنز کلب قابل ذکر ہیں۔ ویمنز کلب کی شاخیں، لاہور، پشاور اور راولپنڈی میں بھی کھولی گئیں۔ بعد میں اسے فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمنز کلبز کا نام دیا گیا۔ اس تنظیم کے ایک گروہ نے الگ ہو کر ایسوسی ایشن آف بزنس، پروفیشنل اینڈ ایگری کلچر ویمن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس نے تجارت اور ملازمت پیشہ عورتوں کے علاوہ

زراعت سے منسلک عورتوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔

عورتوں کی تنظیموں میں بہبود ایسوسی ایشن کا نام بھی نمایاں ہے۔ اس کا قیام 1967ء میں عمل میں آیا۔ یہ ایک سماجی بہبود کی تنظیم ہے جس کے مقاصد میں تعلیمی اداروں اور انڈسٹریل ہومز کا قیام سرفہرست ہے۔ یہ ادارہ ضرورت مندوں کو مالی اور طبی امداد بھی فراہم کرتا ہے۔''بہبود'' نے عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

## ایوب آمریت کے خلاف

جب کبھی پاکستانی عورتوں کا ملک میں جمہوریت کی بحالی کی خاطر اور آمریت کے خلاف جدوجہد کا ذکر آئے گا تو فاطمہ جناح کا نام سرفہرست ہوگا۔ فاطمہ جناح کو بطور صدارتی امیدوار جب 1965ء کے انتخابات کے لئے نامزد کیا گیا تو ایوب خان نے نہ صرف علما کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور ان سے فتوے دلائے کہ عورت ایک اسلامی ملک کے سربراہن ہیں بن سکتی بلکہ ان کا یہ کہنا تھا کہ فاطمہ جناح ایک ذہنی مریضہ ہے جسے قائداعظم کمرے میں بند کر دیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم جب 1930ء میں برطانوی حکومت کی دعوت پر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تھے تو فاطمہ جناح ان کے ہمراہ تھیں۔ جب انہوں نے وطن واپس آ کر مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے راس کماری سے کشمیر تک کے دورے کیے تو فاطمہ جناح نے برصغیر کی مسلمان عورتوں کو بیدار کرنے اور میدان عمل میں لانے کی ذمہ داری سنبھالی اور اس مقصد کے لئے دور دراز علاقوں اور شہروں میں خواتین کے جلسوں سے خطاب کیا۔

اپریل 1943ء میں دہلی ویمن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں فاطمہ جناح نے طالبات کو تلقین کی کہ ''وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ان واقعات میں یعنی سیاسی اور ایسے دیگر امور میں جو ہماری قومی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، گہری دلچسپی لیں۔'' قائداعظم نے کئی موقعوں پر اپنی بہن کی اولوالعزمی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

قیام پاکستان اور ایوب آمریت کے درمیانی عرصے میں فاطمہ جناح کی سیاسی سرگرمیوں میں ایک وقفہ آ گیا تھا لیکن وہ ایوب خان کے مدمقابل سیاسی میدان میں اتریں تو

پشاور سے چٹا گانگ تک عوام کا جمِ غفیر سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ یہ فاطمہ جناح کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ فاطمہ جناح انتخابات ہار گئیں تھیں لیکن آمریت کے خلاف جدوجہد کے زیریں ٹھنڈے اور گرم دھارے سطح پر ابھر آئے جو ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی مقبولیت کی صورت میں واضح ہوئے۔

## پہلا جمہوری دور

بھٹو کے دور میں عورتوں کی تنظیموں کو سب سے زیادہ فروغ ملا۔ اس زمانے میں کچھ ایسی تنظیمیں وجود میں آئیں جن کا مزاج اور دائرہ کار پہلے سے موجود تنظیموں سے مختلف تھا۔ گو کہ یونائیٹڈ فرنٹ فار ویمنز رائٹس کا قیام 1955ء میں عمل میں آیا تھا جس نے ملک میں پہلی بار عورتوں کے حقوق کی بات اٹھائی تھی۔ فرنٹ کا قیام عورتوں کے ایشوز اٹھانے میں سیاسی پارٹیوں کی بے توجہی اور ناکافی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا، تاکہ عورتوں کے مسائل پر آواز اٹھائی جا سکے۔ فرنٹ کا بنیادی مقصد قوانین میں اصلاحات کروانا تھا۔ جب فیملی لاز آرڈیننس وضع کر لیا گیا اور ایوب خان نے سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں لگا دیں تو فرنٹ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ بھٹو کے دور میں آئین 73ء کے ضمن میں سرگرم عمل رہا۔ لیکن آئین بننے کے بعد پھر بکھر گیا۔

اسی دوران ''ویمنز فرنٹ'' ''عورت'' اور ''شرکت گاہ'' قائم ہوئیں۔ 75-1974ء میں قائم ہونے والا ویمنز فرنٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی پر جوش طالبات کے ایک گروہ پر مشتمل تھا جن کے نظریات بائیں بازو کے تھے۔ اس نے عورت کے معاشرے میں مقام، اس کی کارکردگی کو تسلیم نہ کرنے، عورت کے مساوی حقوق اور کام کرنے کے حقوق کے ضمن میں جدوجہد کا آغاز کیا لیکن 77ء کے بعد عالمی اور ملکی، دونوں سطحوں پر سیاسی تبدیلیوں کی بنیاد پر بائیں بازو کی بہت سی تنظیمیں خاموش ہوتی گئیں اور فرنٹ بھی ان میں سے ایک تھا۔

''عورت'' کا قیام 77-1976ء میں ہوا جس میں اسلام آباد کی بائیں بازو کی سیاست میں دلچسپی لینے والی یونیورسٹی ٹیچرز، طالبات اور ملازمت پیشہ خواتین شامل تھیں۔ ''عورت'' کے نام سے ایک نیوز لیٹر نکالنے کے علاوہ اس تنظیم نے اسلام آباد کے نواح میں

کم آمدنی والے علاقوں میں کام کیا۔

1970ء کے عشرے میں معرض وجود میں آنے والی تنظیموں میں ''شرکت گاہ'' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ سنہ 1975ء میں عورتوں کے عالمی سال کے سلسلے میں منعقد کی گئی کانفرنسوں کے بعد بطور تنظیم ابھری۔اس کا بنیادی مطمحِ نظر یہ تھا:

''ایسی عورتیں جو قومی ترقی پہلے سے مشغول ہیں یا وہ اس کام میں شریک ہونا چاہتی ہیں ان کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کو فروغ اور تحفظ دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ وہ معاشرے میں بھرپور مساوی کردار ادا کرسکیں۔''

عورتوں میں شعور بیدار کرنا اور عورتوں پر تحقیق، قانونی اور طبی امداد فراہم کرنا اور ملازمت پیشہ خواتین کے حقوق کے لئے پریشر گروپ کا کردار ادا کرنا ''شرکت گاہ'' کے مقاصد میں شامل تھا۔

## کالے قوانین کا دور

جس طرح پیپلز پارٹی ایوب آمریت کی پیداوار تھی، اسی طرح ویمنز ایکشن فورم ضیا آمریت کا تحفہ تھا۔

پاکستان کے آئین 1973ء کی شق 25 ہے کہ ''صنف کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔''

مگر 1979ء میں ضیاء الحق نے حدود آرڈیننس نافذ کر دیا جس کا پہلا وار فہمیدہ اور اللہ بخش پر ہوا۔ یہی مقدمہ اور اس کی سزا ویمنز ایکشن فورم کے قیام کا سبب بنی۔ یہ پہلی تنظیم تھی جس نے ریاست کے خلاف براہ راست آواز اٹھائی تھی۔ ملک بھر سے عورتوں کا ایک ریلا اٹھا تھا جس نے اس پلیٹ فارم سے ضیاء آمریت کو للکارا تھا۔

فروری 1981ء میں کراچی پریس کلب میں ویف کے پہلے اجلاس میں تقریباً ہر مکتب فکر کی خواتین کی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ان میں سے کچھ نے ابتدائی مراحل کے بعد بوجوہ ''ویف'' سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے باوجود ویف کو کراچی، لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور میں کم از کم 20 ہم خیال تنظیموں کی حمایت حاصل ہوئی۔

ویف کے اغراض و مقاصد یقیناً سیاسی تھے لیکن بظاہر اس کی وابستگی کسی سیاسی

جماعت سے نہ تھی اور نہ ہی یہ تنظیم پارلیمانی سیاست میں ملوث تھی البتہ ویف نے عورتوں سے متعلق جن مسائل کو اٹھایا تھا اس سے قبل کسی سیاسی پارٹی نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ مارشل لاء حکومت کی طرف سے آئینی ترامیم کے خلاف جدوجہد یقیناً سیاسی معاملہ تھا لیکن ویف کا مقصد ان مسائل کے معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی مضمرات کو بھی زیر بحث لانا تھا۔

## ویف کا موٹیو

''ہمارا یہ عہد ہونا چاہئے کہ ہم اپنی ذات میں اور ایک وسیع تناظر میں ایک نئی عورت اور ایک نیا دن لانے کا ارادہ کریں۔ مضبوط ہوں، خوش امید ہوں اور جدوجہد کریں۔''

ویف کا نصب العین اور اس کا مطمح نظر ایک ایسی عورت کی تشکیل وتجدید ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سر اٹھا کر چلتی ہوں۔ جو اپنے آپ میں اور زمانے کی نظر میں ایک مکمل انسان ہو۔ جو اپنے انسانی حقوق سے بہرہ ہو، جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ہو، جو اپنے اوپر کی مظلومیت کو طاری کرنے کے بجائے ''ظالم'' کا ہاتھ روکنے کی طاقت رکھتی ہو۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ویف عورتوں کی تحریک کا ایک بڑا سرچشمہ ثابت ہوا ہے جہاں سے ہر جانب کئی اور دھارے نکلے ہیں۔ وہ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان ہو، شرکت گاہ یا عورت فاؤنڈیشن، اثر ریسورس سینٹر، سیمرغ ہو یا ساہی، ایسی تمام تنظیموں نے اپنے اپنے مورچے سنبھالے ہوئے ہیں، جن کا نشانہ مشترکہ دشمن کی طرف ہے، یعنی ایسا ملکی نظام جو عورت کو کمتر قرار دیتا ہے، جو اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتا ہے، وہ رکاوٹیں، وہ فرسودہ روایتیں جو عورت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، جو اسے آدھا انسانی قرار دیتی ہیں اور وہ رویے جو اس کے حقوق کی پامالی کرتے ہیں۔

''جدوجہد جاری ہے''۔

# سنگِ میل

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران خواتین سے متعلق واقعات کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

## 1947ء سے 1961ء

پہلے مرحلے کا آغاز خواتین کے خلاف قدامت پرستوں کے غیر متوقع حملے سے ہوا ہے جس کا اختتام نسبتاً خوشگوار انداز میں 1961ء میں فیملی لاز کے نفاذ کے ساتھ ہوا۔

اس عرصے میں جمہوری تجربات کمزور رہے۔ اولاً نو سال تک آئین ہی نافذ نہ ہو سکا۔ وہ مذہبی گروپ جو پہلے پاکستان کے مطالبے ہی کے خلاف تھے، انہیں یہ موقع مل گیا کہ وہ اس تاثر سے فائدہ اٹھائیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے لہٰذا اسے مذہبی خطوط پر چلایا جائے۔ مذہبی جوش وخروش کا اظہار خواتین کے خلاف مہم میں زیادہ موثر طور پر کیا جاسکتا ہے۔

اس دور کے اہم واقعات کی مختصر فہرست اس طرح سے ہے:

1948ء: ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ مہاجرین کی رضاکارانہ بحالی میں مدد دینے کے لئے ویمن والنٹری سروس کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم پرسنل لاء میں خواتین کے حق ملکیت (بشمول زرعی اراضی کی ملکیت کا حق) کو شامل کیا گیا۔

1949ء: مولانا مودودی نے پردے کے بارے میں اپنا فتویٰ دیا۔ پاکستان ویمن نیشنل گارڈز اور آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن (اپوا) کا قیام عمل میں آیا۔

1954ء: خواتین کے حقوق کا ایک چارٹر دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا، جس

میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ تمام قانون ساز اسمبلیوں میں دس فیصد نشستیں خواتین کے لئے مخصوص کر دی جائیں۔ خواتین کو مساوی درجہ اور مساوی حقوق دیئے جائیں۔ مساوی کام کی مساوی اجرت دی جائے اور مسلم پرسنل لاء میں خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی نے یہ چارٹر متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ البتہ خواتین کی دس فیصد نمائندگی کے مطالبے میں ترمیم کر کے اسے تین فیصد کر دیا گیا۔

1955ء: مسلم پرسنل لاء میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لئے رشید کمیشن قائم کیا گیا۔

1956ء رشید کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ کمیشن کے مذہبی رکن مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس کے ساتھ اپنا زوردار اختلافی نوٹ لکھا۔

1961ء: رشید کمیشن کی سفارشات پر مبنی مسلم فیملی لاء آرڈیننس نافذ کیا گیا جس میں مسلمان مردوں کے ایک سے زائد شادیاں کرنے پر بعض پابندیاں لگائی گئیں۔ شادی اور طلاق کی رجسٹریشن لازمی قرار دی گئی۔ متوفی والدین کے بچوں کو وراثت کا حق دیا گیا۔ شادی کے معیاری فارم متعارف کرائے گئے اور شادی کے لئے لڑکی کی کم سے کم عمر چودہ سال سے بڑھا کر سولہ سال کر دی گئی۔

## 1962ء سے 1976ء:

سنہ 1962ء سے 1976ء کی مدت کو پاکستان میں گزشتہ نصف صدی کے دوران خواتین کے لئے بہترین زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں دنیا بھر میں خواتین کی تحریکیں نئی بلندیاں چھو رہی تھی اور پاکستان کی خواتین بھی قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس مدت کے دوران مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا جس کی وجہ سے خواتین اخلاقی، سماجی اور سیاسی قوت کے ایک بڑے ذریعے سے محروم ہو گئیں۔ علاوہ ازیں ملک کے پہلے عام انتخابات نے روشن خیال اور رجعت پسند طبقوں کے درمیان اختلافات بڑھا دیئے۔

### اس دور کے اہم واقعات

1965ء: محترمہ فاطمہ جناح نے متحدہ حزب اختلاف کی امیدوار کی حیثیت سے صدارتی انتخاب لڑا اور بے مثال اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ ان کے خلاف

MashalBooks.org

کیچڑ اچھالنے کی مہم جس طرح چلائی گئی اس سے ثابت ہوا کہ اخلاقی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔

1968ء: مغربی پاکستان میں فوجی آمریت کے خلاف اپوزیشن کی تحریک کی قیادت نصرت بھٹو نے کی۔

1972ء: انتظامی اصلاحات کے نتیجے میں خواتین کو سول سروسز میں آنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل امور خارجہ اور ضلعی انتظامیہ جیسے شعبے ان کے لئے ممنوع تھے۔

1973ء: نئے آئین میں خواتین کے لئے بے مثال حقوق کی ضمانت دی گئی۔ آئین میں خواتین کے لیے بے مثال حقوق کی ضمانت دی گئی۔ آئین میں خواتین کی سماجی، معاشی اور سیاسی حیثیت کے بارے میں ماضی کی عدم مساوات کو ختم کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ خواتین صوبائی گورنر، قومی اسمبلی کی اسپیکر اور ایک یونیورسٹی کی وائس چانسلر مقرر کی گئیں۔

1975ء: پاکستان خواتین کے عالمی سال کی تقریبات میں شریک ہوا اور اس نے میکسیکو ڈیکلریشن پر دستخط کئے۔

1976ء: حکومت نے خواتین کے حقوق کی کمیٹی قائم کی جس کے سربراہ اٹارنی جنرل تھے۔ کمیٹی کو خواتین کی حیثیت بہتر بنانے کی سفارشات پیش کرنا تھیں۔

## 1977ء سے 1997ء

تیسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد شروع ہونے والا یہ دور خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کا بدترین دور تھا۔ قوانین میں خواتین کے خلاف ترامیم کی گئیں۔ ذرائع ابلاغ کو خواتین کی غلامی اور پدرشاہی ڈھانچے کو مستحکم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

اس مدت کے دوران واحد مثبت علامت ایک مضبوط اور بلد آہنگ خواتین کے حقوق کی تحریک تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جب سیاسی اظہار کے تمام ذرائع مسدود کر دیئے گئے تھے تو اس وقت پاکستانی خواتین نے ایک جابر آمر کی قوت کی بڑی بہادری سے چیلنج کیا۔ پندرہ سال کے بعد پاکستانی خواتین کی یہ تحریک ترقی پذیر دنیا میں خواتین کی جدوجہد کا سب سے موثر نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

## اس دور کے اہم واقعات

1978ء: سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب پر نظر ثانی کی گئی۔ نصابی کتابوں میں خاص طور پر خواتین کے خلاف موقف اختیار کیا گیا۔ الیکٹرانک میڈیا اور فلموں پر سنسر شپ عائد کی گئی۔

1979ء: حدود اور زنا آرڈیننس نافذ کیے گئے جو کہ جدید مسلم تاریخ میں خواتین کے خلاف قانونی امتیاز کی بدترین مثال ہے۔ ان قوانین کے تحت گرفتار کی جانے والی قیدی خواتین کی تعداد میں بکثرت اضافہ ہوا۔ وفاقی سطح پر ایک خواتین ڈویژن قائم کیا گیا۔ خواتین کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ ٹیلی ویژن کی اناؤنسرز کو سر ڈھانپنے کا حکم ہوا۔ سرکاری ملازم خواتین کو اسلامی طرز کا لباس پہننے کی ہدایات دی گئیں۔

1982ء: وفاقی حکومت نے حکم جاری کیا کہ نویں جماعت اور اس سے اوپر کی طالبات دوپٹے اوڑھیں گی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے یہ تلقین کی گئی کہ خواتین صرف اشد ضرورت کی صورت میں گھر سے باہر نکلیں۔

وفاقی شریعت کورٹ نے بطور قاضی تقرری کے لئے خواتین کو اہل قرار دیا۔

لاہور میں امتیازی قوانین کے خلاف عورتوں کے ایک مظاہرے پر لاٹھی چارج کیا گیا اور پولیس نے آنسو گیس پھینکی جس کے بعد خواتین کی جانب سے فوجی حکومت کے خلاف پرعزم جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا۔

1983ء: زنا بالجبر کا شکار ہونے والی 18 سالہ نابینا صفیہ بی بی کو تین سال قید پندرہ کوڑوں اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی لیکن اندرون ملک اور بیرون ملک جگ ہنسائی کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت نے اس کیس کا نوٹس لیا اور سزا منسوخ کر دی۔ فوجی حکومت نے انصاری کمیشن قائم کیا جس کا کہنا تھا کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں بن سکتی تاوقتیکہ اس کی عمر پچاس سال نہ ہو، وہ بھی اس صورت میں کہ اسے اپنے شوہر کی تحریری اجازت حاصل ہو۔

1984ء: اسلامی نظریاتی کونسل نے اعلان کیا کہ برتھ کنٹرول اسلامی تعلیمات

MashalBooks.org

کے خلاف ہے۔ اسقاطِ حکومت کی صرف اس صورت میں اجازت ہے جب عورت کی جان کوخطرہ ہو۔ نیا قانونِ شہادت نافذ کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ مالی اور معاہداتی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی ہے۔ نامزد کردہ مجلس شوریٰ نے قصاص اور دیت کا قانون نافذ کیا جس کے تحت مقتول عورت کے قصاص کی رقم مرد کے مقابلے میں آدھی ہوگی۔ جنوبی پنجاب میں نواب پور میں ایک عورت کو برسر عام برنہ کیا گیا۔

1985ء: قومی اسمبلی میں خواتین کے لئے مخصوص نشستوں کی تعداد بڑھا کر پیش کر دی گئی۔ قومی اسمبلی کے دو ارکان نے پارلیمنٹ میں ایک نجی شریعت بل پیش کیا۔ خواتین کی حیثیت کے بارے میں کمیشن کی رپورٹ قومی اسمبلی میں پیش کی گئی لیکن اسے شائع نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ حدود آرڈیننس کے خلاف زبردست سفارشات کی گئی تھیں۔

1986ء سرحد کی صوبائی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں خواتین کو علیحدہ رکھنے کو لازمی قرار دیا گیا۔

1988ء: بے نظیر بھٹو جدید مسلم دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم بنیں۔ ان کا عورت ہونا ان کے خلاف دائیں بازو کی دشمنی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

1990ء: بے نظیر کی حکومت برطرف کر دی گئی۔

1992ء: وزیراعظم نواز شریف نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورتوں کے گھر جانا اور ان سے ہمدردی ظاہر کرنا شروع کی۔

1993ء: بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ پاکستان کی وزیراعظم منتخب ہوئیں۔

1994ء: بڑے شہروں میں خواتین پولیس اسٹیشن قائم کئے گئے۔ اعلیٰ عدالتوں میں خواتین جج مقرر کی گئیں۔

1995ء: سرکاری وفد کے علاوہ بڑی تعداد میں این جی اوز کی نمائندہ خواتین نے بیجنگ کانفرنس میں شرکت کی۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے کنونشن سیڈا (Cedaw) پر دستخط کیے جس میں خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز ختم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے جج کی نگرانی میں تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد امتیازی قوانین اور دیگر متعلقہ امور کا جائزہ لینا تھا۔

1996ء: دوسری بار بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔

1997ء: تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ پاکستانی عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے پرزور سفارشات دی گئیں۔ اس رپورٹ کو بھی حسبِ سابق کسی سردخانے میں محفوظ کر دیا گیا۔

MashalBooks.org

# پیش رفت

MashalBooks.org

MashalBooks.org

# زری سرفراز

''میں نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاء الحق سے کہا: جنرل صاحب! میں تو سیاست سے کنارہ کش ہو چکی تھی۔ پھر بھلا آپ نے مجھے ویمنز کمیشن کا چیئرپرسن کیوں بنایا۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اپنی مرضی کی رپورٹ بنواسکیں گے تو یہ نہیں ہو گا۔ میں ربڑ اسٹیمپ نہیں ہوں۔ آپ کو میرا سیاسی بیک گراؤنڈ معلوم ہے۔''

زری سرفراز 1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کی سربراہی میں قائم ہونے والے 13 رکنی ویمنز رائٹس کمیشن میں شامل تھیں۔ اس کمیشن میں پاکستان کی آٹھ اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس کمیشن کے قیام کا بنیادی مقصد پاکستان کی عورتوں کی معاشرتی، قانونی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا۔

ویف بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد زری سرفراز ویمنز ایکشن فورم کی سرگرم کارکن تھیں۔ ویف کی ارکان کو شکایت تھی کہ زری سرفراز نے انصاری کمیشن میں نامزدگی کے فوراً بعد ویف میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔

جنرل ضیاء الحق نے پہلی ملاقات میں زری سرفراز کے سوال کا جواب یہ دیا تھا ''آپ کا نام مولانا ظفر احمد انصاری نے پیش کیا تھا۔''

''میں پاکستان کی عورت کو چودہ سو سال پہلے کے دور میں نہیں لے جانا چاہتی۔ میں میانہ رو مزاج رکھتی ہوں۔'' جنرل ضیاء الحق کو زری سرفراز کا جواب۔

زری سرفراز کی سیاسی سرگرمیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ انہوں نے تحریک پاکستان سے لے کر انصاری کمیشن میں شمولیت تک ہر دور حکومت میں بھرپور کردار ادا کیا۔

MashalBooks.org

وہ 52-56 میں سرحد اسمبلی، 56-58 میں مغربی پاکستان اسمبلی، 62-69 تک قومی اسمبلی کی رکن رہیں۔

یہ سنہ 45 کا ذکر ہے۔ نوعمر زری اپنی والدہ کے ساتھ دہلی، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ وغیرہ کی سیاحت کے لئے نکلی تھیں کہ بیگم تصدق حسین سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پیشکش کی کہ وہ مسلم لیگ ویمنز ونگ کی رکن بن جائیں اور شیخوپورہ کے جلسے میں شامل ہوں۔ زری تیار ہوگئیں۔ وہاں جلسے کے دوران انہیں خطاب کرنے کی دعوت بھی دی گئی۔ اس واقعے کے تقریباً 5 ماہ بعد بیگم تصدق نے کہلوایا کہ مسلم لیگ کی لیڈر خواتین سرحد میں عورتوں سے خطاب کرنا چاہتی ہیں۔

''یہ وہ زمانہ تھا'' زری سرفراز یاد کر رہی تھیں ''جب یہ کہا جاتا تھا کہ عورت کے تین گھر ہیں۔ باپ کا، شوہر کا اور قبر۔ قبائلی عورتیں ڈولیوں میں بیٹھ کر باہر نکلتی تھیں۔ یہ ایک چیلنج تھا کہ عورتوں کا جلسہ منعقد کیا جائے۔ سب نے مشورہ دیا کہ اپنے گھر پر جلسہ کرلو۔ یہ بھی کہا کہ کرسیاں نہ منگوانا۔ کیونکہ سرحد کے مرد اس بات کو باعث شرم خیال کرتے تھے کہ عورت کرسی پر بیٹھی ہو۔ ہم نے چارپائیوں کا انتظام کیا۔ میں نے مسلم لیگی لیڈر عورتوں سے کہا کہ میں نوشہرہ ریلوے اسٹیشن پر برقعے لے کر آؤں گی۔ آپ سب انہیں ضرور پہن لینا ورنہ بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ ان خواتین میں بیگم تصدق حسین، بیگم شاہنواز، لیڈی عبداللہ ہارون، بیگم اعزاز رسول شامل تھیں۔ جلسہ ہوا۔ چار پانچ سو عورتیں حاضرین میں تھیں۔ ان دونوں انگریز حکومت کی طرف سے جلسے جلوسوں پر پابندی تھی۔ ہندوؤں نے چیلنج کیا ہوا تھا کہ دیکھتے ہیں کس کی مجال ہے جو جلوس نکالے ہم نے جلوس نکالا اور مردان کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومے۔''

1961ء میں ایوب خان کے دور حکومت میں فیملی لاز آرڈیننس نافذ کیا گیا جس کا بنیادی مقصد مردوں کی کثیر الازدواجی روش کو روکنا، طلاق اور نکاح نامے کو باضابطہ بنانا تھا۔

ایوب خان جس فیملی لاز آرڈیننس کو پارلیمنٹ میں لے کر آئے تھے وہ دراصل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عبدالرشید کی سربراہی میں قائم کئے گئے کمیشن کی ترمیم شدہ صورت تھی جس کی رپورٹ 1956ء میں تیار ہوئی تھی۔ زری سرفراز اس تمام عمل میں سرگرم

MashalBooks.org

رہیں۔ کہتی ہیں:

''ہماری کمیٹی میں 15-20 مرد تھے اور میں اکیلی عورت تھی۔ شیخ خورشید احمد وزیر قانون تھے۔ مرد ارکان ملاؤں سے دبتے تھے۔ تمام بنیاد پرستوں کا مطالبہ تھا کہ فیملی لاز آرڈیننس ختم کیا جائے۔ میں اس معاملے میں اس نے جھگڑتی تھی۔ پھر عورت کی وراثت کے مسئلے پر بھی بہت لے دے ہوتی۔''

زری سرفراز نے اعتراف کیا کہ بھٹو نے فیملی لاز آرڈیننس کو تحفظ دیا اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن افسوس یہ کہ اس میں مزید بہتری نہ لائی جا سکی۔

انصاری کمیشن سے منسلک ہونے کے بعد ''ہمارا مطمح نظر تھا کہ پاکستان کی عورت کو وہ تمام مراعات ملنی چاہئیں جو اس کا حق ہے اور جو ایک انسان کو ملنی چاہئیں۔ ہم نے اس دوران ملک کے کونے کونے میں ہر شعبہ زندگی کی عورتوں سے ملاقاتیں کیں تاکہ ان کے حالات اور مطالبات معلوم ہو سکیں۔ ہمارے گروپ میں ایک خاتون تھیں جس کا تعلق ایک تنگ نظر جماعت سے تھا اور اسے ضیاء الحق نے خاص طور پر شامل کیا تھا۔اس کا نظریہ تھا کہ ریڈ لائٹ کے علاقے کی عورتوں سے نہیں ملنا چاہئے بلکہ ہم نے جب فلمی اداکاراؤں سے بھی ملاقات کی تو انہیں بہت برا لگا تھا۔''

ایک بار جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ لاہور کی طوائفوں کو شہر سے نکال کر راوی کے کنارے آباد کر دیا جائے تو ہم کچھ خواتین ان سے ملنے گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''آپ ہم سے کیا چاہتی ہیں۔ اپنے مردوں کو روکیں جو چھپ چھپا کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہمیں کوٹھے پر انہی نے بٹھایا ہے ہم تو شادی کر کے اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہیں۔''

اسلامی قانونی حقوق کے بارے میں زری سرفراز کی ملاقات ایک عرب قانونی مشیر سے ہوئی۔ زری سرفراز نے پوچھا کہ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کو ہاتھ نہیں ملانا چاہئے۔ اس پر عرب نے کہا ''ہاتھ ملانے سے جسم میں کرنٹ دوڑ جاتا ہے۔ زری سرفراز نے برجستہ جواب دیا کہ ''میرا تعلق ایک ایسے معاشرے سے ہے، جہاں ایک نہیں دونوں ہاتھ ملائے جاتے ہیں، لیکن کبھی کرنٹ نہیں دوڑا۔''

زری سرفراز کا تعلق مردان کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد سری نگر کانوونٹ میں پڑھا۔ پھر پشتو اور انگلش میں آنرز

MashalBooks.org

کیا۔

زری سرفراز نے اپنے سیاسی دور میں بہت سے وفود کی سربراہی کی اور دنیا بھر کے بے شمار ممالک میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ وہ عورتوں کی نیروبی کانفرنس میں بھی شریک تھیں۔

''نیروبی کانفرنس کے آخری روز ایک قرارداد آئی کہ عورتوں اور مردوں کی اجرتیں مساوی ہونا چاہئیں۔ اس کانفرنس میں 150 ملکوں کی عورتیں شریک ہوئی تھیں۔ ہر طرف اس کی حمایت میں آوازیں آئیں سوائے ایک کے۔ وہ امریکی وفد کی لیڈر مورین ریگن تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ مجھ پر یہودی عورتوں کا بہت دباؤ تھا۔ وہ سب کی سب آجر تھیں۔ اس لئے وہ کارکن عورتوں کی مساوی اجرتوں کی مخالف تھیں۔'' زری سرفراز اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی عورتوں کو پورے حقوق حاصل نہیں ہیں، جبکہ ہم تو ایک پسماندہ ملک کے رہنے والے ہیں۔

''عورتوں کے حقوق کے لئے اتنے برس جدوجہد کی، لیکن ضیاء الحق نے سب پر پانی پھیر دیا۔ ہمیں کیا ملا حدود آرڈیننس۔ آدھی گواہی اور آدھی دیت۔ یہ ناانصافی ہے۔ ہم نے جو ایک رپورٹ لکھ کر دی وہ اب کسی لائبریری میں پڑی ہوگی۔ جب تک کوئی اسے پڑھے گا وہ سفارشیں فرسودہ ہوچکی ہوں گی۔

زری سرفراز آج کل پاکستان کی دستکاریوں پر کام کر رہی ہیں۔ ''ہمارے استاد دستکار رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ان کا فن ان کے ساتھ دفن نہ ہوا۔ اسے آئندہ نسلوں میں منتقل ہونا چاہئے۔''

زری سرفراز کی شادی 19 برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ شوہر پھوپھی زاد تھے لیکن وہ دائمی مریض تھے اور زری سرفراز 20 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ ان کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ والد نے بیٹوں کے برابر کا حصہ بیٹی کو دیا تھا۔ اپنی اور بھائیوں کی زمینوں کی دیکھ بھال انہی کی ذمہ داری ہے۔

MashalBooks.org

# فاطمہ شاہ

''اس صبح بھی، ہر روز کی طرح میں اپنے لاؤنج میں بیٹھی بینائی کے بغیر اپنے سنسان مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملازم نے اطلاع دی کہ ایک امریکی خاتون مجھ سے ملنے آئی ہے۔ میں ان دنوں لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی تھی۔ لیکن مجھے اس مہمان کی آمد پر حیرت ہو رہی تھی اور میں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ مجھے ایک خوشگوار آواز سنائی دی۔ نووارد نے خود کو متعارف کروایا کہ وہ ایزابیلا گرانٹ ہے۔ اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا کہ میں اس کی رفاقت میں پرسکون ہو گئی۔''

یہ اقتباس ڈاکٹر فاطمہ شاہ کی تصنیف ''معذوری، خود مدد اور معاشرتی تغیر'' سے ہے۔

فاطمہ شاہ کی بینائی جاتی رہی تو ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ لیکن ایزابیلا گرانٹ سے مذکورہ ملاقات کے بعد ان کی زندگی میں کس قدر تبدیلی آئی، اس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا:

''ایزابیلا نے بتایا کہ 60 سال کی عمر میں سکول ٹیچر کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ دنیا کے سفر پر نکلی ہیں تاکہ ایشیا اور افریقہ کے نابیناؤں کی خود مدد کی تحریک بنائی جائے اور اسے مضبوط کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔''

فاطمہ شاہ نے ایزابیلا سے پوچھا کہ وہ کس کے ساتھ سفر کر رہی ہیں؟ انہوں نے بخوشی جواب دیا کہ ان کے ساتھ آسکر شریک سفر ہے۔ ''تو پھر وہ کہاں ہے؟ کیا وہ شہر میں موجود ہے؟'' ایزابیلا نے کہا ''کیوں نہیں۔ لو آسکر سے ملو۔'' اور انہوں نے اپنی سفید

چھڑی فاطمہ شاہ کے سامنے بڑھا دی۔

یہ وہ لمحہ تھا جس نے میری زندگی بدل دی اور مجھے اچانک روشنی دکھائی دی۔ اگر ایزابیلا ساٹھ سال کی عمر کے بعد سفید چھڑی کے ہمراہ دنیا کا سفر کر سکتی ہے کہ وہ نابینا کمیونٹی کے لئے فلاح و بہبود کے کام کر سکے تو بھلا میں 43 سال کی عمر میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر اس کمرے میں آزردہ خاطر کیوں بیٹھی ہوں۔

فاطمہ شاہ بھیرہ، ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہائی سکول کا امتحان طلائی تمغے کے ساتھ پاس کیا۔

لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی سے میڈیکل پاس کیا اور میرٹ پر میکڈونلڈ سکالرشپ حاصل کیا۔

اسی سال یعنی سنہ 36 میں طویل علالت کے بعد والدہ انتقال کر گئیں۔ والد علی گڑھ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر اور اس شعبے کے چیئرمین تھے۔ والد نے دس سال قبل دوسری شادی کر لی تھی۔ ان تمام حالات کی بنا پر فاطمہ شاہ کا بچپن بہت افسردہ گزرا۔ تعلیم سے فارغ ہوئیں تو ہاؤس جاب کے لئے گورکھپور گئیں۔ وہیں پر ایک سجادہ نشین سے شادی ہو گئی اور میاں صاحب کے اصرار پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ زندگی کا یہ دور بقول فاطمہ شاہ کے بہت عیش و عشرت کا تھا۔ ان دنوں پاکستان بننے کے امکانات نظر آ رہے تھے تو میاں نے انہیں کراچی بھیجا کہ تم جا کر مکان وغیرہ خرید و تا کہ پاکستان بننے کے بعد ہم وہاں چلے جائیں۔ مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ وہ واپس نہ جا سکیں نہ ہی مکان خریدا۔ وکٹوریہ روڈ پر کرائے کا مکان لے کر رہنے لگیں اور 30 سال تک اسی میں رہیں۔ فاطمہ شاہ کی دو بیٹیاں ہیں۔

کچھ عرصہ بعد شوہر نے دوسری شادی کر لی اور فاطمہ کی دونوں بیٹیاں ان کے پاس ہی رہیں۔ شوہر کی بیوفائی پر ایک آنکھ کی بینائی چلی گئی اور چند برس بعد دوسری آنکھ کی روشنی بھی ختم ہو گئیں۔

جب پاکستان بنا تو فاطمہ شاہ کراچی میں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستانی خواتین کی واحد تنظیم اپوا پناہ گزینوں کی آبادکاری اور دیگر مسائل کے حل کے لئے سرگرم عمل ہو چکی تھی۔ فاطمہ شاہ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئیں۔ ڈاکٹر تھیں اس لئے عورتوں کے طبی مسائل

کے لئے کارگر ثابت ہوئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ موم بتی کی روشنی میں بے شمار عورتوں کے بچے پیدا کرائے اور بہت سی عورتوں کے اسقاط ہوئے۔

فاطمہ شاہ کی امریکی نابینا خاتون سے ملاقات 1959ء میں ہوئی اور انہی کی تلقین وترغیب پر جنوری 1960ء میں پاکستان ایسوسی ایشن آف بلائنڈ (PAB) وجود میں آئی اور فاطمہ سنہ 84 تک اس کی صدر رہیں۔ جب تنظیم کا آغاز ہوا تو ایسا نابینا شخص ملنا دشوار تھا جو آفس سیکرٹری اور خزانچی کے فرائض سنبھال سکے۔ مجبوراً ایک آنکھوں والے شخص کو یہ کام سونپا گیا۔ لیکن ان تھک محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ملک کے چاروں صوبوں میں اس ادارے کی 30 ضلعی شاخیں ہیں اور اس کے 10 ہزار نابینا مرد اور عورتیں ممبر ہیں۔

''پیب'' کے اغراض و مقاصد میں نابیناؤں میں معذوری کے احساس کو ختم کرنا اور انہیں مفید شہری بنانا ہے تاکہ وہ خود مدد سے فعال زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔ نیز یہ کہ سرکاری سطح پر ایسی قانون سازی کے لئے جدوجہد کی جائے کہ نابیناؤں کی ملازمتوں کا کوٹہ مقرر کیا جائے اور انہیں تربیت کے لئے بریل تکنیک کی سہولت فراہم کی جائے۔

اس سے قبل نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے کام خیراتی انداز میں کئے جاتے تھے۔ ان سے کرسیاں بنوانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ فاطمہ شاہ کو اپنے کاموں کی سب سے بڑی تحریک امریکہ میں منعقد کی گئی ایک کانفرنس سے ملی۔ انہوں نے اس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کانفرنس میں ملائشیا، سری لنکا، بنکاک، لاطینی امریکہ، گوئٹے مالا، ہندوستان اور امریکہ کی مندوبین نے شرکت کی۔ فاطمہ شاہ نے نابینا ہونے کے بعد پہلی بار تنہا امریکہ کا سفر کیا۔ یہ ان کے لئے ایک منفرد تجربہ تھا اور جب انہوں نے اس کانفرنس میں شریک عورتوں کو دیکھا کہ وہ سب کی سب نابینا تھیں تو ان کی زندگی کا نیا باب کھل گیا۔ ''سفید چھڑی کا تحفظ'' ان کی زندگی کا نصب العین بن گیا۔ سفید چھڑی کے تحفظ کا دن سنہ 1964ء سے ہر سال 15 اکتوبر کو دنیا بھر میں منایا جاتا ہے۔ سفید چھڑی اب نابینا افراد کی نقل وحرکت کا سائنٹفک آلہ ہے اور یہ ان کی قوت اور خودمختاری کی علامت ہے۔

سنہ 1975ء میں بگراڈ (یوگوسلاویہ) میں منعقد ہونے والی ایک عالمی کانفرنس میں نابینا عورتوں کی برادری میں شرکت کے موضوع پر فاطمہ شاہ کی آواز اٹھی تھی۔ ''ہمارے

MashalBooks.org

ہاں اندھی لڑکیاں سبزی ترکاری کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ والدین اور رشتے داروں کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں اور ان کی خیرات پر پرورش پاتی ہیں۔انہیں اجنبیوں اور مہمانوں سے چھپایا جاتا ہے کہ وہ یہ نہ جان لیں کہ اس گھر میں ایک اندھی لڑکی رہتی ہے۔''

دس سال بعد اپنے ادارے کی 25 سالہ کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے فاطمہ شاہ نے نابیناؤں کے لئے کئے گئے تربیتی اور ترقیاتی کاموں کی ایک طویل فہرست پیش کی جس میں بریل پریس اور اس میں شائع کی گئی بریل کتابوں کا خصوصی ذکر انہوں نے کیا۔

پیب کے زیر اہتمام سنہ ساٹھ کی دہائی میں کراچی کی فیکٹریوں اور کارخانوں کا سروے کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ اندازہ لگانا تھا کہ کیا وہاں ایسے کام ہیں جو اندھے لوگ کر سکیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فیکٹریوں میں بے شمار کام ہیں جو اندھے افراد بخوبی کر سکتے ہیں۔ مثلاً اشیا کی پیکنگ وغیرہ۔ کچھ ایسی مشینیں بھی تھیں جنہیں وہ چلا سکتے ہیں۔ سروے کے بعد مالکان سے رابطہ کیا گیا کہ یہ نہ صرف آپ کے کاروبار کے لئے مفید ہے بلکہ اس سے اندھوں کی زندگی میں انقلاب آ جائے گا کہ وہ اپنے اور معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

مختلف حکومتوں کے ادوار میں مسلسل کوششوں کے نتیجے میں معذوروں کے لئے جنہیں اب خصوصی افراد کہا جاتا ہے، ملازمتوں کا دو فیصد کوٹہ مختص ہو چکا ہے لیکن یہاں بھی اندھی لڑکیوں کے لئے رکاوٹیں تھیں۔ انہیں ملازمت دینے سے گریز کیا جاتا کہ ان کی ذمہ داری لینا مشکل ہے لیکن تنظیم کی کوششوں سے اس رجحان میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ خرکار نابیناؤں کو بھکاری بنا کر کاروبار کرتے ہیں۔ پیب نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ فاطمہ شاہ کا کہنا ہے کہ ''جب کبھی اندھا بھکاری تنظیم کی رکنیت کے لئے آیا تو ہم نے انکار کر دیا۔ اس لئے بھی کہ ان کی آمدنی اتنی ہوتی ہے کہ وہ تنظیم کو چندہ دے سکتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ بھیک مانگنا چھوڑ دو اور ہنر سیکھو، ہم رکنیت دینے کو تیار ہیں، تو وہ اس پر راضی نہیں ہوتے۔''

فاطمہ شاہ پارلیمنٹ کی رکن بھی رہی ہیں۔ انہیں اس پر فخر ہے کہ وہ دنیا کی واحد نابینا عورت ہیں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ انہیں اپنی طویل خدمات کے سلسلے میں کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز دیئے گئے۔ ان میں تمغہ پاکستان بھی شامل ہے۔

MashalBooks.org

# شیریں رشید جان

''یہ سنہ 1946ء کا ذکر ہے۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ کوئٹہ کے نواح بارکھان میں لڑکیوں کا سکول نہ تھا۔ مجھے لڑکوں کے سکول میں داخلہ ملا۔ میں واحد لڑکی تھی جو لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ انہی دنوں اطلاع آئی کہ قائداعظم بلوچستان کے دورے پر آ رہے ہیں۔ ہم سب اپنے قائد سے ملنے کے لئے بیتاب تھے۔ ہم نے بڑی تگ و دو کے بعد قائداعظم تک رسائی حاصل کر لی۔ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔''

شیریں رشید جان کو وہ تاریخی لمحہ ہمیشہ یاد رہا۔ جب قائداعظم نے کہا کہ آپ میرا پیغام اور نظریہ پاکستان کے لوگوں تک پہنچائیں، شیریں رشید جان نے کوئٹہ کے ہر گلی محلے میں جا کر پیغام قائد پہنچایا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سائیکلوں پر شہر بھر میں جاتیں۔ انہوں نے کوئٹہ کے علاوہ پشین، چمن، گلستان، فورٹ سنڈیمن (موجودہ ژوب) لورالائی، دکی، زیارت، مچھ اور قلات تک سفر کیا اور اپنے فرض کو جوش و جذبہ کے ساتھ نبھایا۔

اس کے بعد ایک اہم کام یہ تھا کہ لڑکیوں اور خواتین کو ابتدائی طبی امداد اور شہری دفاع کی تربیت دی جائے تا کہ ہنگامی صورت حال میں عورتیں اپنے محلوں کو سنبھال سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد جب مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تو شیریں ان کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود ہوتیں۔ پھر انہیں محلوں میں پہنچایا جاتا اور ضروری سہولتیں اور امداد دی جاتی۔

ان دنوں شیریں کے پاس ایک گھوڑا گاڑی تھی۔ وہ اسے خود چلاتیں اور مختلف دکانوں پر جا کر مہاجرین کے لئے راشن، برتن، کپڑے، بستر اور کمبل وغیرہ جمع کرتیں۔

شیریں نے یہ کام جو شروع کیا تو پھر قدم آگے بڑھتے ہی رہے۔ اس ضمن میں

انہیں اپنی والدہ سے بھی حوصلہ ملا۔ وہ خود بھی مہاجرین کی آبادکاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

شیریں رشید کی مادری زبان فارسی ہے مگر وہ صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود انگریزی کے علاوہ اردو، پنجابی اور پشتو زبان پر عبور رکھتی ہیں۔ انہوں نے نرسنگ کی تربیت بھی حاصل کی اور طویل عرصے تک اس پیشے سے منسلک رہیں۔

ان کی سماجی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ غریبوں، ناداروں اور بیواؤں کی سرپرستی کے لئے وقف کیا۔ وہ کوئٹہ کی گلیوں میں رہنے والے بچوں کے دلوں میں بستی ہیں اور وہاں کی ہر عورت ان کی بے لوث جذبے کی گواہی دیتی ہے۔ وہ ان دنوں بھی بہت سی سماجی تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شیریں رشید کو ان کی خدمات کے صلے میں متعدد انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ انہوں نے شادی نہیں کی کہ دھیان لوگوں کی خدمت میں لگا ہوا تھا اور گھر پر والدہ کی علالت قدم روکے رہی۔

MashalBooks.org

# ممتاز نورانی

برس پر برس گزرتے رہے۔ چاہے وہ کسی ترقی پسند ادیب کی کتاب کی تعارفی تقریب ہو، کوئی مشاعرہ ہو، کہیں خواتین کے خلاف مارشل لا کے دور میں وضع کئے گئے امتیازی قوانین کے خلاف احتجاجی جلسہ ہو، بہت سارے لوگوں کے بیچ ایک ایسا شفیق چہرہ نظر آ جاتا تھا کہ آگے بڑھ کر سلام کرنے کو جی چاہے۔

یہ ممتاز نورانی ہیں۔ عرصے سے علیل ہیں۔ بہت سے جان لیوا امراض نے گھیر رکھا ہے لیکن پھر بھی کچھ ہمت بندھتی ہے تو کسی نہ کسی محفل میں شریک ہو جاتی ہیں۔

انہوں نے سوچا تھا، ایک خواب دیکھا تھا، جدوجہد کی تھی۔ خوش گماں تھیں کہ جمہوریت آ جائے گی تو عورتوں کے مساوی حقوق مل جائیں گے۔ وہ جس انجمن کی سرگرم رکن رہیں اس کا بنیادی مقصد عورتوں کو آزادی دلانا تھا۔ فرسودہ روایتوں سے آزادی، جہالت سے آزادی، پدرشاہی سے آزادی، لیکن اس کے ساتھ ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ عورتوں میں سیاسی شعور پیدا ہو کہ عورت اپنے حقوق کے لئے اسی وقت جدوجہد کر سکتی ہے جب اس میں سیاسی شعور ہو گا۔

ممتاز نورانی بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق کچھ میمن برادری سے ہے۔ وہ کبھی سکول نہیں گئیں۔ اس زمانے میں ممتاز کے خاندان کی لڑکیاں سکول نہیں جاتی تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا یہ احساس ہوا کہ معاشرے میں مردوں کی حاکمیت ہے۔ گھر میں باپ نے جو کچھ کہا وہ اٹل ہے۔

ماں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ باپ سے محبت بہت تھی لیکن ماں کی حالت دیکھ کر جی دکھتا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ تین بچے ہیں۔ شوہر ترقی پسند تھے۔ ماں باپ کے گھر سے بہتر سسرال کا ماحول لگا۔ ممتاز کے ذہن میں شروع ہی سے طبقاتی تفریق کا شعور جاگ گیا تھا۔ شادی کے بعد جدید ادب کو پڑھنے کا شوق ہوا۔ شوہر کا تعاون حاصل ہوا اور زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کا موقع ملا۔

پاکستان بنا تو عمر 25 برس تھی۔ سنہ 48 میں انجمن جمہوریت پسند خواتین کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے کراچی سے لاہور گئیں اور اس کی رکنیت حاصل کی۔ کراچی سے لاہور تک کا سفر اور خواتین کی ترقی پسند تنظیم کی شاخیں دراصل اس پودے سے پھوٹی تھیں جس کی نشوونما بہت برسوں سے ہو رہی تھی۔ جب بمبئی میں انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کے اجلاس ہوتے تھے۔ برصغیر کے ادیب بیسویں صدی کے قومی، بین الاقوامی مسائل اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھنے لگے تھے۔ انہی تحریروں نے ممتاز کی فکر کی آبیاری کی تھی۔ مثلاً سجاد ظہیر کی تصنیف جسے مکتبہ دانیال نے شائع کیا تھا، اس کے دیباچے میں سبط حسن نے لکھا تھا ''ترقی پسند ادب کی تحریک کبھی مر نہیں سکتی۔ شمعیں جلتی بجھتی رہتی ہیں مگر زندگی کی انجمن سلامت رہتی ہیں۔

ممتاز کو اپنے شوہر کی جانب سے حوصلہ افزائی کے علاوہ کانگریسی لیڈر صوفیہ سوم جی کی رفاقت بھی نصیب ہوئی جس سے ان کے ذہن کو سیاسی تربیت ملی۔ انہیں پابندیاں پسند نہ تھیں۔ بچپن میں وہ چلتی نہیں تھیں بلکہ بھاگتی دوڑتی تھیں۔ بقول ان کے کہ وہ آزادی پسند ہیں، نہ صرف اپنی قوم اور وطن کے لئے بلکہ اپنے لئے بھی۔

آزادی کے علم بردار گاندھی، نہرو، ابوالکلام اور علی برادران وہ شخصیات تھیں جن سے ممتاز بہت متاثر تھیں۔ شوہر کے ساتھ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتیں کیونکہ ان کے خیال میں عورتوں کے مسائل اور حقوق کے لئے لڑنا ہے تو مردوں کی بات سننی اور سمجھنی چاہئے کہ وہ کس چیز کے لئے لڑ رہے ہیں۔ دونوں کے مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اگر مردوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ عورتوں کے یہ مسائل اور ایشوز ہیں تو ان کے حل کے امکانات نظر آنے لگتے ہیں۔

بمبئی میں وہ جس مکان میں مقیم تھیں ان کے نصف حصے میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان رہتے تھے۔ ان کے ساتھ شریک عورتوں کو کام کرتے دیکھ کر رشک کرتی تھیں۔ سیاسی

MashalBooks.org

جلسوں میں جب انہیں اپنے علاوہ کوئی دوسری عورت نظر نہ آتی تو سوچتی تھیں کہ خدا جانے کب عورتوں کی تعداد بڑھے گی۔

جب ویف بنی تو ان کی انجمن نے بھی اس کے ساتھ کام کیا۔ کہتی ہیں ''ہم پر یہ چھاپ تھی کہ ہم عورتوں کے حقوق سے زیادہ سیاست کی بات کرتی ہیں حالانکہ یہ سب کچھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں سی آئی اے نے انہیں گرفتار کر لیا۔ الزام تھا کہ ان کے گھر پر حکومت کے خلاف ایک میٹنگ ہوئی تھی اور قرارداد پاس کی گئی تھی۔ دو دن تک حوالات میں رہیں۔ اس واقعے سے قبل امریکہ اور اسرائیل کے خلاف ریگل چوک پر ایک احتجاجی مظاہرہ ہوا شہر کی خواتین ریگل سے امریکی سفارت خانے تک مارچ کرنا چاہتی تھیں کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس گروہ میں ممتاز نورانی بھی شامل تھیں۔

ممتاز نورانی کا کہنا ہے کہ اب جو نوجوان عورتیں مختلف تنظیموں میں کام کر رہی ہیں ان میں جوش و جذبہ ہے۔ وہ پر خلوص نظر آتی ہیں تاہم بعض اوقات کچھ تنظیمیں زور و شور سے بنتی ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد منظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کا نام اور کام دونوں سننے میں نہیں آتے۔

ممتاز نورانی بنیاد پرستوں کے خلاف ہیں۔ بقول ان کے مذہبی فرقہ واریت سے سیاسی صورت حال زیادہ بگڑی ہے لیکن مذہبی جماعتوں پر پابندی لگانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

MashalBooks.org

# طاہرہ مظہرعلی خاں

1965ء............ایوب خان کے مارشل کا دور۔

گڑھی شاہو کے ایک بیروزگار مزدور کا بیٹا۔ ’’تم آج صبح کیا کھا کر آئے ہو؟‘‘

بچے کا جواب تھا ’’دو پراٹھے۔ انڈہ اور پوریج۔‘‘ وہ جھوٹ بول رہا تھا وہ ان چیزوں کا محض تصور کر رہا تھا، خواب دیکھ رہا تھا۔

طاہرہ مظہرعلی خاں یاد کرتی ہیں ’’لاہور کی دودھ سے کریم نکالنے والی فیکٹریاں کریم نکالنے کے بعد دودھ کو نالیوں میں بہا دیتی تھیں۔ ہم نے ایک فیکٹری سے بات کی کہ وہ دودھ ہمیں دے دیا کریں۔ ہم وہ دودھ غریب بچوں کو پلاتے تھے۔ حکومت نے الزام لگایا کہ پیسہ کہاں سے آتا ہے۔

’’وہ بچہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ بہت سے بچے دودھ پی رہے تھے۔ ایک آٹھ سالہ بچے نے دودھ لے کر مگ چھپا لیا۔ پوچھا کہ تم دودھ کیوں نہیں پی رہے؟ کہنے لگا اپنے چھوٹے بھائی کے لئے لے کر جاؤں گا۔

طاہرہ مظہرعلی کی اپنی زندگی گڑھی شاہو کے بچوں سے بہت دور ایک بڑے جاگیردار گھرانے میں کچھ اس طرح گزر رہی تھی۔

گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ پکوان تیار ہو رہے تھے۔ جوڑے بن رہے تھے ڈھولک بج رہی تھی۔ مہمانوں کی فہرستیں تیار ہو رہی تھیں۔ کس کی شادی کی تیاری تھی؟ لڑکے یا لڑکی کی؟ نہیں، ایک رئیس زادی کے گڈے کی شادی دوسری رئیس زادی کی گڑیا سے ہونی والی تھی۔ اس شادی میں دوسو کے قریب مہمان بلائے گئے تھے۔

اس گھر میں آئے دن بہت ہی خصوصی قسم کی مصروفیات نظر آتی تھیں۔ والد کے کوئی بڑے دوست آنے والے تھے۔ کون؟ تحریک آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو آزادی کی تحریک میں ایک دوسرے کے ہمرکاب تھے۔ دونوں والد کے پاس آتے جاتے تھے۔ ''عجب بات لگے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں لڑکیوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔''

گھریلو ماحول ایسا تھا کہ ہم نے یہ سبق پڑھا کہ بڑوں کی عزت کرو۔ سکھوں اور ہندوؤں کے مذہب کا بھی احترام کرو۔

چیف منسٹر کی بیٹی ایک سٹوڈنٹس لیڈر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ باپ نے کہا سوچ لو۔ زندگی بہت مشکل ہوگی۔ بیٹی نے کہا، سوچ لیا ہے۔

راولپنڈی کے قریب علاقے واہ میں ماہانہ آمدنی 300 روپے۔ بچے کے دودھ کا خرچ، اپنی ضروریات، کسان عورتوں کے ساتھ طویل اجلاس۔ کئی برسوں تک گھر میں روزانہ ساگ اور دال پکتی رہی۔ ساگ کھیتوں سے بے قیمت مل جاتا تھا۔ دال سستی تھی۔ شوہر انقلابی، کسان پارٹی کا لیڈر۔ مطالبہ کہ مزدور عورتوں سے ملنا ضروری ہے لیکن بچے سکول سے گھر آئیں تو ان کے استقبال کے لئے ماں کو گھر پر ہونا چاہئے۔

وقت گزرتا ہے۔ جدوجہد جاری ہے۔ مارشل لاء میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ زبان سے نہ قلم سے۔ ورنہ ایسے لوگ ملک دشمن قررا دیئے جاتے ہیں۔ تشدد، گرفتاری، جیل بے اختیار طبقے کو اختیار دلانے کی کوشش کا انعام۔ جو انصاف مانگتے ہیں وہ ملک دشمن ہیں۔ جو ہیروئن اسمگل کرتے ہیں وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ بہت نیک ہیں کہ خیرات دیتے ہیں۔

طاقت حاصل کرنے کے معنی تبدیل ہوتے گئے۔ ہماری سوچ یہ تھی کہ ہمارے پاس دوسروں کے لئے کچھ کرنے کی طاقت ہو۔ اب طاقت سے مراد یہ ہے کہ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں۔ آپ کے پاس کتنی کوٹھیاں ہیں۔

ہر حکمران دعویٰ کرتا ہے کہ جلد ہی تعلیم کو سب کے لئے مفت کر دیا جائے گا مگر اصل صورت حال یہ سامنے آتی ہے کہ مہنگائی بڑھ گئی۔ پہلے تین بچے سکول جاتے تھے، اب صرف ایک بچہ پڑھایا جا سکتا ہے۔ امیروں کے قرضے معاف ہو جاتے ہیں۔ غریب دس

ہزار روپے کا قرض لیتا ہے تو وہ تیس ہزار ہو جاتے ہیں اور اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

ہم نے ہر سسٹم آزما کے دیکھ لیا۔ صرف ایک سسٹم جو عوام کی بہتری کے لئے کام کر سکتا ہے تو وہ سوشلسٹ سسٹم ہے۔ ضروری نہیں کہ اسے سوشلزم کا نام دیا جائے۔ ہمیں انصاف چاہیئے۔ ہمیں طالبان نہیں چاہئیں۔ ایسا ملک چاہیئے جہاں عورت کی عزت ہو، اس کے مساوی حقوق ہوں۔ جو طالبان کی حمایت کرتے ہیں وہ عورتوں کی ترقی کے دشمن ہیں۔

طاہرہ مظہر علی نے کم عمری سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پلیٹ فارم مختلف رہے۔ وہ کسان پارٹی ہو، انٹرنیشنل فیڈریشن آف ڈیموکریٹک ویمن ہو، ویف یا ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان ہو، مقصد ایک ہی تھا۔ غریب عوام کی بہتری۔

طاہرہ مظہر علی اسلام آباد میں ادیبوں اور دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں:

''اپنی تحریروں اور عام لوگوں کے ساتھ قریبی رابطے سے ہم اسلحہ کی دوڑ ختم کر سکتے ہیں اور ان منافق طاقتوں کو ایکسپوز کر سکتے ہیں جو دنیا کے ایک کونے میں امن کی بات کرتی ہیں اور دوسری طرف ہتھیار برآمد کرتی ہیں۔

''اگر ادیب، لوگوں کے اصل مسائل کو سامنے لائیں تو ہم اس سچائی کو متعارف کروائیں گے کہ ناخواندگی کیوں ہے، پسماندگی، غربت اور ناانصافی کے اسباب کیا ہیں؟ سب کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ اگر ہم اپنی ترجیحات درست کر لیں، اگر ہم امن، جیو اور جینے دو کا رویہ اختیار کریں، اپنے قومی بجٹوں سے ہتھیاروں کے اخراجات نکال دیں تو ان تمام مسائل کا حل ممکن ہے۔

اتنے طویل عرصے کی جدوجہد کا ماحاصل؟ طاہرہ کا کہنا ہے کہ ایک وقت تھا جب ہم ملک کے شمالی علاقوں میں جاتے تھے تو مرد آگے چلتا تھا اور عورت اس کے پیچھے ہوتی تھی۔ عورت کی تصویر اتارتے تو مرد کیمرہ چھین لیتا تھا۔ اب ہم وہاں جائیں تو وہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ ''لڑکیوں کے لئے سکول کھولو، گیس دو، درخت نہ کاٹے جائیں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کا شعور بڑھا ہے، لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

طاہرہ مظہر علی نے سیاسی خاندان میں آنکھ کھولی۔ شوہر سیاسی اور ممتاز صحافی مظہر علی خان کے ہم رکاب ہیں۔ بڑا بیٹا طارق علی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ملک بدر ہوا۔ طاہرہ کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

MashalBooks.org

# زرینہ فضل بھائی

''جنرل ضیاء کے دور میں ایک مرتبہ ڈاکٹر فاؤ قبائلی علاقوں کے دورے پر تھیں۔ میں ان کی جگہ کام کر رہی تھی۔ ڈاکٹر فاؤ وہاں سے ایک 35 سالہ عورت کو لائیں جسے جذام ہونے کی بنا پر اس کے گھر والوں نے جانوروں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس میں جانوروں والی خصلتیں آ گئی تھیں۔ اس کے پاس مرد بھی جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جب کوئی اسے کھانا دینے جاتا تو وہ کھانا پھینک کر اسے نوچنے لگتی۔ میں نے اسکا علاج اور تربیت کی جس کے نتیجے میں اس کی انسانی عادتیں واپس آ گئیں۔ اب وہ خاصی حد تک ٹھیک ہے اور منگھو پیر کے سرکاری ہسپتال میں ہے۔''

ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی کا نام جذام کے مریضوں کے لئے ایک مسیحا کی مانند ہے۔ وہ لاکھوں مریض جنھوں نے زرینہ فضل بھائی کے ہاتھوں شفا پائی ان میں نور محمد بھی شامل ہے۔

نور محمد کے گاؤں والوں نے آبادی سے بہت دور لے جا کر تن تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے جسم پر بننے والے جذام کے زخموں پر کوئی دوا رکھنے والا نہیں تھا۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی نجات صرف موت ہے۔ ایک روز نور محمد کو ایک ایسے مریض نے جو ڈاکٹر زرینہ سے علاج کے بعد صحت یاب ہوا تھا، کہا کہ اگر وہ اس ہسپتال چلا جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ نور محمد کو یقین نہ آیا۔ جاری (عرف) نے اس کے زخموں کو صاف کرتے ہوئے پوچھا کہ ''تم پچھلی بار کب نہائے تھے؟''

نور محمد نے کہا ''کبھی نہیں۔ کیوں کہ مجھے نل کے قریب نہیں جانے دیا جاتا تھا۔''

نور محمد اب ڈاکٹر کی پناہ میں تھا۔ اس کے زخم ٹھیک ہونے لگے تھے۔ وہ اب

ہسپتال کے فلاحی کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا اور پھر ایک روز وہ مشن کا مانیٹر بن گیا۔ ایک زندگی جسے معاشرے نے ٹھکرا دیا تھا، جو جسمانی اور روحانی طور پر زخم خوردہ تھا اب وہ معاشرے کا مفید رکن بن چکا تھا۔

احمد فضل بھائی جو زرینہ فضل بھائی کے عزیز ہیں انہوں نے 1965ء کے لئے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے ''زمین پر چلنے والے فرشتے'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والوں، ڈاکٹر زرینہ اور ان کے ساتھیوں کی گراں قدر خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

''زرینہ فضل بھائی بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اور ایم بی بی ایس بمبئی ہی سے کیا۔ اس کے بعد ڈی۔ٹی۔ ایم۔ این۔ ایچ کی ڈگری 1948ء میں لندن سے حاصل کی اور سنہ 49ء میں کراچی آ گئیں۔

زرینہ کا تعلق اسماعیلی فرقے سے ہے۔ انہوں نے محبت کی شادی کی۔ دونوں ایک دوسرے کو زمانہ طالب علمی سے جانتے تھے۔ زرینہ نے جب اپنے منگیتر کے سامنے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ گریجویشن کے بعد گائنا کالوجسٹ بننا چاہتی ہیں تو انہوں نے کہا ''میں تنگ نظر نہیں ہوں لیکن اکثر بچے یا تو آدھی رات کو یا صبح سویرے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم وقت بے وقت ہسپتال بھاگا کرو گی۔ میرا خیال ہے کہ تم اگر گائنا کالوجسٹ بننا چاہتی ہو تو ہمارا ملاپ مشکل ہے۔'' زرینہ کا ارادہ مضبوط تھا اس لئے علیحدگی ہوگئی جو بمشکل 8 دن تک جاری رہی۔

زرینہ کے منگیتر اس واقعے کے بعد بہت پریشان تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنے ایک دوست کو جھگڑے کے بارے میں بتایا تو اس نے مشورہ دیا کہ جاری سے کہو کہ وہ گائنا کالوجسٹ کے بجائے سکن سپیشلسٹ بن جائے کیونکہ اس پیشے میں کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ یہ بات سنتے ہی وہ اپنی موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے زرینہ کے پاس پہنچے کہ صلح صفائی کا بہانہ مل گیا تھا۔

ڈاکٹر زرینہ کراچی آنے کے بعد اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ 1950ء میں فیملی پلاننگ کے ایک ادارے کی رکنیت حاصل کر کے سوشل ورک کرنے لگیں۔ پھر جلد ہی خداداد کالونی میں رفاحی ادارہ قائم کیا اور اسکی کراچی شاخ کی صدر ہوگئیں۔ اس ادارے

کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا۔ یہ سلسلہ 12 سال تک چلتا رہا۔

ڈاکٹر زرینہ کے حالاتِ زندگی اور سماجی خدمات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے لئے جب رابطہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ شدید علیل ہیں۔ فالج کی وجہ سے ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ زرینہ کے دماغ میں تین سٹروکس ہوئے جس کی وجہ سے دماغ کا بیشتر حصہ بیکار ہو گیا تھا۔ وہ تین ہفتے تک بے ہوش رہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ اول تو وہ ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ اگر کچھ افاقہ ہو بھی گیا تو دماغ کام نہیں کرے گا۔ لیکن دو ماہ بعد جب ڈاکٹر نے انہیں دیکھا تو وہ خود حیران تھے کہ یہ معجزہ کیسے ہوا کہ وہ نہ صرف ٹھیک ہو گئیں بلکہ ان کی یادداشت بھی کام کرنے لگی۔

جاری (وہ اسی نام سے پکاری جاتی ہیں) یاد کر رہی تھیں ''میرے شوہر کی ماں سوتیلی تھی۔ وہ اس بات پر ناراض رہتی تھیں کہ میں الگ گھر لینا چاہتی ہوں۔ اس وقت میری تنخواہ کل 75 روپے تھی۔ مگر میں نے الگ گھر لے لیا تھا۔ میری ساس کو میرا کام کرنا بھی بہت ناپسند تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں کچھ نہ کروں، بس اپنی نندوں کو لے کر جماعت خانے جایا کروں۔

ڈاکٹر زرینہ اور ان کے شوہر دونوں ضعیف ہو چکے ہیں۔ ان کے شوہر کی بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ لیکن انہوں نے زرینہ کی علالت کے دوران کی دن رات دیکھ بھال کی اور انہیں مسلسل یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ زرینہ کے شوہر کا کہنا کہ ''دائمی مریض اس لئے بھی مر جاتے ہیں کہ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اب بوجھ بن رہے ہیں اور خود کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔''

زرینہ فضل بھائی نے اپنی گفتگو کے دوران کہا ''میں جلدی امراض کی ماہر ہوں۔ لہٰذا اجذام کی بیماری میں دلچسپی تھی۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ایک جرمن ڈاکٹر روتھ فاؤ میری ایڈی لیڈ لپریسی سینٹر چلا رہی ہیں تو میں نے انکے ساتھ رابطہ اور کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

یہ سلسلہ جو 1962ء میں شروع ہوا تھا 1997ء تک زرینہ فضل بھائی کی علالت تک جاری رہا۔ ان 35 برسوں میں جذام کے مریضوں کے علاج کے علاوہ پیرامیڈکل ورکرز اور ڈاکٹروں کی تربیت بھی شامل تھی۔ نیز مختلف علاقوں کا سروے کر کے جذام کے

مریضوں کی تلاش کرنا اور دس بارہ مراکز کے انتظامی امور سنبھالنا، یہ سب کام رضا کارانہ طور پر کیے گئے اور جاری نے کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ ان کی خدمات کا اجر صرف وہ تین تمغے ہیں جو جاری نے حاصل کیے۔

جاری کے تین بچے ............ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں............ تینوں شادی شدہ ہیں۔ بیٹی امریکہ میں ہے جبکہ دونوں بیٹے کراچی میں اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔

MashalBooks.org

# انیتا غلام علی

''والد ہائی کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سندھ کے وزیراعلیٰ کا فون آیا کہ آپ کی بیٹی ہڑتالیں کروا رہی ہے، شہر بند کروا رہی ہے اسے روکیں۔

والد نے جواب دیا ''وہ عاقل و بالغ ہے۔ اس نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں، لہٰذا میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ چاہیں تو اسے گرفتار کر لیں میں اس کی ضمانت کروانے نہیں آؤں گا۔''

طلبہ و طالبات کے حق میں ہنگامہ آرائی کرنے والی اس طالبہ کا نام انیتا غلام علی ہے۔ طلبا و طالبات اساتذہ اور تعلیم کے حق میں جدوجہد کرتے کرتے عمر گزر گئی۔ کسی حکومت سے مراعات حاصل نہیں کیں۔ البتہ سنہ 1996ء میں بے نظیر حکومت کی برطرفی کے بعد انیتا غلام علی 90 دن کے لئے وزیر تعلیم بن گئیں۔ عمومی طور پر حیرت کے اظہار کے علاوہ کچھ حلقوں میں وزارت قبول کرنے کو پسندیدہ عمل نہ سمجھا گیا۔ اس پر انیتا کا کہنا ہے:

''جب مجھے حکومت نے یہ آفر دی تو میرے ذہن میں معاً یہ خیال آیا کہ ان کا منصوبہ دراصل یہ ہے کہ مجھے یہاں سے (سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن) نکال کر بیوروکریسی میں پھنسا دیں تا کہ پھر اسے وہاں ناکام بنا دیا جائے۔ میں نے اسے چیلنج سمجھ کو قبول کر لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ یہاں اچھے ٹیچرز کی کمی نہیں ہے اور بیوروکریسی کی یہ سوچ غلط ہے کہ تعلیمی اداروں کو ان کے علاوہ کوئی اور نہیں چلا سکتا۔''

انیتا غلام علی کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک کراچی میں ہی تعلیم حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے کلینیکل مائیکرو بیالوجی میں دوسری پوزیشن

MashalBooks.org

حاصل کی۔

''میں ہمیشہ بری سٹوڈنٹ ہوا کرتی تھی۔ ڈی۔ جے سائنس کالج میں چار سال تک بوٹنی کی کلاس اٹینڈ نہیں کی۔ کلاس سے بھاگ جایا کرتی تھی اور اکثر فیل ہو جاتی تھی۔ مگر جب ایم ایس سی میں پہنچی تو میرا خیال ہے کہ مجھے ایک بہت اچھا استاد مل گیا اور مجھے اپنے مضمون مائیکرو بیالوجی سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ان کی اردو اور انگریزی دونوں بہت عمدہ تھیں۔ ان سے پڑھنے میں لطف آتا تھا۔''

انیتا 1960ء میں ایم ایس سی پاس کرنے کے بعد ایس ایم سائنس کالج کراچی سے بطور لیکچرر وابستہ ہو گئیں۔ اسی دوران پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کی رکنیت حاصل کی اور سرگرم کارکن ہونے کی بدولت پہلے کراچی، پھر صوبائی اور پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کی صدر رہیں۔ انہیں اس ضمن میں دو تاریخی کارنامے یاد ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سنہ 73 میں مغربی پاکستان کالجز مینجمنٹ اینڈ کنٹرول آرڈیننس نکلا جس میں پرائیویٹ سکول ٹیچرز کے لئے ملازمت کے قواعد ضوابط بنائے گئے۔ اس کا ڈرافٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن نے تیار کیا تھا۔ نیز یہ کہ تنظیم کی کوششوں اور حکام سے مسلسل رابطے کے نتیجے میں ٹیچرز کی تنخواہوں اور رتبے میں اضافہ ہوا۔ اسی دوران تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کر لیا گیا۔ اس پر انیتا کا کہنا ہے کہ عام تاثر یہ ہے کہ یہ ایک غلط اقدام تھا، جبکہ بنیادی طور پر یہ منفی عمل نہیں تھا۔ بلکہ حکومت نے اپنی بدنیتی سے اسے ہوا بنا دیا اور اسے بدنام کیا۔ اس کا سیاسی فائدہ اٹھایا اور اس کا استحصال کیا گیا۔ برسر اقتدار سیاسی پارٹی نے قومیائے گئے تعلیمی اداروں کو اپنی ملکیت جانا اور اپنی سیٹوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا۔ یہیں سے ساری خرابی کا آغاز ہوا۔

انیتا ٹیچر نہیں بلکہ وکیل بننا چاہتی تھیں۔ مگر دادا نے کہا کہ انہوں نے سندھ مدرسہ کی عمر بھر خدمت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس کے کالج میں داخلہ لو۔ چنانچہ انہوں نے دادا کی بات مان کر ایس ایم کالج میں داخلہ لے لیا۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر تدریسی پیشے سے منسلک ہوئیں تو احساس ہوا کہ:

''میں کہتی ہوں کہ ٹیچر بادشاہ ہوتا ہے۔ سیاسی لیڈر تو اپنے جلسوں میں پیسے دے کر پبلک بلاتے ہیں، ٹیچر تنخواہ لے کر کلاس لیتا ہے۔ وہ اپنے سامعین سے دنیا بھر کی باتیں کر سکتا ہے۔ میں اپنی کلاس کے آغاز میں پانچ دس منٹ کی یہ بحث کراتی کہ آج صبح کے

اخبار میں کیا پڑھنا، کیا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد مائیکروبیالوجی شروع ہوتی۔"

انیتا غلام علی کو یونی سیف کی جانب سے "خواندگی کی سفیر" کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ نیز اس ضمن میں اپنی مسلسل جدوجہد کی بدولت فیض ایوارڈ اور خدیجۃ الکبریٰ ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن وہ بھی ہر باشعور شہری کی طرح اپنے ملک میں خواندگی کی شرح اور نظام تعلیم سے ناخوش ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر دور حکومت میں تعلیم کو بہت اہمیت دی گئی لیکن اسے زبانی کلامی ترجیح دی جاتی ہے، اور جب بجٹ میں رقوم مختص کرنے کا وقت ہوتا ہے تو اس کا درجہ بہت نیچے چلا جاتا ہے۔

"تعلیم سب کے لئے" ہماری حکومت وقت کا نعرہ اور عزم ہے۔ وفاقی وزیر تعلیم کا کہنا ہے کہ تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس اعتماد کا اظہار کیا کہ موجودہ حکومت کی پالیسیوں کی بدولت ہم ترقی اور خوشحالی کے دور میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وزیراعظم کے کمیشن برائے خواندگی کے چیئرمین نے امید دلائی ہے کہ موجودہ مالی سال کے دوران وہ مقامی اور بین الاقوامی ڈونرز کے تعاون سے پندرہ ہزار نئے پرائمری سکولوں کا ٹارگٹ پورا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

انیتا غلام علی نے "اکیسویں صدی میں مینڈک کی چھلانگ" کے عنوان سے ایک مقالے میں لکھا تھا کہ ہر حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ایک قابل تعریف تعلیمی پالیسی آتی ہے۔ ہر نیا حکمران اس پر زور وشور سے عمل درآمد کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ تعلیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بیرون ملک دورے کرنے چاہئیں۔ حال ہی میں اس شعبے سے منسلک ایک بڑی شخصیت نے حکومت سے اجازت بمع رقم طلب کی تھی کہ وہ ہندوستان، انڈونیشیا اور چین کا مطالعاتی دورہ کر کے ان کی ناخواندگی کی وجوہات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ہاں آئے دن حکومتوں کی تبدیلی سے بھی تعلیم متاثر ہوئی ہے۔ ایک حکومت جب تک صورت حال پر غور وفکر کرتی ہے اور کوئی مثبت اقدام کرتی ہے اسے بگڑے ہوئے بچے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کی پالیسیوں اور کارکردگی پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جونیجو حکومت کا نئی روشنی سکول پراجیکٹ، حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی مسمار کر دیا گیا جس کی ملک کے باشعور طبقوں خصوصاً ماہرین تعلیم کی طرف سے

شدید مذمت کی گئی تھی۔

فروغ تعلیم انیتا غلام علی کا مقصد زندگی ہے لیکن وہ اب بھی یہ سوچتی ہیں کہ وہ اگر وکیل ہوتیں تو الیکشن لڑ کر سیاست میں جاتیں۔ کہتی ہیں ''میرا جی چاہتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کا گروپ بنا کر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا جائے۔ بے شک الیکشن میں ہار جائیں لیکن عوام کو یہ تو بتا دیں گے کہ انہیں کیا مطالبہ کرنا چاہیئے۔''

انیتا سیاست میں آنے کے لئے خاصی سنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ بقول ان کے الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں جب تک اختیار نہ ہو کام نہیں کر سکتے۔ میں پچاس سال تک لڑتی رہی مگر صرف تین ماہ (عبوری حکومت میں شرکت سے) میں وہ کام کر لیا جو اس سے قبل نہ کر سکی۔''

انیتا چھ بہن بھائی ہیں۔ والد ہائی کورٹ کے جج تھے۔ والدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، جبکہ دادا ڈائریکٹر آف سکولز تھے۔ تمام بہن بھائی ملک سے باہر ہیں اور وہ پاکستان میں اکیلی ہیں۔ سنہ 1961 میں شادی ہوئی۔ موصوف چاہتے تھے کہ انیتا اپنی تمام تر سرگرمیاں ختم کر کے گھر بیٹھ جائیں کیونکہ ان کی انا مجروح ہوتی ہے۔ انیتا نے سنہ 53 سے 73 تک ریڈیو سے انگریزی میں خبریں پڑھی ہیں۔ ''جب میں ریڈیو پر ''انیتا غلام علی'' کہتی تھی تو وہ خفا ہوتے تھے، لہٰذا ہم نے زیادہ ہنگامہ کرنے کی بجائے علیحدگی کو بہتر خیال کیا۔ اولاد نہیں ہوئی۔''

# رشیدہ پٹیل

''بنیاد پرست گروہ بے شک اپنے مختلف عقیدوں کی بنا پر کئی حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں لیکن اپنی اپنی سطح پر ملک بھر میں ان کی مضبوط لابی ہے جو اپنے نظریات کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ترقی پسند دانشوروں کی سرگرمیاں ڈرائنگ رومز یا زیادہ سے زیادہ سیمیناروں اور ورکشاپس تک محدود رہتی ہیں اور ان کی بات عام آدمی تک نہیں پہنچ پاتی جبکہ قانونی ڈھانچے میں اصلاحات کے لئے پراثر لابنگ کی ضرورت ہے۔''
یہ ہے رشیدہ پٹیل کا مطمحِ نظر۔

کوئی بھی دور حکومت ہو، معاملہ اگر قوانین کا ہو، خصوصاً ایسا کوئی قانون جس کا تعلق عورت سے ہو............ وہ حدود آرڈیننس ہو، قانون شہادت، ولی کا معاملہ ہو یا خواتین کے بارے میں انکوائری کمیشن رپورٹ، ایسے تمام قوانین جن سے عورت کی حیثیت گھٹتی ہو، اس کے خلاف احتجاجی آوازوں میں رشیدہ پٹیل کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی کی امید دکھائی دینے لگے یا انکوائری کمیشن رپورٹ کے بعد یہ تاثر پیدا ہو کہ مناسب عمل درآمد اور موجودہ قوانین میں ترمیم سے پاکستانی عورت کا رتبہ بہتر ہو جائے گا تو اس کی حمایت اور تائید کے اولین دستے میں رشیدہ پٹیل بھی شامل ہوتی ہیں۔

انکوائری کمیشن کی حالیہ رپورٹ کی تائید کرتے ہوئے رشیدہ پٹیل نے ایک قانون دان، پاکستان وومن لائرز ایسوسی ایشن (پاولا) کی صدر اور اپوا کی نائب صدر کی حیثیت سے کہا کہ اس رپورٹ پر عمل درآمد کے لئے ضروری ہے کہ حکومت ایسا ماحول پیدا کرے کہ پالیسی سازی کی سطح پر عورتوں کی بامعنی شمولیت یقینی ہو سکے۔ انہوں نے تمام قانون ساز

MashalBooks.org

اداروں میں یعنی بلدیات سے سینیٹ تک، عورتوں کی 33 فیصد نشستوں کی تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ اس ضمن میں یہ ضروری ہوگا کہ خواتین کے حقوق کی تنظیمیں ایک متحدہ مہم چلائیں تاکہ مذکورہ مطالبات پورے ہوسکیں۔

پینتالیس سال قبل جب ان کی شادی ہوئی تو ان کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تھی۔ رشیدہ کا تعلق تاجر گھرانے سے ہے۔شوہر جن کا انتقال سنہ 93 میں ہوا تجارت کرتے تھے۔ رشیدہ نے شادی کے بعد دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ بی اے کیا، پھر ایم اے اور ایل ایل بی۔ وہ گھرداری کرتی تھیں مگر تعلیم حاصل کرنا نہ چھوڑا۔

بقول ان کے ''بچے پیدا ہو رہے تھے اور میں پڑھ رہی تھی۔''

رشیدہ پٹیل جو قانون دان برادری کی ممتاز رکن ہیں، گزشتہ کئی برسوں سے عورتوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ وہ یہ کام پیشہ وارانہ طور پر ایک وکیل کی حیثیت سے اور مختلف تنظیموں کے ساتھ مل کر کرتی ہیں۔

کہتی ہیں: ''شاید ایسے کام کرنا میری فطرت میں شامل تھا، گو کہ اس سے قبل مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ ایک بار میں اپنی ایک کزن کے ساتھ اپوا گئی، وہاں میں نے عورتوں کی حالت زار اور مظلومیت دیکھی تو سوچا ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ بہت سی عورتیں تھیں، جو قانونی امداد کی طلب گار تھیں، لیکن ان کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ وکیل بن سکیں، یا اپنے حق کے لئے عدالت میں مقدمہ لڑ سکیں۔''

رشیدہ پٹیل اپنے خاندان میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والی پہلی فرد ہیں بلکہ ان کے بھائی نے ان سے متاثر ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اب ان کی بیٹی بھی وکیل ہے، جبکہ ان کے دونوں بیٹے دیگر ملازمتیں کرتے ہیں۔

رشیدہ پٹیل کی زیرنگرانی قائم ہونے والے ادارے پاولا، کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ''وکیل کی حیثیت سے میرا سابقہ ایسے بے شمار افراد سے پڑا جن کے پاس قانونی امداد حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے۔ بے شک ہر وکیل اپنے طور پر اور ذاتی حیثیت میں کوئی نہ کوئی مقدمہ مفت لڑتا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ اس لئے ہم چند وکیل خواتین نے مل کر پاکستان وومن لائرز ایسوسی ایشن قائم کی۔ ہمارا کام قانونی مشورے دینا اور ثالثی کردار ادا کرنا ہے۔ خصوصاً گھریلو تنازعات میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ فریقین کے درمیان

مصالحت ہو جائے۔ گھریلو تشدد ایک عام اور بہت تکلیف دہ مسئلہ ہے۔ ہم نے اس بارے میں حکومت سے کئی بار مطالبہ کیا ہے۔ تجاویز بھی پیش کی ہیں کہ ایسا قانون بنایا جائے کہ اگر مرد عورت پر تشدد کرے تو وہ قانونی طور پر مجرم ٹھہرایا جائے۔

پاولا کا صدر دفتر شہر کے مرکز میں واقع ہے۔ لیکن قانونی امداد کو کراچی کے مضافات تک پہنچانے کے لئے ایک موبائل یونٹ قائم کیا گیا ہے، جس کے ذریعے خاتون وکلا ان علاقوں میں بسنے والی خصوصاً نچلے طبقے کی عورتوں کو قانونی امداد فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح دیگر غیر سرکاری تنظیموں کے تعاون سے لاہور اور راولپنڈی میں بھی پاولا کے دفاتر قائم کئے گئے تھے لیکن فنڈز کی کمی اور خاطر خواہ نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بند کرنا پڑا۔

''پاولا نے ان قیدی عورتوں کی امداد کے لئے بھی رسائی حاصل کی جو زنا آرڈی ننس کے الزام میں سزا بھگت رہی ہیں۔ لیکن اگر ان کا مقدمہ جیت بھی جائیں'' رشیدہ کا کہنا ہے ''تو مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کہاں رکھا جائے، کیونکہ بیشتر خاندان زنا کی ملزم نوجوان لڑکیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مثلاً لڑکی آٹھ سال تک جیل میں رہی۔ اس کے گھر والوں نے ناطہ توڑ لیا تھا۔ رہا ہوئی تو اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کہاں جائے؟''

رشیدہ پٹیل اپنے تجربے کی روشنی میں کہتی ہیں'' قانونی امداد فراہم کرنا تمام مسائل کا حل نہیں ہے۔ گو کہ ہم بے بس اور غریب عورتوں کے مقدمے مفت لڑتے ہیں لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خود کچھ کرنا نہیں چاہتیں اور کلی طور پر ہمارے اوپر انحصار کرنے لگتی ہیں۔ اس لئے ہمارا ایک اصول یہ ہے کہ انہیں کچھ نہ کچھ رقم پاولا کو ادا کرنی چاہیے، چاہے وہ چھوٹی قسطوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ بھی مشکل لگتا ہے۔ اکثر لوگ فیس ادا نہیں کرنا چاہتے۔''

پاولا کی جانب سے قانونی شعور پیدا کرنے کے لئے میڈیا کا وسیلہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک موبائل وین جس میں ٹی وی اور وی سی آر نصب ہے، کے ذریعے دستاویزی فلمیں مختلف علاقوں میں دکھائی جاتی ہیں تاکہ عام لوگوں میں اپنے قانونی حقوق کا شعور پیدا ہو۔

رشیدہ پٹیل کی شکایت ہے کہ ہم بے شک اپنا کام ثابت قدمی سے کر رہے ہیں لیکن گزشتہ برسوں میں جتنی جمہوری حکومتیں آئیں ان میں سے کسی نے عورتوں کے خلاف مارشل لا کے دور میں وضع کئے گئے قوانین کو ختم کرنے میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ ایک افسوس

ناک امر ہے۔

رشیدہ نے اپنے آئندہ کے پروگراموں کے بارے میں بتایا کہ پاولا کے زیر اہتمام ایک دستاویزی فلم تیار کی جا رہی ہے جو جیل کی اصلاحات کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ تجاویز مرتب کی گئی ہیں کہ جیل میں عورتوں کو کیا سہولتیں ملنی چاہئیں۔ ان کی تنظیم کے زیر اہتمام کچھ عرصہ قبل ٹیلیویژن پر ڈرامے دکھائے گئے تھے۔ اب ان کے مستقبل کے پروگراموں میں ریڈیو پروگرام شامل ہیں۔ نیز وہ ایسی خواتین کی امداد کا ارادہ رکھتی ہیں۔ جو طلاق لے کر بے سہارا ہو جاتی ہیں۔ ان کی ملازمت اور بحالی کے لئے مختلف اداروں کی مدد حاصل کی جائے گی۔

پاکستانی عورت کو مساوی حقوق دلانے کے لئے اپوا کی جانب سے بیگم لیاقت علی خان نے انہیں 1972ء میں قومی اسمبلی کے اس اجلاس کے لئے نامزد کیا تھا جس میں عبوری آئین تیار کیا گیا تھا۔ نیز وہ 1988ء سے 1993ء تک پاکستان ویمن لیگل رائٹس کمیشن کی چیئر پرسن رہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں متعدد ملکی اور غیر ملکی ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ وہ سنہ 1961ء سے وکیل کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

رشیدہ پٹیل نے ''عورت اور پاکستانی قانون''، ''پاکستانی قوانین کا اسلامائزیشن'' اور ''پاکستان کا قانون اور عورت کا سماجی، ثقافتی اور اقتصادی مقام'' کے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ نیز وہ گزشتہ 30 برس سے اخبارات میں مضامین بھی لکھ رہی ہیں۔

MashalBooks.org

# سلیمہ احمد

سال میں ایک بار یہ رات آتی ہے۔ ایک خاتون آگے بڑھتی ہے۔ خوبصورت پھولوں کے جلو میں رکھی ہوئی ایک شمع اٹھاتی ہے اور پہلے سے روشن لو سے وہ نئی شمع جلاتی ہے اور اسے پہلی شمع کے قریب نصب کر دیتی ہے۔ پھر دوسری خاتون آگے بڑھتی ہے اور شمع جلاتی ہے۔

اس طرح یہ عمل دیر تک جاری رہتا ہے۔ رات بھیگتی جاتی ہے اور شمعوں کی روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ جگمگاہٹ پھیلتی جاتی ہے۔ شمع جلانے کی رسم کے آخر میں اپنے اپنے ملکوں کے ملبوسات پہنے، چہروں پر مسکراہٹ سجائے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ کھڑی ہوتی ہیں۔

یہ رات پاکستان فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمنز (PEBPWC) کی روایت بن چکی ہے۔ ''بہت سے ممالک کی عورتوں کی دوستی کی رات'' سلیمہ احمد اس تنظیم کی تاحیات صدر ہیں جس نے پاکستان کی گولڈن جوبلی سال میں اپنی بیالیسویں سالگرہ منائی، اس یقین کے ساتھ کہ صرف بے غرض اور مضبوط ارادہ اور عمل ہی معاشرے کی عزت بڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔

سلیمہ احمد بنگلور (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں اور مدارس یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد یونیورسٹی آف ایریزونا سے ڈاکٹریٹ کیا۔ 1949ء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد مشرقی پاکستان (سابق) میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازم ہو گئیں۔ 35 سالہ سرکاری ملازمت کے دوران وہ مشرقی پاکستان کی آڈیٹر جنرل بھی رہیں۔ یہ عہدہ پہلی بار کسی پاکستانی خاتون کے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد دیگر اعلیٰ عہدوں کے علاوہ

MashalBooks.org

کے ای ایس سی کی فنانس ڈائریکٹر اور ویمنز ڈویژن کی سیکرٹری بھی رہیں۔ انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے سنہ 68 میں نشان امتیاز اور 88ء میں وی آئی پی ایوارڈ دیا گیا۔

سلیمہ احمد کا تعلق زمیندار خاندان سے ہے، لیکن ان کے والد زمینداری ترک کر کے بمبئ چلے گئے اور انجینئرنگ میں تعلیم حاصل کی۔ والدہ شادی کے وقت معمولی پڑھی لکھی تھیں لیکن شوہر کی حوصلہ افزائی کی بنا پر انہوں نے بی۔ اے کیا اور برطانیہ چلی گئیں جہاں سے انہوں نے ایم ایڈ کیا اور واپس آ کر بنگلور اور میسور میں سکول کھولے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ان کے خاندان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اگر کسی عورت کا چہرہ نظر آ جائے تو اس کی گردن کاٹ دی جائے۔ والدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان لوٹیں تو وہ اور ان کے شوہر کو بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب انہوں نے لڑکیوں کے سکول کھولے تو احتجاجاً ان کی گاڑی پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔ مگر سلیمہ کے والد لڑکیوں کی تعلیم کے بہت حامی تھے۔ سلیمہ نے ابتدائی تعلیم کانونٹ سے حاصل کی۔ یہ سات بہن بھائی ہیں۔ سلیمہ کے شوہر بھی اکاؤنٹ کے محکمے میں تھے۔ ان کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔

ڈھاکہ میں جب سلیمہ سرکاری ملازمت میں تھیں تو انہیں ساس سسر کا تعاون حاصل تھا، اس لئے گھر داری کی ذمہ داریوں سے مبرا تھیں۔ وہ جب اکاؤنٹنٹ جنرل بنیں تو یونین کی طرف سے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دفتر میں چار ہزار افراد تھے۔ پہلی مرتبہ ایک عورت ہیڈ بنی تھی۔ پھر وہ بنگالی بھی نہیں تھی اس لئے وہ قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ اپوا کی رکن تھیں۔ اس دوران طوفان آیا تو اپوا کی جانب سے امدادی سامان کی تقسیم وغیرہ کے لئے متاثرہ علاقے میں گئیں۔ جب یونین کے عہدے داروں نے انہیں لگن سے کام کرتے ہوئے دیکھا تو ان کا رویہ تبدیل ہو گیا۔

سلیمہ احمد جب سرکاری ملازمت میں آئیں تو اس دوران ان کی ملاقات انٹرنیشنل فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمن سے ہوئی۔ وہ ان کے کام سے متاثر ہوئیں تو کارکن اور تجارت پیشہ خواتین کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان فیڈریشن بنائی۔ شروع شروع میں یہ ایک چھوٹا سا پریشر گروپ تھا۔ ان دنوں کارکن اور ملازمت پیشہ پاکستانی عورتوں کے مسائل بہت گھمبیر تھے۔ ہمارا آئین ابھی نہیں بنا تھا۔ انگریز کے زمانے کے قوانین چل رہے تھے جبکہ بھارت نے تقسیم کے بعد عورتوں پر ملازمتوں کی پابندیاں

وغیرہ ختم کر دی تھیں۔

پاکستان میں سروسز کے امتحانات میں سنہ 51 تک عورتیں شریک ہوتی رہیں، لیکن اس کے بعد ان پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

سلیمہ احمد کا کہنا ہے کہ تنظیم کی تشکیل کے بعد حکومتی ارکان اور عہدے داروں کے ساتھ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے رابطہ قائم کیا جاتا۔ انہیں باور کروایا جاتا کہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کے ساتھ کتنا امتیاز برتا جاتا ہے۔ تنظیم کی 20 سالہ جدوجہد کے بعد حکومت نے عورتوں کو سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ اس سے قبل یہ پابندی بھی تھی کہ سروسز کے امتحان میں پاس ہونے اور ملازمت میں آنے کے بعد عورتیں شادی نہیں کر سکتیں۔

سلیمہ احمد کا کہنا ہے کہ کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے عورتوں کو منظّم ہونا ہوگا۔ انہوں نے طویل عرصے کی مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں کئی قابل ذکر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ وہ خود ایک کیریر عورت ہیں۔ عملی زندگی کے اوائل میں انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا۔ انہوں نے اپنے اور اپنی تنظیم کے سامنے جو اولین رکھا وہ عورتوں کے لئے تعلیم، تربیت اور ملازمت میں مساوی مواقع کی فراہمی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ عالمی سطح پر دیگر ممالک کی عورتوں کے ساتھ تعاون بھی ضروری ہے تاکہ سب مل کر اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔

ان کی کاوشوں کے نتیجے میں بی۔ پی۔ ڈبلیو (BPW) کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان میں سرفہرست یہ ہے کہ عورتوں کے لئے سنہ 1973ء سے اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل گئے۔ 73ء کے آئین میں اس شق کی شمولیت میں کہ ''ملازمت، تعلیم اور تربیت میں جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا'' ایک حد تک بی۔ پی۔ ڈبلیو کا دباؤ بھی شامل تھا۔ نیز اعلیٰ ملازمتوں، بشمول سفارتی ملازمتوں میں عورتوں کے لئے امتیازی قوانین کو ختم کر دیا گیا۔

ویمنز پولیس اسٹیشنوں کے قیام کے لئے بی۔ پی۔ ڈبلیو کی کوششیں شامل تھیں۔ لیکن سلیمہ احمد کو اس بات کا افسوس ہے کہ ان کا مقصد مردوں کے کام کو دہرانا نہیں تھا، بلکہ عام عورتوں کو درپیش مسائل یعنی زنا، جبری، عصمت فروشی اور اقتصادی حقوق سے محرومی جیسے مسائل پر توجہ دینا ضروری ہے۔

MashalBooks.org

بی۔ پی۔ ڈبلیو کی شاخیں ملک بھر میں قائم کی جا چکی ہیں۔ اس ادارے کی ایک بڑی کارکردگی کراچی، اسلام آباد اور دیگر شہروں میں ملازمت پیشہ عورتوں کے لئے ہوسٹلوں کا قیام ہے۔ کراچی میں قائم کردہ ہوسٹل کا ایک حصہ ''ریٹائر عورتوں کے گھر'' کے لئے وقف ہے۔ اسی طرح اسلام آباد میں کثیر المقاصد کمپلیکس کی تعمیر کی جا رہی ہے جس میں ہوسٹل کے علاوہ عمر رسیدہ عورتوں کی پناہ گاہ بھی ہو گی۔

MashalBooks.org

# شمیم کاظمی

ایک اخبار کے دفتر میں ایک خاتون مختلف اخبارات کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ انہیں جنگی قیدیوں کے بارے میں کچھ معلومات درکار تھیں۔ پھر وہ اکثر وہاں آنے لگیں۔ یہ شمیم کاظمی تھیں۔ سنہ 71ء کی جنگ میں سقوط ڈھاکہ کے بعد ہمارے 90 ہزار فوجی اور سویلین بھائی جنگی قیدی بنا لئے گئے تھے۔ جنگی قیدیوں کی رہائی انسانی حقوق کا مسئلہ تھا۔ ان قیدیوں میں شمیم کاظمی کے دو بھائی بھی شامل تھے۔ لیکن انہوں نے ایک ذاتی معاملے کو سماجی رنگ دیا۔ وہ خود اس تکلیف دہ صورت حال سے دو چار تھیں۔ اسی پر وہ احساس جاگا کہ اس ضمن میں کچھ مثبت قدم اٹھائے جائیں تاکہ دوسروں کا بھی بھلا ہو۔

کلفٹن پر کارکن خواتین کے لئے ہوسٹل کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مائیک پر آواز آئی: ''شمیم کاظمی کا گوریلا گروپ۔'' اس وقت تک شمیم فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمن کلب کی رکن تھیں۔ اختلاف نے راستہ الگ کرنے کی ترغیب دی اور ایک نئی تنظیم نے جنم لیا۔ جس کا نام تھا ''ایسوسی ایشن آف بزنس، پروفیشنل اینڈ ایگری کلچر ویمن۔'' ایک شہری تنظیم، دیہی عورتوں کا حوالہ۔ ایک سوال اٹھا ''کیا آپ کا زرعی عورتوں سے رابطہ ہے''؟ وقت نے اس سوال کا جواب دے دیا۔

شمیم کاظمی نے کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم۔اے کیا۔ والد انگریزی فوج میں تھے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد سکالرشپ پر کینیڈا کی یونیورسٹی میک گل میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی غرض سے گئیں لیکن وہ بوجوہ ایم۔ ایس کرنے کے بعد واپس آ گئیں۔

شمیم نے ابتدائی تعلیم کانونٹ سکولوں میں حاصل کی۔ انہیں یاد ہے کہ جب وہ راولپنڈی کے ایک کانونٹ میں چوتھی جماعت میں پڑھتی تھیں تو ان کے سکول میں واہ کے یتیم خانے سے مہمان بچوں کو بلایا جاتا تھا۔ طالب علم اپنے مہمانوں کے لئے اپنے گھر سے کھانا لاتے اور ان کی خاطر مدارت کرتے۔ یہ دراصل سماجی تربیت کا ایک طریقہ تھا کہ زندگی کی خوشیوں اور آسائشوں سے محروم افراد کے ساتھ کس طرح تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہو کہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔

شمیم کاظمی کے لئے یہ ''معاشرتی فلاح و بہبود'' کا پہلا سبق تھا اور اس کا نقش ذہن کے کسی کسی گوشے میں محفوظ رہا۔

شمیم کاظمی کے ہاں ایک تسلسل ہے—— حرکت کا تسلسل جو کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ اگر اس میں کبھی کوئی رکاوٹ یا سست روی کا خدشہ پیدا ہوتا ہے تو نیا سامان پیدا کر لیا جاتا ہے۔ اسے جاری رہنا چاہئے، اسی کا نام زندگی ہے۔

شمیم اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی غیر نصابی سرگرمیوں میں شامل رہی لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے تحریک چلانا اور اس کے بارے میں بہت سارے فلاحی کام ان کی کل وقتی سماجی زندگی کا پہلا باب تھا۔ اس دوران انہوں نے ملک بھر میں جنگی قیدیوں کے بیوی بچوں اور والدین سے رابطہ کیا اور باقاعدہ اعداد وشمار جمع کئے۔ اس دور کو یاد کرتی ہیں تو ان جھوٹے خطوط کا خیال بھی آتا ہے جو جنگی قیدیوں کے نام لکھے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ تمہاری بیوی بدچلن ہوگئی ہے۔ اور وہ بھی ایسے تھے کہ بعض نے بغیر کسی چھان بین کے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔ اس پر تحریک کی جانب سے دینی فتوے لئے گئے کہ ایسے طلاق ناموں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ یا پھر حکام سے درخواست کی گئی کہ جنگی قیدی کی تنخواہ صرف اس کی بیوی کو ملنی چاہئے۔ اسی طرح کے دیگر کام تھے۔ اس ضمن میں قیدیوں کے خاندانوں کی مالی امداد کے لئے فنڈز بھی جمع کئے گئے۔

شمیم پیشے کے اعتبار سے مارکیٹنگ اور ریسرچ کنسلٹنٹ ہیں۔ سوشیالوجی میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے مارکیٹنگ اور سوشل ورک کو ہم آہنگ کیا۔ معاملہ خواتین کو معاشی طور پر خودکفیل بنانے کا ہو تو وہ ایسے ہر منصوبے کو عملی صورت دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔

MashalBooks.org

شمیم کا تجربہ ہے کہ دیہی عورت کو اس کے اپنے ماحول میں ہی ترقی دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی ایسوسی ایشن کی وساطت سے بہت سی دیہاتی عورتوں کو قرضے دلوا کر کاروبار کروایا۔ اب ایسی مثالیں موجود ہیں کہ عورتیں اپنے ماحول میں اور دستیاب وسائل کو بروئے کار لا کر آمدنی کے طریقے تلاش کر رہی ہیں۔

شمیم کی ایسوسی ایشن کی ارکان زیادہ تر متوسط طبقے کی کارکن خواتین ہیں جن میں سے اکثر 9 سے 5 بجے تک والی ملازمتیں کرتی ہیں۔ اس لئے فلاحی کاموں کے لئے وقت دینا بہت مشکل ہے لیکن پھر بھی وہ گزشتہ کئی برسوں سے ثابت قدم ہیں۔ ان کے لئے پیسے کی کمی ہمیشہ مسئلہ بنی رہی لیکن یہ مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کا ہی پھل ہے کہ اب ملک بھر میں ایسوسی ایشن کی 16 شاخیں ہیں۔

شمیم کا کہنا ہے کہ ہمارا بنیادی مقصد پاکستانی عورت کو معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں فعال بننے کی ترغیب دینا ہے۔ ہم سے پہلے بھی عورتوں کی بھلائی کے کام کئے جا رہے تھے۔ بہت سی تنظیمیں سرگرم عمل تھیں لیکن وہ زیادہ تر شہروں میں کام کرتی تھیں۔ دیہاتی عورت کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ ہماری آبادی کا 70 فیصد دیہی ہے جس میں 50 فیصد عورتیں زرعی معیشت میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں لیکن انہیں زرعی مزدور طاقت میں شمار نہیں کیا جاتا۔ گو کہ عالمی سطح پر منعقد کی جانے والی عورتوں کی کانفرنسوں کے بعد صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ اب دیہی عورت کی کارکردگی کا ذکر ہونے لگا ہے۔

شمیم کاظمی اپنی نوعمری میں جب سماجی کاموں میں مصروف رہنے لگیں تو ان کی والدہ بہت خفا تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح شادی کریں گھر بیٹھیں، بچوں اور شوہر کی دیکھ بھال کریں۔ مگر والد ان کی لگن کو دیکھتے تو کہتے کہ اب یہ اس قدر آگے نکل گئی ہے کہ واپسی مشکل ہے۔ شمیم نے شادی نہیں کی۔

کہتی ہیں ''میں جب مارکیٹنگ اور ریسرچ کی فیلڈ میں آئی تو نوعمر تھی۔ پھر اس شعبے میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ عام خیال تھا کہ ایک لڑکی گھر سے نکل کر دفتر آتی ہے تو وہ سبھی کی پہنچ میں ہے۔ اس وقت شادی کے پیام، بے نام خط اور پھول ملتے تھے۔ پھول میز پر سجا لیتی اور خط پھاڑ کر پھینک دیتی۔''

MashalBooks.org

شمیم نے خود ہزاروں خطوط لکھے۔ عورتوں کے نام، مردوں کے نام کہ آؤ مل کر تبادلہ خیال کریں کہ ہمارے ملک میں عورتوں کے لئے ملازمت کے کیا مواقع ہیں۔ ہم جہیز کی سماجی برائی کو کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ یا یہ کہ عورتوں میں خودکشی کے رجحانات کیوں ہیں۔ سماجی اور اقتصادی ترقی میں عورتوں کا کیا کردار ہے۔

MashalBooks.org

# بلقیس ایدھی

''بھارتی وزیرِاعظم کے نام ایک کھلا خط'' بلقیس ایدھی کی جانب سے۔

''ایدھی چائلڈ ہوم میں ایک عرصے سے بے شمار ہندوستانی ماہی گیر بچے وطن واپسی کے انتظار میں پڑے ہیں۔ ان بچوں کو سمندری حدود میں ناجائز طور پر داخل ہونے پر پکڑا گیا تھا۔ طویل جلا وطنی سے بچوں کی ذہنی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ ان کے واپسی کے لئے پاکستانی حکام سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ گزشتہ سارک کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا، لیکن بے سود۔ ہندوستان کی وزارتِ خارجہ بھی ان بچوں کو واپس بلانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ صورتِ حال سے تنگ آ کر ان بچوں نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی ہے۔ بعض نے تو خودکشی کرنے کی بھی کوشش کی۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری بھارتی حکومت اور اقوام متحدہ پر ہو گی۔''

اس کے 4-5 ماہ بعد بلقیس ایدھی کے نام خط آئے۔

''ہم لوگ سلامتی کے ساتھ اپنے گاؤں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا پورا گاؤں آپ کو سلام کہتا ہے۔ ہمارے اور بھی بھائی لوگ پاکستان میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ان کو بھی رہا کرا کر بھارت بھیج دیں۔ آپ سے دور ہونے کا ہم کو بہت دکھ ہے۔

شیو جی اکرڈا۔ گجرات (بھارت)

''بلقیس امی! آپ نے ہمیں ماں کی محبت دی اور ہمارے گلے میں پھولوں کے

ہار ڈال کر ہمیں ہمارے وطن پہنچایا۔ آپ کی یہ چاہت ہماری خوش نصیبی ہے۔ آپ کے دیئے ہوئے پھول ہم نے احترام کے ساتھ نہر کے پانی کے سپرد کر دیئے ہیں۔

کشن کمار۔ ساجن بھائی، امریلی۔ کوڈ نیار۔ (بھارت)

یہ بلقیس ایدھی کے بے شمار اور بہت اچھے کاموں میں سے ایک چھوٹے سے کام کی مثال ہے۔ عبدالستار ایدھی کی رفیقِ حیات اور ان کی رفیقِ کار بھی۔

کچھ عرصہ قبل عبدالستار ایدھی بہاولپور اور ملتان گئے۔ شدید ثقافتی اور لسانی رنگوں میں رنگے ہوئے اس علاقے کے لوگوں نے ایک اجنبی شخص کو اپنے درمیان پایا تو ان کی باتوں پر اعتبار نہ کیا۔ اس آپا دھاپی کے زمانے میں یہ شخص دکھی انسانیت کی خدمت کی باتیں کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ انہیں بڑا صوفی، درویش، پیر فقیر نہ جانے کیا کچھ سمجھنے لگے۔ مگر کچھ نے کہا یہ سب فراڈ ہے۔ بہاولپور کے ایک باشندے نے کراچی آ کر کسی سے سوال کیا کہ ایدھی کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ تو اس نے برجستہ کہا'':

''اگر کوئی کہے کہ اپنے باپ اور ایدھی میں سے کس پر زیادہ اعتبار کرو گے تو میں کہوں گا ایدھی پر۔'' بہاولپور کا شخص مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔

بلقیس ایدھی، عبدالستار ایدھی کا نسائی پرتو ہے۔

بلقیس ایدھی آٹھ جماعتیں پاس ہیں۔ جونا گڑھ کے پاس بانٹوا میں ان کا گاؤں تھا۔ بٹوارہ ہوا تو بلقیس کی عمر چند ماہ تھی۔ والدین فسادات کی وجہ سے بمبئی کے قریب ایک گاؤں چلے گئے۔ بلقیس کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی۔ پھر ان کا گھرانہ دکان اور گھر بند کر کے پاکستان آ گیا۔ کراچی کے رونق اسلام سکول نانک واڑہ سے آٹھویں جماعت تک پڑھا کہتی ہیں ''میرا دماغ اچھا تھا مگر پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔ سلائی میں بھی دلچسپی نہ تھی۔ ایدھی صاحب کے پاس آ کر فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لیتی تھیں۔ سفید ڈریس پہنتی تھیں۔ مجھے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ میں سوچتی تھی مجھے بھی ایسے کپڑے پہن کر سب کو سوئیاں لگانی چاہئیں۔ چنانچہ میں نے بھی داخلہ لے لیا اور ٹریننگ لے کر کام کرنے لگی۔''

بلقیس کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے آٹھویں تک پڑھا جبکہ ایدھی صاحب نے تو صرف دو جماعتیں پڑھی ہیں۔ شادی کے بعد ایدھی فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں میں مصروف ہو گئیں تو ماں نے حوصلہ افزائی بھی کی اور مدد بھی۔ بلقیس کے چار بچے ہیں۔ دو

MashalBooks.org

بیٹے اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ ان کی ماں کا دو سال قبل انتقال ہو گیا۔ اب بیٹیاں ہم رکاب ہیں۔ کہتی ہیں ''میں سمجھتی ہوں کہ بیٹیاں ہونی بہت ضروری ہیں۔ جس گھر میں بیٹیاں نہ ہوں تو وہاں فرشتے نہیں آتے۔''

یہ سب سادہ لوح، سادہ دل، سادہ طرز زندگی، بے لوث خدمت، بے غرضی اور خلوص و تندہی، یہی بلقیس ایدھی کی پہچان ہے۔ بلکہ اصل نام ایدھی ہے۔ اس کے ساتھ عبدالستار لگا دیا جائے یا بلقیس، کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

ایدھی نیوز لیٹر کے ایک صفحے پر 39 بچوں کی تصویریں لگی ہیں یہ اور دوسرے سینکڑوں بچے اپنے والدین کی شفقت سے محروم ایدھی ہومز میں پرورش پا رہے ہیں۔ ایدھی فاؤنڈیشن کو ہمہ وقت ان کے وارثوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایک ماہ کی رپورٹ کچھ اس طرح ہے: ''گزشتہ ماہ 223 گم شدہ یا گھر سے بھاگ کر آنے والے بچوں کو وارثوں تک پہنچایا گیا۔ جبکہ گھر سے بھاگ کر آنے والی 19 لڑکیوں میں سے چودہ کو سمجھا بجھا کر ان کے گھروں میں بھیج دیا گیا۔ باقی پانچ لڑکیوں کو ایدھی ہومز میں داخل کر لیا گیا۔''

ایک اور تحریر: ''کبھی بھی کسی مجبوری یا ناگواری کی وجہ سے معصوم بچے کا گلا گھونٹ کر کوڑے یا کچرے کے ڈھیر پر نہ پھینکئے۔ پورے پاکستان میں ہمارے کسی بھی سینٹر میں دے دیجئے یا خاموشی سے ہمارے سینٹروں پر رکھے ہوئے جھولے میں ڈال دیجئے۔ بلقیس ایدھی۔''

ایک ایسا معاشرہ جہاں مسجد کی سیڑھیوں پر نومولود بچے کو پتھروں سے لہولہان کر کے مار دیا جائے، وہاں بلقیس ایدھی کے ''جھولا پراجیکٹ'' کا جاری ہونا بہت ہمت اور دیدہ دلیری ہے۔ لیکن جب گلی کے بینچ پر سوئے ہوئے عبدالستار ایدھی کو قریب سے ٹوکری میں چھوڑے گئے بچے کی آواز نے جگایا۔ جب پہاڑ گنج کی خودرو گھاس میں ایک سسکتی ہوئی بچی ملی جس کا ایک بازو کسی جانور نے کھا لیا تھا۔ جب حیدرآباد کے علاقے کی کچرا کنڈی میں ایسی بچی ملی جس کا چہرہ کسی جانور نے نوچ کھایا تھا تو بلقیس ایدھی کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ ایسا اقدام کریں کہ معصوم جانیں محفوظ ہو جائیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کی بہت مخالفت ہو گی۔ یہی ہوا۔ مختلف حلقوں سے بلقیس ایدھی پر الزمات دھرے گئے کہ وہ گناہ

کرنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ گناہوں کو پال کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنا کام کرتی رہیں۔ اب تک ملک بھر کے ستر مقامات پر جھولے رکھے گئے ہیں۔ گزشتہ 19 برسوں کے دوران جھولوں کے وسیلے سے 25 ہزار بچے ایدھی کے شفیق ہاتھوں میں آئے۔ ان میں سے بہت سے بچے انتقال کر گئے۔ اس سے مراد بے اولاد میاں بیوی ہیں۔ان بچوں میں سے بعض اپنے نئے والدین کے ہمراہ بیرون ملک چلے گئے اور وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کچھ بچیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر ماہ 5 یا چھ بچے وصول کرتے ہیں۔ بعض بچے جھولوں کے علاوہ نامعلوم افراد کے ٹیلی فون یا کسی اور ذریعے سے اطلاع ملنے پر بھی ایدھی سنٹر لائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بار میٹھا در میں کسی بزرگ کی درگاہ پر ایک عورت بچہ لئے بیٹھی تھی۔اس نے کسی سے کہلوایا کہ ایدھی صاحب سے کہو کہ آ کر بچہ لے جاتی ہیں۔ ایدھی فوراً وہاں پہنچے اور بچے کو گود میں لے لیا۔

کچھ عرصے سے ایدھی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام برسہا برس سے نظر بند مرد اور عورت قیدیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایدھی لیگل ایڈ سیکشن کے تحت مدد کی جا رہی ہے جس میں ان کے مقدمات کی مفت پیروی بھی شامل ہے۔ نیز، ''ایدھی خود کفالت سکیم'' کے تحت نادار افراد اور بیوہ خواتین کو گائے، بھینس، بکریاں اور مرغیاں دی جاتی ہیں تاکہ وہ ان زندہ عطیات کو اپنا وسیلہ روزگار بنا سکیں۔ مثلاً گزشتہ دنوں ہری پور کے علاقے میں ''مرغ گھرانے'' تقسیم کئے گئے۔ اس میں نو مرغیاں اور ایک مرغ شامل تھا۔ یہ ایک ترغیب ہے کہ اگر آپ محنت کریں اور اپنی قسمت کو کوسنا چھوڑ دیں تو ایک ''مرغ گھرانے'' سے بہت بڑا پولٹری فارم بن سکتا ہے۔

# شمیم زین الدین

شمیم زین الدین کو جان لیں تو عملِ پیہم کے معانی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ ایک کام کے بعد دوسرا کام، دوسرے کے بعد تیسرا، قدم بہ قدم بڑھنے کا ایک طویل سلسلہ۔ کبھی کسی کو ایک آواز روکتی ہے کہ میرے کام کو پہچانو۔ میرے ارتقائی عمل کو تسلیم کرو۔

طلبا کی سرگرمیاں، پیشہ وارانہ مصروفیات، سیاسی جلسے، احتجاجی جلوس، سماجی فلاح و بہبود کی دھن، اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھنے کی آرزو، ادبی و علمی حلقوں میں شرکت۔ شمیم زین الدین، طلبا کے مطالبات کی خاطر بھوک ہڑتال کر رہی ہیں۔ ایوب خان کے مارشل لا کے خلاف جلوس میں نعرے لگا رہی ہیں۔ جلوس پر گولی چلا دی گئی۔ ''گھنن گھنن گولی برسی، گولی برسی، گولی برسی'' شاعر کہہ رہا ہے۔ شمیم زین الدین اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بدولت گرفتار کر لی گئیں۔ وہ جیل میں ہیں۔ شمیم زین الدین اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے بیڑے میں شامل ہو گئی ہیں۔ وہ اورنگی بستی میں نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل سن رہی ہیں۔ سیکٹر ون ڈی کی ایک عورت انہیں بتا رہی ہے کہ اس نے نو بچے پیدا کیے۔ بڑا بیٹا 23 سال کی عمر میں ہیروئن کا عادی ہو کر مر گیا۔

گلشن بہار کا ایک 27 سالہ پلمبر انہیں بتا رہا ہے کہ وہ سہراب گوٹھ کے افغانوں سے روزانہ 50 روپے میں ایک پڑیا خرید کر کھاتا تھا۔ مگر اب وہ اس سے چھٹکارہ پانا چاہتا ہے اس لئے وہ پشاوری گولی کھاتا ہے۔ ہیروئن سے نجات دلانے والی جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی یہ پڑیا 20 روپے میں آتی ہے۔

شمیم زین الدین سبز ستارہ فیملی پلاننگ کے پروگرام کے بارے میں مضمون لکھنے میں مشغول ہیں۔

انہوں نے ہمیشہ وقت کی ڈور کو سنبھال رکھا۔

MashalBooks.org

شمیم زین الدین پیشے کے لحاظ سے ایم بی بی ایس ہیں۔ ان کا تعلق یو پی کے ایک پٹھان خاندان سے ہے۔ وہ ایک قدامت پسند گھرانے کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی۔

قیام پاکستان کے بعد وہ لکھنؤ سے لاہور پہنچیں تو دیال سنگھ کالج میں داخلے کی غرض سے گئیں۔ انٹرویو لینے والے کالج کے پرنسپل عابد علی عابد تھے۔ انہوں نے خاندان اور ہجرت کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات کئے کہ انہیں یہ احساس ہوا کہ اپنی کوئی شناخت ہی نہیں ہے۔ لاہور میں قلیل عرصے کے قیام کے بعد کراچی آ گئیں اور ڈی جے سائنس کالج سے ایف ایس سی اور ڈاؤ میڈیکل کالج سے سنہ 58 میں ایم بی بی ایس پاس کیا۔

بارہ سال کی عمر میں آل انڈیا فیڈریشن لکھنؤ کے پلیٹ فارم سے جوشیلی تقریریں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا تھیں۔ پھر کالج کے زمانے میں طلبا کی تنظیموں میں عمل پیرا رہیں۔ ایک شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے ملک بھر کے تعلیمی حلقوں میں شہرت مل چکی تھی۔ اسی زمانے میں نیشنل عوامی پارٹی زوروں پر تھی۔ شمیم زین الدین کا تعلق ایک کٹر مذہبی اور زمیندار گھرانے سے تھا لیکن وہ بائیں بازو کی سیاست سے بہت متاثر تھیں۔ ان کے شوہر نیپ مغربی پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے۔ انہی سرگرمیوں کے دوران کی ملاقات مولانا بھاشانی اور دیگر ترقی پسند رہنماؤں سے ہوئی۔ بلکہ جب وہ ایم بی بی ایس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے کی تیاری کر رہی تھیں تو مولانا بھاشانی نے کہا کہ اس ملک میں ڈاکٹر عورتیں تو بہت ہیں لیکن عملی سیاست میں بہت کم ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنے ملک میں رہ کر سیاسی کام کرو۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔

انہیں یاد ہے کہ وہ بچپن میں اپنے والد اور دادا سے مشہور تاریخی واقعات سنتی تھیں۔ چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کی بہادری اور مہمات سے بہت متاثر تھیں۔ انہی دنوں اپنے والد کے کتب خانے سے جو کتابیں پڑھیں تو یہ احساس ہوا کہ انسانوں کے درمیان اونچ نیچ کے بہت رشتے ہیں۔ زمیندار اور کمی کاریوں کا رشتہ، مرد اور عورت کا رشتہ، ذات پات، تفرقات کے کئی درجے۔

شمیم کے شوہر پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، مگر وہ مزدور رہنما بھی تھے۔ اس لئے وہ ان کی شریک کار بھی ہو گئیں اور محروم طبقوں خصوصاً مزدوروں، کسانوں، طالب

علموں اور خواتین کے حقوق کی جدوجہد کرنیوالی تحریکوں اور تنظیموں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ انہی دنوں رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس کی رکنیت حاصل کر لی کہ اس میں بائیں بازو کے دانشوروں سے ملاقات رہے گی اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔

اپنے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ میں پاکستان کی سڑکوں کی پی ایچ ڈی ہوں۔ کام کے دوران جہاں کہیں رات ہوگئی پڑاؤ ڈال دیا۔ سرائے میں دو روپے کرائے کی چارپائی میسر آئی تو اسی پر سو گئے جو ملا کھا لیا۔ ایک تسکین کے ساتھ کہ یہ بے آرامی ایک مقصد کے لئے ہے۔ ان کے نزدیک طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ انہوں نے بہت سفر کیا۔ طوائفوں کے کوٹھے سے لے کر ایوان صدر تک، جاگیرداروں کی حویلی سے لے کر ہاریوں کی کچی جھونپڑیوں تک، کارخانے داروں کی تمکنت سے لے کر مزدور کی بے بسی تک۔

شمیم کے شوہر چند سال قبل انتقال کر گئے۔ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ گزر اوقات کے لئے ان کا پیشہ بہت کام آیا۔ کیونکہ انہوں نے سیاست کی بنیاد پر مالی مفاد حاصل نہیں کیا۔ شوہر کی زندگی میں بھی اور بیوگی کے بعد اپنی روٹی ڈاکٹری پریکٹس سے کمائی۔ وہ بھی بس اس حد تک کہ زندگی کی گاڑی چلتی رہے۔ اکثر مفت نسخے بھی دیتی ہیں۔

شمیم زین الدین تادم تحریر سیاست میں سرگرم ہیں لیکن عملی طور پر وہ گزشتہ کئی برسوں سے اورنگی پائلٹ پراجیکٹ (او پی پی) کے لئے کام کر رہی ہیں۔ او پی پی کا آغاز 1980ء میں کیا گیا تھا۔ اس تنظیم نے کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی میں تحقیق کے علاوہ عملی طور پر ترقیاتی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس علاقے میں مقامی لوگوں کے تعاون سے کم لاگت زیر زمین نکاسی آب کا نظام، گلیاں بنانا اور ان کی صفائی کے بارے میں مکینوں میں شعور پیدا کرنا۔ تعویذ گنڈا، ٹوٹکا، روحانی علاج پر یقین رکھنے والی عورتوں کو تعلیم و تربیت پر آمادہ کرنا اور ترغیب دینا کہ ان کی زندگیوں میں غیر محسوس طریقے پر انقلابی تبدیلی لائی جا سکے۔ ان تمام کاموں میں شمیم زین الدین کی محنت اور پرخلوص کوششیں شامل ہیں۔

ان کے دل میں یہ تڑپ بدستور ہے کہ ملک کے اہم معاملات اور پالیسی سازی میں عورتوں کی بھرپور نمائندگی ملنی چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر صوبائی گورنروں کے عہدوں پر عورتیں متعین ہوں تو وہ سماجی شعبے کی تقرری کے لئے بہت بہتر طور پر کام کر سکتی ہیں۔

MashalBooks.org

# تموج

MashalBooks.org

MashalBooks.org

# رضیہ بھٹی

''ایک برس اور گزر گیا اور اکیسویں صدی مزید قریب آ گئی لیکن پاکستان بھر میں بے شمار عورتوں کے لئے یہ پیشروی بے معنی ہے۔ بہت سے سال آئے اور گزر گئے لیکن ان کے لئے وقت رکا رہا۔ سندھ کے کھیتوں اور حویلیوں میں اور بلوچسان کے قبائلی نظام میں یہ کوئی اور صدی ہے، کوئی اور زمانہ۔ تاریک دور۔''

رضیہ نے اپنے ایک اداریے میں لکھا:

''قانون اندھا ہے۔ عورت کی زندگی سستی ہے۔ اتنی سستی کہ ایک عورت کو چائے پیش کرنے میں کاہلی دکھانے پر جان سے مارا جا سکتا ہے۔ وہ جو اکثر پٹتی ہے جنس کی طرح فروخت کی جاتی ہے۔ گدھے کی طرح کام کرتی ہے۔ عورت کو جاگیرداری اور قبائلی نظام میں انسان نہیں سمجھا جاتا۔''

رضیہ نے ماہ نامے میں روزنامے جیسی صحافت کی۔ اس کے زیر ادارت اشاعتوں کا ہر شمارہ تازہ اور آج کے مسائل اور معاملات کو ہائی لائٹ کرتا تھا۔ وہاں کچھ بھی باسی نہیں ہوتا تھا۔ یہ رضیہ کا کمال تھا، ورنہ اکثر ہفت روزے بھی مارکیٹ میں آتے آتے موضوع کے اعتبار سے پرانے ہو جاتے ہیں جبکہ رضیہ نے صحافت میں ابتدائی چند برسوں کے علاوہ ہمیشہ ماہنامے میگزین نکالے لیکن جب بھی ان کا پرچہ مارکیٹ میں آیا مہینے کے آخری نصف میں اٹھنے والے مسئلے کی شہ سرخیاں نظر آئیں۔

رضیہ کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق کوکنی بوندرے خاندان سے تھا۔ رضیہ نے اپنا بچپن منوڑہ میں گزارا۔ ان دنوں ان کے والد کے۔ پی ٹی میں ڈپٹی کنزرویٹر تھے۔

رضیہ اپنے تین بھائیوں اور دو بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھیں۔ رضیہ نے ابتدائی تعلیم کراچی گرامر سکول سے اور گریجویشن سینٹ جوزف کالج سے کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد جرنلزم میں بھی ایم اے کیا اور دونوں بار سونے کے تمغے حاصل کیئے۔

رضیہ کے والد پیار سے کہتے ''یہ تو میرا چوتھا بیٹا ہے۔''

کراچی پریس کلب میں کے۔ یو۔ جے کی جانب سے سینئر صحافیوں کی 25 سالہ خدمات کے عوض ٹرافیاں دینے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ رضیہ اپنی شیلڈ لے کر آئیں۔ ان کے بعد ایک اور صحافی خاتون شیلڈ لے کر اسٹیج سے اتریں تو رضیہ نے آواز دی اور پوچھا ''کیا تمہاری شیلڈ پر بھی For His Contribution لکھا ہے؟'' غور سے دیکھا تو وہاں بھی ''ہر'' کے بجائے ''ہز'' ہی تھا۔ ''چلو ٹھیک ہے ویسے بھی ہم لوگ ''ہز'' ہی ہوتے ہیں۔ کام جو ایسے کرتے ہیں'' اس پر سب نے مل کر زوردار قہقہہ لگایا۔

اس روز رضیہ نے بڑے خوبصورت پرنٹ کا سلکی سوٹ پہن رکھا تھا۔ کانوں میں بُندے تھے۔ تقریب کے بعد وہ جلدی میں گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں تو آواز آئی ''کہاں جا رہی ہو؟ کھانا نہیں کھانا کیا؟'' ''نہیں۔ مجھے ایک شادی میں جانا ہے۔'' رضیہ کو تمام رشتے نبھانے ہوتے تھے۔

رضیہ نے اپنی صحافت کا آغاز 1967ء میں الیسٹریٹڈ ویکل آف پاکستان سے کیا۔ ان دنوں یہ جریدہ آخری سانس لے رہا تھا۔ انتظامیہ نے بالآخر اسے بند کر کے سنہ 1971ء میں ماہانہ ہیرالڈ نکالا۔ شروع میں ایک سینئر صحافی نے ماہنامے کی نگرانی کی لیکن بعد ازاں رضیہ اس کی ایڈیٹر ہو گئیں اور ماہنامے میں ادارتی جرأت مندیاں نظر آنے لگیں تو اکثر یہ سوال اٹھتا کہ مضامین کے موضوعات اور رپورٹس کے بارے میں کون فیصلہ کرتا ہے؟ جواب ہوتا ''کوئی نہیں.......... رضیہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آئندہ شمارے کے بارے میں خود فیصلہ کرتی ہیں۔''

بالآخر رضیہ کو اس کی قیمت چکانا پڑی۔ جب انتظامیہ پر مارشل لا حکومت کا دباؤ تھا۔ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ملک بھر کے صحافیوں، ایڈیٹروں اور کالم نویسوں کا اجلاس اسلام آباد میں بلاتے اور سامنے بورڈ پر ہیرالڈ آویزاں ہوتا تاکہ وہ اپنے ہم نوا صحافیوں کو ہیرالڈ کی

راست گوئی کے ''جرائم'' کے بارے میں بتا سکیں۔ رضیہ بھٹی نے آخر کار استعفیٰ دے دیا۔ ان کے ساتھ ہیرالڈ کی پوری ٹیم بھی مستعفی ہو گئی۔ کئی ماہ کے غور وفکر کے بعد رضیہ اور ان کے ساتھیوں نے نیوز لائن نکالنے کا فیصلہ کیا لیکن ان کے لئے کوئی مخیرّ شخص سرمایہ کاری کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان سب نے ہیرالڈ گروپ سے ملنے والی پونجی لگائی اور پرچہ نکال لیا۔ رضیہ کو نیوز لائن کا نام بہت پسند تھا۔ وہ اس میں قطعی کوئی تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھیں۔ کسی نے ازراہ مذاق کہا۔ ارے ماہنامے کا نام نیوز لائن کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ جب تک پرچہ چھپے گا نیوز ڈیڈ لائن ہو چکی ہو گی۔ لیکن رضیہ نے کبھی ایسے نہ ہونے دیا۔ وقت کی نبض پر اس کا ہاتھ مستحکم رہا۔

رضیہ بھی ملک میں طویل برسوں کے بعد جمہوریت کی بحالی پر خوش تھیں۔ جذباتی تھیں۔ نیوز لائن کے پہلے شمارے پر (جولائی 89ء) پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بےنظیر بھٹو کی تصویر تھی۔

پرچہ دیکھ کر کسی نے مذاق کیا ''ارے آپ لوگ بے نظیر کے پیچھے نہیں پڑے کیا؟''

رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا ''ابھی نہیں۔''

ابھی تو جمہوریت کے حمایتی اپنی خوشی میں رچے بسے تھے۔ لیکن زیادہ وقت نہ گزارا تھا کہ جب............

نیوز لائن رضیہ بھٹی کے خوابوں کی تعبیر تھا جہاں اظہار کی مکمل آزادی ہو۔ سچ دیکھنے اور سچ لکھنے کی آزادی، کوئی مداخلت نہ ہو۔ کسی سمجھوتے کی مجبوری نہیں۔

بے نظیر کی پہلی حکومت کو رضیہ کے اداریوں ''پیسہ لو اور بھاگو'' ''قرضوں کا سکینڈل'' نے ناراض کر دیا تھا۔ پھر ملک کے کچھ بااثر لوگوں اور اداروں کے بارے میں مضامین شائع ہوئے تو نیوز لائن کے اشتہار بند ہو گئے۔

ایک بار رضیہ، نواز شریف کا انٹرویو لینے گئیں تو انہوں نے شکایت کی ''آپ نے تو میری دھجیاں اڑا دیں۔''

خواتین کی اکثریت کے ایک صحافی گروپ کے میگزین نیوز لائن نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ کئی انعامات، کئی اعزازات۔

نیوز لائن نے کاروکاری، شتر بچے اور پابستہ مزدوروں جیسے حساس موضوعات پر کھل کر لکھا۔

جب نیوز لائن نے بدعنوان سیاست دانوں اور تشدد پسند سیاسی گروہوں کے بارے میں لکھا تو دھمکیاں دی جانے لگیں۔ رضیہ کو، خود ان کے ساتھیوں اور خاندان کے افراد کو خطرہ لاحق تھا۔ رضیہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ باز آ جائے۔لکھنا چھوڑ دے یا ملک سے باہر چلی جائے۔ رضیہ کا جواب تھا: ''کیا کر لیں گے؟''

رضیہ کو لکھنا تھا اور لکھا:

''نارتھ ناظم آباد کراچی کی ایک ماں نے اپنے بیٹے کے بستر میں کلاشنکوف دیکھی تو اچانک یہ تکلیف دہ سچ سامنے آیا کہ شہر کی ''بندوق ثقافت'' گھر تک پہنچ گئی ہے.........''

''شاید یہی وقت کا پیمانہ ہے کہ اب پریس کی آزادی کا انحصار سرکاری احکام پر نہیں بلکہ اب یہ بندوق کی نالی پر طے کی جاتی ہے۔ پاکستان کا پریس جو پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس، سنسر شپ، کوڑے اور قید سے نبرد آزما ہو گیا تھا اب وہ کلاشنکوف کا یرغمال ہے۔''

رضیہ سیاسی مبصر تھی۔ رضیہ ایڈیٹر تھی۔ رضیہ دوستوں کی دوست تھی۔ وہ ماں تھی، بیوی تھی، مگر رضیہ فیمی نسٹ بھی تھی۔

رضیہ بیجنگ کانفرنس میں شرکت کے بعد لوٹیں تو اپنے ادارے میں لکھا:

بیجنگ کانفرنس نے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا اور اس کی ایک بار پھر یقین دہانی کروائی کہ عورتوں کے مسائل بھی ہر ملک کے بڑے دھارے کے مسائل ہیں۔ اگر بین الاقوامی مالیاتی ادارے دنیا بھر میں امتیازی ترقیاتی ماڈل پیش کرتے ہیں تو وہ بھی عورتوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر حکومتیں صحت اور تعلیم کے اخراجات کم کرتی ہیں تو ان شعبوں میں عورت کی محرومی مزید بڑھ جاتی ہے۔ بڑھتی ہوئی اسلحہ کاری، مسلح تصادم اور قرضوں کی بے ہنگم پالیسیوں کے ساتھ بھی عورت کا وہی تعلق ہے جو سماجی اور انسانی ترقی میں صنفی تفریق سے ہے۔

رضیہ بھٹی کو کام کرنے کا جنون تھا۔ جن دنوں نیوز لائن پریس جانے والا ہوتا، رضیہ اور ان کے ساتھی رات بھر دفتر میں کام کرتے۔ انہوں نے وہاں کچھ تکیے اور کمبل بھی

رکھ چھوڑے تھے کہ جسے نیند آئے وہ کچھ دیر کو سو سکے۔ یہ بھی ہوتا کہ جس ساتھی کو گھر جانا ہوتا اس کی ڈیوٹی ہوتی کہ وہ سب کے لئے صبح کو چنے اور حلوہ پوری کا ناشتہ لے کر آئے۔

رضیہ نے محروم طبقوں، مظلوم انسانوں کا خیال رکھا۔ نیوز لائن کو اپنے دو بچوں کی طرح پالا پوسا، لیکن اپنی صحت کی طرف دھیان نہیں دیا۔

رضیہ بھٹی 12 مارچ 1996ء کو انتقال کر گئیں۔

ان کی اچانک موت پر وائس آف امریکہ سے فون تھا۔ سوال تھا ''کیا رضیہ پر آج کل کوئی پریشر تھا؟''

رضیہ نے تو ہمیشہ سے اپنی جان پر سو طرح کے پریشر ڈال رکھے تھے۔

MashalBooks.org

# نجمہ بابر

1993ء کے عوامی انتخابات کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ جمہوریت کی بحالی کے بعد سابقہ دو حکومتوں کو بوجہ قبل از وقت ختم کر دیا گیا تھا۔ صحافیوں کی جماعت ایک بار پھر حرکت میں آ گئی تھی۔ ماہنامہ ہیرالڈ کراچی نے الیکشن اسپیشل نکالنے کا ارادہ کیا تو نجمہ کے لئے بہت ساری ذمہ داریاں تھیں۔ ضیاء الحق کی کرم فرمائیوں میں ایک یہ بھی تھا کہ اقلیتوں کے لئے علیحدہ انتخابی رائے دہی کا قانون بنا دیا تھا۔

اس ضمن میں سروے کرتے ہوئے نجمہ نے نہ صرف اقلیتی ارکان کی رائے معلوم کی بلکہ انہوں نے ممتاز قانون دان کے ساتھ رابطہ کر کے آئینی ترمیمات کے بعد اقلیتوں کو درپیش مسائل کے بارے میں ان کا نقطہ نظر معلوم کیا۔

ایک قانون دان جو ہندو فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ آئین میں تبدیلی کرتے وقت ہمیں یہ جھانسا دیا گیا کہ مخلوط انتخابات میں اقلیتوں کے نمائندے کامیاب نہیں ہوتے اس لئے ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ علیحدہ انتخابات میں شرکت کریں۔ یہ غلط ہے کیونکہ ماضی میں کئی بار اقلیتوں کے نمائندے مخلوط انتخابات میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔

ضیاء الحق نے نہ صرف یہ بلکہ اقلیتوں کے ساتھ بھی عورتوں کا سا سلوک کیا۔ حدود آرڈیننس کے تحت کئے گئے مقدمے میں چار مرد مسلمانوں کی شہادت ضرورت ہے۔ غیر مسلم کی شہادت قابلِ قبول نہیں۔ مثلاً کراچی کی کرسچئن اعظم بستی میں اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے زنا بالجبر کرتا ہے۔ وہاں کے ارد گرد کے لوگ چونکہ عیسائی ہیں۔ اس لئے ان کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ گویا مجرم کو سزا نہیں ہو سکتی۔''

1993ء نجمہ کی عملی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ نجمہ بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا خاندان بمبئی سے کراچی منتقل ہو گیا۔ نجمہ نے ابتدائی تعلیم کراچی گرامر سکول سے گریجویشن پی ای سی ایچ ایس کالج سے اور ایم اے جرنلزم کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔

نجمہ نے طالب علمی کے زمانے سے ہی فعال زندگی گزاری۔ وہ کراچی یونیورسٹی کی طلبہ کی یونین این ایس ایف رشید گروپ کی سرگرم رکن اور یونٹ چیف تھیں۔

جب کراچی میں انجمن جمہوریت پسند خواتین کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے بانی ارکان میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے جریدے ''ورسٹی پنچ'' میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔

یہ سنہ 72 کا ذکر ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاسی منظر میں نوجوان نسل کے لئے ایک کرشمہ ساز شخصیت کے بطور ابھرے تھے۔ بائیں بازو کی سیاست زوروں پر تھی۔ مزدوروں کے جلسے، طلبا کی سرگرمیاں، جمہوریت پسند عورتوں کے اجتماع، نجمہ کہیں سے غیر حاضر نہ ہوتیں۔ وہ عوامی ادبی انجمن کے اجلاسوں میں بھی موجود ہوتیں۔

اور انہی دنوں نجمہ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو سیاسی کارکن صحافی تھا۔ لیکن ابھی تک اسے کسی اخبار میں باقاعدہ ملازمت نہیں ملی تھی۔ نجمہ کا تعلق شہر کے ایک معزز اور متمول گھرانے سے تھا۔ اس شخص نے نجمہ کو شادی کی پیشکش کی۔ نجمہ نے فوراً ہاں کر دی۔ بڑے گھر کی بیٹی ایک بیروزگار صحافی کو رفیق حیات بنانے کے لئے تیار تھی۔ تو کیا ہوا؟ ملازمت تو مل ہی جائے گی لیکن یہی وہ شخص ہے جس کے ساتھ سیاست، ادب، جمہوریت، آرٹ، ہر موضوع پر ذہنی ہم آہنگی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بازو تھاما اور زندگی کی راہوں پر نکل آئے۔

نجمہ ایک کل وقتی صحافی بننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے روزنامہ سن، مارننگ نیوز، ہیرالڈ، آؤٹ لک اور دیگر اخبارات اور جرائد میں لکھنا شروع کر دیا۔ انہیں سوویت یونین قونصلیٹ کی جانب سے نکالے جانے والے بلیٹن'' کی ادارت کی پیشکش ہوئی۔ یہ سلسلہ سوویت یونین کے زوال تک جاری رہا۔ افغانستان میں انقلاب آ چکا تھا۔

مارشل لا دور میں ویمنز ایکشن فورم بنی۔ ان دنوں نجمہ اور ان کا خاندان شاہراہ فیصل سے ملحقہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ''ویف'' کے ابتدائی مرحلے کے

بہت سے اجلاس اس فلیٹ میں منعقد ہوتے تھے۔

ویمنز ایکشن فورم کی سرگرمیاں، کچھ بستیوں میں عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے مسائل جاننا، ان کے حل کی چارہ جوئی کرنا، نجمہ کی عملی زندگی کا اہم حصہ تھا۔ نجمہ سنہ 80 کے عشرے کے اوائل سے روزنامہ سٹار میں شرکت سے عملی صحافت کے بڑے دھارے میں شامل ہو چکی تھیں۔

8 مارچ 1984ء میں نجمہ کا ایک مضمون سٹار میں شائع ہوا ''ایک عشرہ اور ایک دن۔'' 8 مارچ عورتوں کا عالمی دن، اقوام متحدہ کے عورتوں کے عشرے میں آنے والا دن۔

''دبلی پتلی وہ عورتیں جو صبح 9 بجے سے شام پانچ بجے تک فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں ان کے لئے عورتوں کا عالمی دن بے معنی ہے۔ وہ لاکھوں عورتیں جو وسیع کھیتوں میں اور کچے گھروں کے کیچڑ آلود دالانوں میں صبح سے شام تک کمر توڑ محنت کرتی ہیں، ان کے لئے اقوام متحدہ کا عورتوں کا عشرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

1975ء سے 1985ء تک اقوام متحدہ کے عورتوں کے عشرے کے دوران پاکستانی عورت نے اپنے حقوق کو کٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ امتیازی سلوک سے دو چار ہوئی۔ اسے بے عزت کیا گیا، خریدا اور بیچا گیا۔ اسے صحت بخش سپورٹس میں شرکت سے روکا گیا۔ اس سے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق چھینا گیا۔ اس پر آنسو گیس پھینکی گئی۔ اس پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ جیل میں بھیجا گیا اور سر عام کوڑے لگائے گئے۔

سنہ 85ء میں پاکستانی عورت کے رتبے کے ضمن میں قائم کردہ ضیاء الحق کے ''انصاری کمیشن'' کی رپورٹ آ گئی تھی جو محض آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھی۔ ایک طرف چادر اور چار دیواری کی فصلیں کھینچی جا رہی تھیں تو دوسری طرف عورت کے مقام کی بہتری کے لئے کمیشن بنایا گیا تھا۔

نجمہ نے رپورٹ کو کھنگالا اور اس کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''گزشتہ برسوں میں عورتوں کے خلاف تشدد میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا۔ کمیشن کو اس موضوع پر علیحدہ باب شامل کرنا چاہئے تھا۔''

''رپورٹ میں دیہی عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جاگیرداری حالات

پر بحث کی گئی ہے۔''

دراصل ایسا معاشرہ جس کی بنیاد اقتصادی مفادات پر ہو، اس پر روایتیں اور سماجی اقدار حاوی ہوتی ہیں۔ ہماری اقتصادی بنیاد جاگیرداری پر ہے اس لئے تمام اقدام جاگیردارانہ ہیں۔ جب تک عورتوں کی نجات کے لئے جاگیرداری ڈھانچے کو کمزور نہیں کیا جاتا، سماجی ترقی کے تمام منصوبے اور پروگرام کسی قسم کی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

وقت گزرتا رہا۔ نجمہ اپنی پرانی فوکس ویگن میں فاصلے طے کرتی رہیں۔

نجمہ کے شوہر نے کئی برس تک صحافت میں گزارنے کے بعد نجی کمیونی کیشن فرم کھولی۔ اقتصادی حالات میں بہتری آئی۔ نجمہ نے دو بچوں کو جنم دیا۔ کام، گھر، بچے ایکٹوزم۔

نجمہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو بخوبی نمٹاتے ہوئے ہمیشہ تروتازہ نظر آتی۔ دھیمے لہجے میں بات چیت۔ چہرے پر مسکراہٹ۔

خبر تھی کہ نجمہ علیل ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔

نجمہ علاج کے لئے لندن چلی گئی۔ وہ اب بہتر ہے وہ پاکستان لوٹ آئی ہے۔

نجمہ اپنے اخبار کے دفتر کی راہداری میں ملی۔ کیا ہوا؟ کام نہیں ہو پا رہا۔ سوچا استعفیٰ دے دوں۔ ایڈیٹر نے میری استعفیٰ منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ سوچتی ہوں، فری لانسنگ کروں گی۔ دفتر آ کر کام کرنا مشکل لگ رہا ہے۔ نجمہ کو ہیپاٹائٹس سی کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔

نجمہ کے والد کا انتقال ہو گیا اور کچھ دوست تعزیت کے لئے آئے تھے۔ نجمہ کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ وہ حال ہی میں لندن سے چیک اپ کے بعد لوٹی تھی۔ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی ''میں نے ڈاکٹر سے پوچھا میں کتنا عرصہ زندہ رہوں گی۔؟''

وہ کہنے لگا کہ You want me to play God

رضیہ بھٹی کو بہت سارے لوگ اسے آخری منزل تک پہنچانے کے لئے جا رہے تھے، نجمہ سوگوار تھی۔ رو رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔

نجمہ نے کہا ''اچھا میں چلتی ہوں، تھک گئی ہوں۔'' نجمہ تم تو کبھی نہیں تھکتی تھیں۔

نجمہ کی طبیعت بگڑ گئی۔ اسے سول ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے

ہوئے شوہر سے کہا ’’this is it‘‘ ہسپتال میں اس نے سب سے کہہ دیا تھا کہ اب مجھے علاج کے لئے باہر نہ لے کر جائیں۔ مجھے میرے ابا کے قدموں میں دفنائیں۔ کسی نے اس کی باتوں کو اہمیت نہ دی۔ سب کو یقین تھا وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ کراچی ایئرپورٹ پر اسے لندن لے جانے کے لئے ایئر ایمبولینس پہنچ گئی تھی۔ نجمہ کوما میں تھیں لیکن نہیں۔

نجمہ بیگا نے ملک سے رخصت نہیں ہونا چاہتی تھی۔

19 اپریل 1996ء صبح پانچ بجے سول ہسپتال کراچی میں نجمہ بابر ہم سب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔

MashalBooks.org

# عاصمہ جہانگیر

نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ سنگل کالم خبر:

انسانی حقوق کمیشن برائے پاکستان کی چیئر پرسن عاصمہ جہانگیر کے خطاب کے بعد ایشیا سوسائٹی کے صدر نکولس پلاٹ نے کہا کہ ہماری سوسائٹی کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی کسی شخصیت کو اتنا پرجوش خراجِ تحسین پیش نہیں کیا گیا۔

یہ فروری 1998ء کا ذکر ہے۔ عاصمہ کو ان دنوں ہاورڈ یونیورسٹی میں خطاب کرنا تھا کہ ایشیا سوسائٹی نے انہیں ''بااختیار خواتین'' کے تقریری سلسلے میں ''ہندوستان اور پاکستان کی ممتاز عورتوں کی کامیابیوں'' کے ضمن میں مدعو کیا تھا۔

عاصمہ جہانگیر کے خطاب سے پہلے ان کی زندگی پر 10 منٹ کی دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ عاصمہ نے بطور انسانی حقوق کی سرگرم کارکن اور ایک وکیل کی حیثیت سے پاکستانی عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انہوں نے پاکستان کے آئین اور حدود آرڈیننس کے تضاد کی نشاندہی کی۔ انہوں نے جھوٹے مقدمات میں ملوث ان عورتوں کا ذکر کیا جو جیلوں میں بند ہیں۔

عاصمہ جہانگیر نے اپنی سحر انگیز تقریر سے ایشیا سوسائٹی کے آڈیٹوریم کے حاضرین کو مبہوت کر دیا تھا۔ عاصمہ کی تقریر کے بعد بہت سی امریکی عورتیں ان کا آٹوگراف لینے کے لئے لپکیں جبکہ نیویارک میں زیرِتعلیم پاکستانی طالبات نے پیشکش کی کہ وہ ان کے کاموں میں کس طرح مددگار ہوسکتی ہیں۔

عاصمہ جہانگیر کے لئے رسالہ ''نیوز لائن'' نے لکھا کہ ''عاصمہ وہاں پہنچ جاتی ہیں

MashalBooks.org

جہاں جاتے ہوئے اکثر مرد بھی گھبرا جاتے ہیں۔ سپریم کورٹ کی یہ منحنی سی ایڈووکیٹ اپنے سر پر اعزازات کے اتنے کلاہ پہنتی ہے کہ امیلڈا مارکوس کے پاس اتنے جوتے بھی نہ ہوں گے۔ وہ بے شمار ملکی اور غیر ملکی اداروں کے تنظیموں کے ساتھ منسلک ہیں۔

عاصمہ بہت بیباک ہے، بہت نڈر ہے۔

سنہ 1994ء میں بیجنگ کانفرنس سے پہلے سیڈا (CEDAW) پر حکومت پاکستان کی توثیق کا مسئلہ تھا۔ ہیومن رائٹس کمیشن نے یونیسکو کے تعاون سے کراچی کے پرل کانٹی نینٹل میں اسی سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھیں۔ عاصمہ نے پاکستانی عورتوں کے لئے سیڈا کی توثیق کی اہمیت کا ذکر کرنے سے پہلے کہا ''وزیراعظم! اس کے باوجود کہ ہم آپ کی مخالفت کرتے رہتے ہیں، آپ ہماری دعوت پر تشریف لائیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

23 مارچ 1998ء کو لاہور میں ہیومن رائٹس کمیشن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں: ''ملک میں یک طرفہ احتساب کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے نظیر بھٹو کی غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ انہوں نے اتنے غلط کام کئے ہیں کہ کسی اور نے نہ کئے، لیکن احتساب سب سیاستدانوں اور جرنیلوں کا بھی ہونا چاہئے۔''

جس روز بے نظیر کی دوسری حکومت برطرف کر دی گئی اور بچوں سمیت انہیں گھر میں نظر بند کیا گیا تو عاصمہ اولین فرصت میں اسلام آباد پہنچیں اور بچوں کی بیجا نظر بندی کے خلاف پٹیشن دائر کر دی کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی تھی۔

عاصمہ کے نزدیک کسی وزیراعظم کے بچے ہوں، یا منظور مسیح ہو، سب برابر ہیں۔

جہاں کہیں، ملک کے کسی کونے میں، جب کبھی کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی عاصمہ کا احتجاج اور اس کے مذمت دور تک سنائی دی۔ پھر کبھی یہ بھی ہوا کہ ان کی بے لوث خدمات کا استحصال کیا گیا۔

عاصمہ جہانگیر کراچی میں ایک دوست کے ہاں بیٹھی تھیں۔ وہ بتا رہی ہیں کہ صائمہ وحید کیس میں کس طرح زیریں لہریں چل رہی تھیں۔ انہیں کس طرح ملوث کیا گیا۔ اس کے پس منظر میں کس کس کا ہاتھ تھا۔

عاصمہ بنیاد پرستی کی دشمن ہیں۔ منافقانہ رویوں سے نفرت کرتی ہیں۔ ویف کا 12

فروری 1983ء کا تاریخ ساز جلوس عاصمہ کے دفتر سے نکلا تھا۔ پھر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ جلوس عاصمہ کے ہم خیال دوستوں اور ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ اس کی سرگرمی ٹھنڈی نہیں پڑی بلکہ ہر طرح کی زیادتی اور ناانصافی پر اسے نئی زندگی ملتی رہی۔ زیادتی سہنے والے بھٹے کے مزدور ہوں، مزدور بچے ہوں یا سندھ کے ہاری ہوں، شانتی نگر میں اقلیتوں کی بربادیاں ہوں یا عیسائی پادری کی خودکشی، جدوجہد کا کارواں بڑھتا رہا ہے۔

لیکن یہ لڑتی جھگڑتی خاتون بے حس نہیں ہے۔ وہ انسانی حقوق کی علمبردار ہے تو انسان بھی ہے۔

رضیہ بھٹی اچانک انتقال کر گئیں۔ یہ ایک سانحہ تھا، المیہ تھا۔ عاصمہ کو پتہ چلا تو پہلی پرواز سے کراچی پہنچیں۔ رضیہ جا چکی تھی۔ عاصمہ دوستوں کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ رضیہ سے ان کا انسانی رشتہ تھا۔

ایک بار جب ان کی بہن حنا جیلانی سے پوچھا گیا کہ آپ اور عاصمہ یکساں طور پر مصروف اور پیشہ وارانہ کاموں میں مشغول ہیں مگر عاصمہ نے تو شادی کی، آپ نے کیوں نہیں کی؟

انہوں نے مذاقاً کہا کہ ''عاصمہ کو تو پڑوسی لڑکے کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ مجھے کسی سے نہیں ہوئی۔''

عاصمہ نے کنیئرڈ کالج سے بی اے کیا تو شادی ہو گئی، مگر وہ بہرصورت وکیل بننا چاہتی تھیں۔ لاہور کے لا کالج کے پرنسپل کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئیں کہ وہ وکیل نہ بنے۔ پہلا اعتراض تھا کہ شوہر سے اجازت نامہ لاؤ۔ شوہر بیرون ملک تھے۔ عاصمہ نے اپنے والد سے اجازت نامہ لے لیا۔ پرنسپل نے نامنظور کر دیا۔ عاصمہ اپنے سسر کو پرنسپل کے پاس لے گئیں۔ پرنسپل نے کہا کہ کالج کا ماحول لڑکیوں کے لئے سازگار نہیں ہے۔ پرنسپل کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی جو ان کے سامنے بیٹھی ہے؟ اگر کچھ کرنا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ عاصمہ نے پرائیویٹ طور پر قانون کی ڈگری حاصل کی اور اپنی زندگی عورتوں اور معاشرے کے تمام مظلوم طبقوں کے لئے اور ماحول سازگار کرنے کی جدوجہد کے نام کر دی۔

سنہ 1983ء میں ساہیوال کی اندھی لڑکی صفیہ بی بی پر حدود آرڈیننس کے تحت

مقدمہ چلا۔ اس پر جو احتجاج ہو اس کی وجہ سے صفیہ کو بری کر دیا گیا لیکن عاصمہ کی سرگرمیوں سے خوفزدہ مارشل لا حکام نے انہیں گھر میں نظر بند کر دیا اور سال کے آخر میں جیل بھیج دیا گیا۔

مئی 1986ء میں ضیاء الحق کی پسندیدہ جماعت کی ایک ایم این اے نے قومی اسمبلی میں ویف کی رکن عاصمہ جہانگیر پر الزام لگایا کہ انہوں نے ایک مذاکرے میں رسول اللہؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے ہیں۔ اس لئے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور ویمنز ایکشن فورم پر پابندی لگا دی جائے کہ یہ فورم غیر اسلامی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ یہی وہ دن تھے جب نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین بطور خاص اسلام آباد سے کراچی آئے تھے اور وہ اس جریدے کے دفتر میں جو ویف کی حمایت کرتا تھا، سٹاف کے سامنے عورتوں کے ''اس مغرب زدہ ٹولے'' کے خطرناک عزائم کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح کی سنسر شپ تھی کہ آئندہ ان کی حمایت کی جرأت نہ کی جائے۔

شریعت بل کے نفاذ کے سلسلے میں ایک سیمینار کی صدارت وفاقی شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس آفتاب حسین نے کی تھی، جنھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ مذاکرے کے دوران کوئی ایسی بات کہی گئی جس سے عاصمہ کو توہین رسالت کا مجرم ٹھہرایا جائے لیکن اس دور کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ الزام کے حق میں کوئی ثبوت یا گواہی نہ ہونے کے باوجود سپیکر اسمبلی نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے وزیر قانون کو عاصمہ پر مقدمہ دائر کرنے کی ہدایات دے دیں، جس پر جماعت اسلامی نے عاصمہ کی موت کا مطالبہ کیا۔

عاصمہ جہانگیر کی شخصیت کی سچائی ان کی آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ وہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں جھانک کر بات کرتی ہیں۔ عاصمہ کی اولوالعزمی ان کی آواز میں کھنکتی ہے۔

ایک ایڈیٹر کا فون تھا۔ پوچھا ''عاصمہ جہانگیر کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ وہ کب کراچی آ رہی ہیں؟''

''کیوں؟''

''ان کی کچھ تصویریں بنانی ہیں۔''

''کوئی انٹرویو ہے کیا؟''

MashalBooks.org

''نہیں وہ اکثر اچھے کام کرتی رہتی ہیں اس لئے تصویر کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔''

''عاصمہ کو کوئنز یونیورسٹی اونٹاریو، کینیڈا نے ان کی خدمات پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

1999ء میں جناب افراسیاب خٹک انسانی حقوق کمیشن کے چیئرمین منتخب ہو گئے اس لئے عاصمہ اب ایچ آر سی پی کی چیئرمین نہیں ہیں۔

MashalBooks.org

# کشور ناہید

کشور ناہید جب اپنے سرکاری دفتر میں ادارے کی سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہوتی ہیں تو صدیوں پرانے پدری نظام کے کل پرزے ڈھیلے ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

گھنٹی بجی، ہیڈ کلرک فائل لئے حاضر ہوا۔ وہ ڈکٹیشن لے رہا ہے۔ ہدایت: ''پچھلا خط پڑھو۔ نہیں، یہ جملہ ٹھیک نہیں۔ میں نے تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ آگے ہو کر بیٹھا کرو اور دھیان سے سنا کرو۔''

حلق میں اٹکتی ہوئی آواز آتی ہے ''جی میڈم، سوری میڈم۔''

دفتر کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک نوعمر افسر اندر آتا ہے وہ اپنے تیئں اعلیٰ عہدے پر ہے، لیکن میڈم کا ماتحت ہے۔ مؤدبانہ عرض کرتا ہے ''شام کے وقت فنکشن کے تمام انتظامات مکمل ہیں۔ کراچی اور لاہور کے مہمان آ چکے ہیں۔''

''شاباش بیٹا! میں ساڑھے چار بجے ہوٹل پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو مہمانوں کو لانے والی گاڑی کا ایئر کنڈیشنر خراب ہے، اسے تین بجے تک ٹھیک ہو جانا چاہئے۔''

''جی میڈم'' پدر شاہی کا ایک نٹ بولٹ فرش پر گر کر گول گول گھومنے لگا۔

وہ کہہ رہی تھیں ''کلرکی میں نے اپنے آپ کو خود سکھائی ہے۔ عورت برابری کا حق مانگتی ہے تو برابری کا مظاہرہ بھی کرے۔ یہ نہیں کہ رات کی ڈیوٹی لگے تو کہہ دے کہ میں عورت ہوں۔ یہ نہیں کر سکتی۔ فرائض میں رعایتیں مانگیں گے تو حقوق کیسے ملیں گے۔ میں اپنا ہر کام پوری دل جمعی اور محنت سے کرتی ہوں۔ میں یہ سننا نہیں چاہتی کہ میں چونکہ عورت ہوں اس لئے یہ کام نہیں کر سکتی یا یہ کہ مجھے یہ کام نہیں آتا۔

گزشتہ 15-20 برسوں کے دوران کشور ناہید کے سپرد کئی طرح کے سرکاری محکمے کئے گئے۔ پاکستان نیشنل سنٹر لاہور بھی ملک بھر میں قائم دوسرے سینٹرز کی مانند تھا۔ مردہ ادارہ۔ مگر کشور نے وہاں آئے دن سرگرمیوں کا تہلکہ مچا دیا۔ مارشل لا حکام کے چیلوں نے چغلی کھائی۔ حضور آپ نے کس خطرناک عورت کو وہ پلیٹ فارم سونپ دیا ہے۔ یہ ملک کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ کشور کا تبادلہ کر دیا گیا۔ محکمہ اطلاعات کے جریدے ''ماہ نو'' کا نام بھول چکے تھے۔ اب وہ ایک بار پھران کے ہاتھ میں تھا۔ پھر نواز حکومت نمبر 1 میں کشور کو او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ یہ وار بھی حصہ لیا۔ ''ارے تم لوگ مجھے کام نہیں کرنے دیتے ہو۔ پرواہ نہیں۔ میرے پاس اور بہت سے کام ہیں۔ حوا ایسوسی ایٹس عمل میں آئی۔ لڑکیوں کو پڑھانے، انہیں تربیت دینے، انہیں خود کفالت کی ترغیب دینے والی ایک غیر سرکاری تنظیم۔

''نابرابری کا احساس ہوش سنبھالتے ہی ہونے لگا تھا۔ مشاعرہ پڑھنے جاتے۔ صوفی تبسم، زیڈ اے بخاری یا ایسی ہی کسی بڑی شخصیت کی صدارت ہوتی۔ پہلا اور دوسرا انعام لڑکوں کا۔ لڑکیوں کے لئے ہمیشہ کنسولیشن انعام۔''

کشور ناہید نے اپنی سوانح عمری میں لکھا کہ ''ابا نے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کی، لیکن ماں نے بچوں کو پڑھانے کے لئے سوجتن کئے۔ پھر نانا نے ماں سے کہا ''میرے گھر مت آؤ۔ تم لڑکیاں پڑھا رہی ہو۔''

کشور ناہید، بلند شہر (ہندوستان) میں پیدا ہوئی۔ زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزارا۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ان کی وجہ سے کونسل ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ توقع ہے کہ وہ آئندہ اسی بے رونق سرکاری شہر کو آباد رکھنے کی دھن میں لگی رہیں گی۔

کشور نے لاہور کالج فار ویمن سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ گزشتہ 36 برسوں سے سرکاری ملازمت میں ہیں اور تقریباً اتنے ہی عرصے سے غیر سرکاری اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی مصروف ہیں۔

سکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو ایلس فیض کے ساتھ عورتوں کی ترقی اور ان میں شعور پیدا کرنے کے لئے دیہاتوں میں جانے لگیں۔ انہیں یاد ہے کہ ''ہم جس چارپائی پر بیٹھتی تھیں، اسے دھویا جاتا تھا کہ یہ ناپاک ہوگئی ہے۔

''حسینیں'' آئی تھیں۔ کئی برس تک مسلسل کام کرنے کے بعد یہ فرق پڑا کہ وہی عورتیں اپنی بیٹیوں کے رشتے طے کرنے کے لئے ''باجی'' کے مشورے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔

برسوں بعد کشور کی ڈاک میں پنسل سے لکھے ہوئے خط آتے ہیں۔ خط لکھنے والوں کے کئی نام ہیں۔ ذکیہ، عابدہ، فوزیہ، مسرت، امتیاز، رابعہ، صائمہ، رضیہ لیکن ان کی زبان پر ایک ہی انداز کا تشکر ہے: ''میں آپ کی شکرگزار ہوں۔ آپ کی وجہ سے میں اب ان پڑھ نہیں رہی۔ اب میں کتابیں، اخبار اور رسالے پڑھ سکتی ہوں اور لکھ بھی سکتی ہوں۔ آپ نے ہوم سکول کھول کر مجھ جیسی اور بہت سی لڑکیوں پر احسان کیا ہے۔''

کشور ناہید نے اپنی تنظیم حوا ایسوسی ایٹس اور انسانی حقوق اور خواتین کی دیگر تنظیموں کیساتھ مل کر کام کیا اور بدستور برسرکار ہیں۔ سنہ 65 کی جنگ میں واہگہ، کھیم کرن، چونڈا کے علاقوں میں راکھ ہوتی زندگیاں، خاک میں ملتی حسرتیں دیکھیں یہ منظر بھی دیکھا کہ درختوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور جوتوں میں ہڈی پڑی ہے۔ ایک جوتا رہ گیا۔ بدن جانور کھا گئے یا جل کر ختم ہو گئے۔ وہ عورتیں جن کے ساتھ لوگوں نے زیادتی کی تھی، ان کو گھر والے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کشور نے ایسے تمام لوگوں اور اجڑے ہوئے گھروں کو بسانے کے لئے وہ سارے انتظامات کئے جو ممکن تھے۔

سنہ 1971ء میں انہیں سرکاری طور پر مشرقی پاکستان بھیجا گیا کہ وہ بنگالیوں کے خلاف لڑنے والے سرکاری اہلکاروں کے حق میں کتابچہ لکھیں۔ لیکن وہاں یہ صورت حال تھی کہ ''بوڑھی گنگا کے کنارے کیمپ میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ وہ عورتیں جو بمشکل تیرہ سے پندرہ سال کی دبلی پتلی لڑکیاں تھیں۔ جن کی چھاتیاں ابھی سانس بھی نہ لینے پائی تھیں، مگر ان کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے۔

70ء کی دہائی میں جب عورت کی گواہی آدھی ہو گئی، اس کے خون کی قیمت بھی آدھی ٹھہری تو اس کے خلاف احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں۔ چیخ یک جا ہو کر تحریک بن گئی تو شور اس گروہ میں پابہ رکاب تھیں۔ اس میں ان حکومتی احکامات کے خلاف احتجاج بھی شامل تھا کہ عورتوں کو کسی ادارے میں اول پوزیشن نہ دی جائے یا یہ کہ عورتیں صرف عورتوں کے نعتیہ مشاعرے میں شرکت کر سکتی ہیں۔

MashalBooks.org

کشور نے عورت کے حق میں اور اسے دوسرے درجے کی شہری قرار دینے والوں کے خلاف مزاحمت میں ہر میڈیم استعمال کیا۔ وہ شعر ہو یا نثر، وہ مقصدیت سے جدا نہیں ہوئیں۔ ان کی چالیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں طبع زاد کے علاوہ تراجم اور تالیفات بھی شامل ہیں۔

زندگی کی اس تگ و دو کا حاصل؟ نجی سطح پر انہیں جو کامیابی نظر آتی ہے وہ یہ کہ برقعہ اتارنے، ملازمت کرنے، مشاعرہ پڑھنے، اپنی پسند کی شادی کرنے اور ٹی وی پر آنے پر خاندان بھر میں جو طوفان اٹھ چکا تھا وہ بعد میں خاموش ہو گیا۔ خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لئے دروازے کھل گئے۔ لیکن اس وقت ناکامی کا احساس ہوتا ہے جب ملک کی عام لڑکیوں کو اب بھی نکاح نامے پر انگوٹھا لگانے کو کہا جاتا ہے۔

اور کشور ناہید بیک وقت کئی سمتوں میں رواں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف وہ عورتوں کی اقتصادی قوت اور ان کے حقوق کے حق میں لکھتی اور بولتی ہیں۔ مباحثے کرتی ہیں وہ اس پر آزردہ خاطر ہیں کہ ہمارے ہاں ابھی تک 1876ء کا انگریز کا قانون نافذ ہے۔ کوئی کلچر فنکشن ہو تو ڈپٹی کمشنر سے اجازت لینا ضروری ہے وہ فنکشن ڈپٹی کمشنر صاحب کو پسند آ جائے لیکن اس کا پچاس دعوت ناموں کا مطالبہ پورا نہ ہو سکے تو وہ پروگرام کینسل کر دیتا ہے۔

MashalBooks.org

# نگہت سعید خان

یقین محکم............ اپنی ذات پر، اپنی صلاحیتوں پر بیجنگ کانفرنس کے دوران این جی اوز فورم کے بڑے اجلاس میں نگہت سعید خان کو خطاب کرنا تھا۔ ہال دنیا بھر کے مختلف خطوں، مختلف زبانوں، مختلف رنگتوں اور نسلوں، مختلف نظریوں، متفرق مذہبوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔نگہت مائیک پر آئیں۔ اپنا تعارف کروایا۔

''میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں سوشلسٹ ہوں۔''

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ حیران کن بات تھی۔ پاکستانی وفود کے لئے اپنی ایک نمائندہ عورت کا عالمی سطح کی کانفرنس سے خطاب کرنا خوشی کی بات تھی، لیکن یہ تعریفی تالیاں!!۔ وہ کانفرنس ایک سوشلسٹ ملک کی سرزمین پر منعقد ہو رہی تھی۔ یہ بات بہت سے سرمایہ دار اور دائیں بازو کے بنیاد پرست گروہوں کو زیادہ پسند نہیں تھی۔ گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان نے بھی بنیاد پرست ہونے کے حوالے سے خاصی شہرت پائی ہے۔ پھر سوشلزم تو خود خاصے عرصے سے ناکام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ پھر یہ............؟!!

یہ دراصل نگہت سعید کی بھرپور خود اعتمادی تھی۔ یہ ان کا اپنی ذات پر ایک بے لاگ تبصرہ تھا جس کا فوری ردعمل فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔

ایوب کا دور تھا۔ کالج کی طالبات نے ریلی نکالنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس روز تمام طالبات اسمبلی میں نہیں جائیں گی۔ یہ احتجاج دراصل اس تحریک کی کڑی تھی جو ایوب خان کی آمریت کے خلاف چل رہی تھی۔ ''لیکن عین اس وقت جب پرنسپل آئیں تو ریلی میں شریک تمام لڑکیاں ایک ایک کر کے اسمبلی میں چلی گئیں۔'' نگہت کہہ رہی تھیں ''دو تین سو طالبات میں سے میں اکیلی وہاں کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی کہ نہیں، میں اسمبلی

میں نہیں جاؤں گی۔ اس پر مجھے ایکسپل (EXPEL) کر دیا گیا۔''

جہدِ مسلسل............ سرخ اینٹ سے بنی ہوئی عمارت کی دوسری منزل کے دروازے پر ''ڈائریکٹر'' کی تختی لگی ہے۔ یہ نگہت سعید کا کمرہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ویمنز اسٹڈیز (IWSL) ابھی چار پانچ سال پہلے صرف ایک خیال تھا، ایک ارادہ تھا، خواہش تھی کہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جہاں پر عورتوں کے امور کے بارے میں تحقیق کی جائے اور اپنی تمام خواتین جو ایکٹوزم میں دلچسپی رکھتی ہیں انہیں اس ضمن میں باقاعدہ تربیت دی جائے۔ وہ خواہش ایک ٹھوس پیرائے میں نظروں کے سامنے تھی۔ ایک منزل، جہاں سے عمل کی اگلی راہوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے بھی تو بڑے مراحل تھے، بہت سارے مسائل تھے، رکاوٹیں تھیں جنہیں عبور کرنے کے لئے ارادے کی پختگی اور ان تھک محنت کی ضرورت تھی۔

انسٹی ٹیوٹ آف ویمنز اسٹڈیز کی ڈائریکٹر اور نیویارک کے سلمز میں سماجی کام کرنے، ایک فیکٹری کی ملازمت، ہوٹل میں ایک معمولی چار وومن (صفائی کرنے والی عورت) کے درمیان ایک طویل فاصلہ ہے۔

نگہت سعید خان دہلی میں پیدا ہوئیں۔ والد فوج میں تھے۔ نگہت نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی اور کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے بی اے کیا۔ اس سے قبل کچھ عرصہ لندن میں گزارا۔ والدین کی مالی استطاعت بس اتنی تھی کہ وہ صرف ایک بچے کو بیرون ملک تعلیم کے لئے بھیج سکتے تھے۔ نگہت بضد تھیں کہ وہ بھی جائیں گی لیکن بیٹے کو بھیجنا والدین کی ترجیح تھی۔ نگہت نے والدین سے صرف ٹکٹ کے اخراجات لئے۔ باقی سب کچھ خود کمایا اور اپنے تعلیمی اخراجات خود پورے کئے۔

یہ 1968ء سے 1971ء کا زمانہ تھا۔ امریکی سیاست ایک نیا رخ اختیار کر چکی تھی۔ ملک میں ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاجی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ دوسری طرف سیاہ امریکیوں کے لئے شہری حقوق کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ نگہت سعید کولمبیا یونیورسٹی میں مارکسزم پڑھ رہی تھیں۔ ذہنی نشوونما کے لئے یہ عرصہ بہت زرخیز تھا۔

جب وہ پاکستان واپس آئیں تو بھٹو کا دور شروع ہو چکا تھا۔ بائیں بازو کے گروہ ماؤ اور ماسکو، دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ نگہت نے ماؤ گروپ کا ساتھ دیا کہ مشرقی

پاکستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی کے خلاف احتجاج میں ماؤ گروپ کا مطمحِ نظر مناسب تھا۔

نگہت کچھ عرصے تک قائداعظم یونیورسٹی کے ساتھ منسلک رہیں۔لیکن اس دوران سیاسی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ پھر وہ ایم اے مکمل کرنے کے لئے دوبارہ امریکہ چلی گئی اور سنہ 1981ء میں عین اس دن وطن لوٹیں جب ویف کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔

جب ملک میں خواتین کی علیحدہ یونیورسٹی کے بہانے عورتوں کی تعلیم کو محدود کرنے کا شور ہو رہا تھا تو نگہت اور ان کے ساتھیوں نے متبادل یونیورسٹی کے طور پر سوشل ریسرچ ایسوسی ایٹس کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں ''اثر'' (اپلائڈ سوشیو اکنامک ریسرچ) کی صورت اختیار کر لی۔گزشتہ برسوں کے دوران ''اثر'' کے تحت خواتین کے مسائل اور موضوع پر مبنی کئی تحقیقی کتب شائع ہو چکی ہیں جو انگریزی اور اردو زبانوں میں ہیں۔ نیز بیجنگ کانفرنس سے پہلے اور بعد میں اثر نے ملک بھر کی ہر طبقے کی فعال عورتوں کو جمع کرنے اور انہیں کانفرنس کی غرض و غایت اور دیگر معلومات فراہم کرنے کے لئے بھرپور کردار ادا کیا۔

مارشل لا حکام کے خلاف احتجاج کرنے اور عورتوں کے بارے میں ان کے اقدامات کی مذمت کرنے میں ویف کے کردار کے شبارے میں نگہت کا کہنا ہے کہ ویف نے آواز اٹھائی تو سیاسی پارٹیوں میں بھی ہمت آئی۔ وگرنہ سب لوگ فوجی حکومت سے خوفزدہ ہو کر سر چھپائے ہوئے تھے، چپ تھے۔ دراصل سیاسی جمہوری عمل ویف کی پیش قدمی سے ہی شروع ہوا۔قومی ایجنڈے پر عورتوں کے مسائل رکھے گئے۔ اگرچہ ابھی تک کوئی مثبت کام نہیں ہو سکا اور قومی سطح پر عورتوں کی حیثیت میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔

اپنی سیاسی سرگرمیوں کے ماحصل کے بارے میں نگہت کا کہنا ہے کہ متوسط طبقہ کئی محاذوں پر لڑ رہا ہے۔ ان میں غصہ بھی ہے۔ کچھ کرنے کا جذبہ بھی لیکن ہم مردوں کی نفسیات نہیں بدل سکے۔ یہ مرد ایکٹوسٹ عورتوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے جلسے جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں، خود کو بہت ترقی پسند اور روشن خیال ظاہر کرتے ہیں لیکن کبھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو لے کر نہیں آتے۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی خودمختار ذہن کی عورت شادی کر لے تو وہ اسے کچل دیں گے۔ کیونکہ بظاہر لبرل مرد بھی یہ برداشت نہیں

کرے گا کہ عورت کے کام کی اہمیت زیادہ ہے یا اس کی اپنی کوئی شناخت یا حیثیت بنتی ہے۔

نگہت کی تنظیم ''اثر'' میں ان کے ساتھ کئی نوعمر لڑکیوں اور لڑکوں کو سرگرم عمل دیکھا گیا ہے۔ لیکن وہ نوجوان نسل کی عام روش سے خوش نہیں ہیں۔

''یہ ضیاء الحق کے بچے۔ یعنی جو 60 کے عشرے میں پیدا ہوئے اور مارشل لاء میں ہوش سنبھالا وہ ذہنی طور پر بالکل غیر سیاسی ہیں۔'' نگہت کہتی ہیں ''یہ پھدکتے ہوئے آتے ہیں۔ ایک جگہ دو چار ماہ لگائے، پھر کسی اور طرف نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ان امور کے بارے میں قطعی سنجیدہ نہیں ہیں۔''

آئی۔ ڈبلیو۔ ایس۔ ایل کے قیام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے نگہت کا کہنا ہے کہ ''اس کا ایک مقصد جنوب ایشیائی عورتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بھی ہے۔ ہم جنوبی خطے میں رہنے والے لوگ باہمی اتحاد کے بغیر شمال کے ساتھ نہیں لڑ سکتے۔''

ہم اگر ایک سیکولر دنیا کا خواب دیکھتے ہیں تو متعلقہ امور پر تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ اپنے حالات اور ثقافت کے مطابق کوئی آئیڈیالوجی مرتب کر سکیں۔ مارکس نے سوشلزم کا نظریہ دینے سے پہلے برسوں تک برٹش لائبریری میں مطالعہ اور تحقیق کی اور پھر کوئی لائحہ عمل اور حکمت عملی پیش کی۔ دائیں بازو کے لوگوں کے پاس آئیڈیالوجی ہے۔ ان کے پاس لٹریچر ہے، اس لئے وہ اپنے کام بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔

بنی (عرف) خودمختار زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ شادی کرنے کے خلاف نہیں تھیں لیکن کسی ایسے شخص سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی تھیں جو ان کی انفرادی حیثیت کو تسلیم نہ کر سکے۔

''اثر'' کی اشاعت Locating the Self میں بنی نے لکھا ''جب ایک عورت کی شناخت بطور بیوی اور ماں کے اس کے مساوات اور شخصی آزادی کے تصورات سے متصادم ہوتی ہے تو وہ ناپسندیدہ سمجھوتے کرتی ہے۔''

اور بنی یہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

MashalBooks.org

# حنا جیلانی

''پاکستانی عورت کا عام تاثر یہ ہے کہ وہ بہت نیک پروین اور ظلم برداشت کرتی ہے۔ ہماری جدوجہد کا موقف یہ رہا ہے کہ ہم عورتیں ترس کھانے کی شے نہیں۔ ہم مظلوم بن کر نہیں جینا چاہتیں۔ہمیں ہمارے انسانی حقوق دو۔''

حنان نے 1979ء میں بطور وکیل جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو ضیاء کا مارشل لاء لگ چکا تھا۔ عدالتوں میں عورتوں کے ایسے مقدمات آنے لگے تھے جن میں وہ امتیازی قوانین سے متاثر ہو رہی تھیں۔ حالانکہ عورتوں کے خلاف ضیا کے دور میں وضع کئے گئے قوانین سے پہلے بھی عورتوں کے حقوق اور تحفظ کے لئے خاطر خواہ قوانین موجود نہ تھے اور اگر ایسے قوانین تھے تو عورتیں ان سے بوجود مستفید نہیں ہو رہی تھیں۔

حنا کہتی ہیں ''جسٹس عبدالرشید کی زیر نگرانی قائم کئے گئے کمیشن کی رپورٹ جو 1955ء میں آئی، وہ بظاہر اچھی تھی۔ ان کی نیت صحیح تھی۔ کمیشن کی رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ عورت کو طلاق کا حق ملنا چاہئے۔ اسی طرح حلالہ، بچوں کی شادی اور کثیرالازدواجی کے خلاف کمیشن کا رویہ سخت تھا اور وراثت کے لئے سقم ختم کرنے کی سفارش کی گئی تھی جس پر ملاؤں نے بہت شور مچایا اور حکومت نے ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جس کے نتیجے میں 1961ء میں مسلم فیملی لاء آرڈیننس لایا گیا۔ اس میں عورتوں کے حق میں کچھ مثبت باتیں شامل تھیں، لیکن عملی طور پر ان سے عورتوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔

''میں اس وقت باقاعدہ طور پر کسی تنظیم کے ساتھ منسلک نہیں تھی''

حنا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''البتہ ذاتی سطح پر میں اس بارے میں حساس تھی کہ عورتوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس لئے میرا ذہن اس جانب مائل تھا۔ گو کہ

MashalBooks.org

ویف باقاعدہ طور پر 1982ء میں عمل میں آئی لیکن غیر رسمی طور پر ایک ایسے فورم پر بات ہونے لگی تھی جو عورتوں کے حقوق کو تحفظ دے اور ان کی قانونی حیثیت کو بہتر بنائے۔ ویف کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے ان معاملات پر آواز اٹھائی جن پر کبھی کوئی آواز نہیں اٹھاتا تھا۔ اس سے پہلے عورتوں کی جو تنظیمیں کام کر رہی تھیں ان کا عام رویہ بہت مصالحانہ ہوتا تھا کہ پاکستان میں عورتوں کے لئے فیملی لائز موجود ہیں وغیرہ۔ یہ تو عدالتوں میں جا کر پتہ چلا کہ وہ نام نہاد قوانین عورتوں کے لئے کیا کر رہے ہیں۔

حنا کو سیاسی شعور اپنے والد سے ملا جو تمام عمر جمہوریت کی بحالی اور شہریوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ عدالت سے انصاف مانگتے رہے۔

حنا اسلام آباد میں ایک وکیل دوست اور ایکٹوسٹ سے بات کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ایک اور فیمنسٹ کا فون تھا۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں تھے کہ اس روز کی کارروائی کیا تھی۔ حنا نے انہیں خبر دی کہ فرسٹ ویمنز کی پرائیوٹائزیشن کے خلاف پٹیشن دائر کر دی گئی ہے۔ مدعی کا موقف تھا کہ ویمنز بینک کا قیام پاکستانی عورت کی اقتصادی قوت کو بڑھانے کے لئے خصوصی طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ حکومت پاکستان کی پالیسی کا ایک حصہ ہے کہ عورتوں کی ترقی کے لئے ایسے اقدامات کئے جائیں گے اور بیجنگ کانفرنس کے موقع پر تیار کی گئی پاکستانی قومی رپورٹ اور عمل درآمد کی دستاویزات میں اس کی وضاحت موجود ہے جبکہ حکومت پاکستان عالمی سطح پر عورتوں کے حقوق کے ضمن میں تیار کی گئی دستاویز پر دستخط کر چکی ہے تو اس صورت میں ویمنز بنک کو پرائیویٹائز کرنا سراسر زیادتی ہے۔

حنا سے سوال کیا گیا کہ اس سے پہلے کئی دوسرے ادارے اور بنک پرائیویٹائز کئے جا چکے ہیں اور ان میں بھی عورتیں کام کرتی تھیں، تو آپ نے اس پر احتجاج کیوں نہیں کیا؟

''عالمی مالیاتی اداروں کے ایما پر اپنے ملک کی اقتصادی پالیسیوں کو چلانا کسی طرح بھی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔ لیکن ویمنز بنک اور دیگر بنکوں میں یہ فرق ہے کہ اس کے چارٹر میں عورتوں کی اقتصادی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ ہمارا مقصد اس بنک کی عورتوں کی نوکریاں بچانا نہیں۔ ہم نے عدالت کا دروازہ اس لئے کھٹکھٹایا ہے کہ قانون کی نظر میں

کوئی ادارہ اپنے چارٹر کو الگ نہیں کر سکتا۔

فرسٹ ویمنز بنک بہرحال پرائیوٹائز ہو گیا، لیکن حنا اور ان کی ساتھیوں نے کھڑے پانی میں پتھر ضرور پھینک دیا تھا۔ یہ وہ جمہوری اقدام تھا جس کا تعلق آزادی اظہار کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی ایکٹوازم کا مقصد اور کامیابی ہے۔

حنا کے خیال میں ان کی گزشتہ برسوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

''ہمارے شور شرابے کی وجہ سے عورت کی افادیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے قومی ایجنڈے پر لایا گیا۔ ہم نے عورتوں کے حقوق کو عدالتوں تک پہنچایا۔ انہیں سیاسی پارٹیوں کے منشور کا حصہ بنایا گیا۔ ٹھیک ہے ہم حدود آرڈیننس جیسے قوانین کو ابھی تک سرے سے ختم کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن وہ قوانین جو تسلیم شدہ تھے وہ متنازعہ ضرور بنے ہیں۔''

ہماری جنگ مذہب کے خلاف نہیں۔ ہم ملا سے لڑنا نہیں چاہتے۔ یہ بات ویف کے قیام کے اوائل میں اٹھی تھی۔ اس پر ویف میں نفاق بھی پیدا ہوا تھا کہ یہ ایک غیر مذہبی مگر سیاسی پلیٹ فارم ہے۔ ہم صرف مسلمان عورتوں کے حق میں ہی نہیں بلکہ ان عورتوں کے لئے بھی لڑیں گے جو اقلیتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عام رویوں میں تبدیلی لائی جائے۔ ادائیگی حقوق اور تحفظ کے لئے قانون سازی ضروری ہے۔ معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل نو کے لئے راویتوں کے خلاف لڑنا ہوگا۔ ان کے لئے ملا پر بھی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ جیسے کاروکاری کو ملا نے نہیں بنایا۔ یہ ایک روایت ہے جو جاگیرداری نظام کی مرہون منت ہے۔

حنا نے گزشتہ برسوں میں بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اپنے اس تجربے کے بارے میں حنا کا کہنا ہے کہ ''میں قومی سے علاقائی اور بین الاقوامی سطح تک آئی ہو۔ یہ ایک بہت باثمر تجربہ تھا۔ اس سے نہ صرف دوسرے ممالک کی خواتین کے مسائل کے بارے میں جاننے کا موقع ملا بلکہ ہم نے یہ بھی سیکھا کہ اس ضمن میں ان کی کیا حکمت عملی ہوتی ہے۔ مثلاً میں لاطینی امریکہ کی عورتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ ان کے مسائل ہم سے مختلف نہیں۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ جب تک عورتیں اپنے ملک کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ رابطے میں نہ ہوں گی ان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

MashalBooks.org

''نیز یہ کہ بین الاقوامی سطح پر جو کنونشن تیار کیے جاتے ہیں ان میں ہم نے اپنا نقطہ نظر ڈالا۔ اقوام متحدہ جیسے اداروں میں مغرب کی بالادستی کو کم کر کے جنوب ایشیائی ممالک کی بات اوپر اٹھی۔ بلکہ اب تو ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہم انسانی حقوق کے ضمن میں مغرب سے کچھ سیکھنے کے بجائے انہیں معلومات فراہم کرتے ہیں۔

حنا کا خیال ہے کہ عام لوگ جمہوری نظام سے بددل ہو رہے ہیں اور یہ ایک افسوسناک مظہر ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں جمہوری حکومتوں کی جو کارکردگی رہی ہے اس سے جمہوریت کی عزت بتدریج ختم ہوتی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمہوری حکومتوں کا ہر کام فوج کا مرہون منت ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر جیسا نظام بھلا کہاں تک چل سکتا ہے۔ انسانی حقوق کے حوالے سے ہم ملٹرائزیشن کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور ہیں۔

حنا جیلانی نے کیمبرج یونیورسٹی سے او لیول کیا۔ اس سے قبل وہ جیزز اینڈ میری کانونٹ لاہور کی طالبہ تھیں۔ کنیئرڈ کالج سے بی۔ اے اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ حنا سپریم کورٹ آف پاکستان کی ایڈووکیٹ ہیں۔ انہوں نے 1990ء میں پاکستانی وکیل عورتوں کی پہلی لاء فرم قائم کی اور 1986ء میں اے۔ جی۔ ایچ۔ ایس۔ لیگل ایڈ سیل بنایا۔ ان کی تصانیف میں ''مسلم عائلی قوانین کا نفاذ'' ''جیل میں بچے''۔ پاکستانی عورتوں کی حیثیت'' اور دیگر کتابیں شامل ہیں۔

حنان نے شادی نہیں کی لیکن ان کے آٹھ بچے ہیں، یعنی ان کے بہن بھائیوں کے بچے جن پر وہ اپنی ممتاز نچھاور کرتی رہتی ہیں۔ حنا کا طرز زندگی ایسا رہا ہے کہ ان کے رابطے میں کئی مرد ہیں لیکن بقول ان کے ''ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ میں زندگی گزار سکتی۔''

MashalBooks.org

# شہلا ضیاء

گزشتہ پندرہ برس سے بھی زیادہ عرصے سے پاکستانی قوانین پر بہت بحث مباحثے ہوتے تھے۔ یہ بحث معاشرے میں عورت کے مقام سے متعلق قوانین پر مرکوز تھی۔ مثلاً حدود آرڈیننس، قانونِ شہادت اور شریعت بل۔ میڈیا نے ان ایشوز پر وسیع رپورٹنگ کی ہے۔ عورتوں کی تنظیموں نے امتیازی قوانین کے خلاف پر زور جدوجہد کی، لیکن اس کے باوجود حکومتی سطح پر امتیازی قوانین کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ نہ موجودہ قوانین میں کوئی تبدیلی لائی گئی اور نہ ہی کوئی نیا قانون بنایا۔''

شہلا ضیا نے ''عورتیں اور قوانین'' کے موضوع پر اپنے ایک مضمون میں لکھا:

خواتین کی تنظیموں کی جدوجہد: ضیا کا مارشل لا لگ چکا تھا۔ عورت کی گواہی آدھی رہ گئی تھی۔ ''اس روز ویمنز ایکشن فورم اور دیگر تنظیموں نے مل کر لاہور میں قانونِ شہادت کے خلاف مظاہرے کا پروگرام بنایا تھا۔ شہلا اس جلوس میں شامل تھیں جب لاہور کی 40 فٹ چوڑی مال روڈ پر عورتوں کے احتجاجی مظاہرے کو، عورتوں کے حقوق کی حمایت میں، حبیب جالب کے شعروں نے بھڑکا دیا تھا۔ مظاہرین کی جالب کی آواز پر پرزور دار پولیس کو برداشت نہ ہوسکی اور مال روڈ آنسو گیس، لاٹھیوں اور دھکم پیل کا مرکز بن گئی۔ وہ شہلا کی سالگرہ کا دن تھا۔ ان کے شوہر بطور خاص وہ دن منانے کے لئے بیرون ملک سے آئے تھے۔ لیکن انہیں بتایا گیا کہ پولیس شہلا کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ شہلا نے اپنی سالگرہ کی رات حوالات میں گزاری۔

شہلا ضیا نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک وکیل کی حیثیت سے کیا اور تقریباً دس سال تک قانون کی پریکٹس کی۔ یہ 1980ء کا ذکر ہے۔ لاہور کی چار وکیل خواتین نے طے کیا

کہ ایک لافرم بنائی جائے۔ اسکے قیام کا بنیادی مقصد محض اپنے اوقاتِ کار کو سہل بنانا تھا۔ بہرحال اے۔جی۔ایچ۔ایس عورتوں کی پہلی لافرم تھی لیکن یہیں سے شہلا اور ان کی ساتھیوں کی ایکٹوزم کا آغاز ہوا۔ وہ اس طرح کہ جب عورتوں کی لافرم کی خبر ادھر ادھر پہنچی تو عورتوں نے وہاں آنا شروع کیا۔ عورت قانون دان اور عورت کے مسائل کا براہ راست رابطہ بنا۔ نہ صرف یہ کہ عورتوں پر امتیازی قوانین کی زد پڑی تھی بلکہ ان کے مسائل کے اور بہت سے پہلو سامنے آئے جن میں تشدد، تعلیم، صحت، تحفظ وغیرہ شامل تھے۔

شہلا کہہ رہی تھیں ''ویمنز ایکشن فورم اور پنجاب ویمن لائرز ایسوسی ایشن اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کا قیام پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ یہ اور ایسی دیگر تنظیمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں اور ہماری جدوجہد ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

12 فروری کے جلوس کے بعد جب ریاست اور عورتوں کا براہ راست تصادم ہوا تو اس کا سب سے بڑا فائدہ جو ہمیں ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارا ڈر ختم ہو گیا اور یہ احساس بھی ہوا کہ ہمیں اس وقت ہوش آتا ہے جب پانی سر سے گزر چکتا ہے۔ ہم اس وقت اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں جب قانون بن چکا ہوتا ہے اور بہت بہت آگے نکل جاتی ہے۔ قانون ایک دفعہ بن جائے تو اسے ختم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

شہلا ضیا وضاحت کرتی ہیں'' کچھ قوانین ثقافتی اور مذہبی روایتوں کی بنا پر منظور کیے جاتے ہیں اگر یہ ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے کہ ایسے قوانین میں کوئی تبدیلی لائی جا سکے۔

ہم نے اس موقع پر ضرورت محسوس کی کہ ایک انفارمیشن سروس شروع کی جائے تا کہ عورتوں کو ان کے معاشرتی مقام، قوانین اور سیاسی روش کے بارے میں باخبر رکھا جائے لیکن معلومات کی فراہمی کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے جائیں، ہمیں خود اس کا تجربہ نہیں تھا کہ یہ کام کل وقتی توجہ چاہتا ہے اور اس میں وسعت کی بہت گنجائش ہے۔ جب عورت فاؤنڈیشن بنی تو شہلا ضیاء اس کے ساتھ مستقلاً وابستہ ہوگئیں۔

1985ء سے لے کر 1998ء تک عورت فاؤنڈیشن کی کارکردگی کس قدر پر اثر رہی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پاکستان کے 121 ضلعوں میں سے 97 ضلعوں میں عورت

MashalBooks.org

فاؤنڈیشن کے مرکز قائم کئے جا چکے ہیں جن کے ذریعے عورتوں کی تعلیم، صحت اور ان کے پیشے، خصوصاً زراعت کے بارے میں تکنیکی معلومات اور مردوں اور عورتوں کی یکساں اجرتوں کے بارے میں شعور پیدا کیا گیا۔

''ہمیں اپنے کام کی افادیت کے بارے میں بہت اچھا فیڈ بیک ملتا رہا ہے۔ ایک مثال تو یہ ہے کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے زمیندار سے زمین لے کر سکول قائم کیا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی کا خط آیا۔ یہ خط صوبہ سرحد سے زمین لے کر سکول قائم کیا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی کا خط آیا۔ یہ خط صوبہ سرحد کے ایک گاؤں سے تھا۔ لڑکی نے لکھا تھا کہ میرے والد جب سے شہر سے لوٹے ہیں (لڑکی کے والد نے عورت فاؤنڈیشن کی ایک ورکشاپ میں شرکت کی تھی) انکا رویہ یکدم تبدیل ہو گیا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کی وجہ سے یہ سب ہوا۔

شہلا ضیا نے لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا۔ وہ عورت فاؤنڈیشن کی جوائنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ادارے کے تحت چلائے جانے والے پولیٹیکل ایجوکیشن پروگرام اور لیجسلیٹو واچ پروگرام کی ڈائریکٹر ہیں۔

MashalBooks.org

# فریدہ شہید

''الجزائر میں تین عورتوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کے ملک میں عائلی قوانین کے لئے جو مجوزہ ڈرافٹ تیار کیا گیا تھا وہ عورتوں کے حقوق سلب کرتا تھا۔ انہوں نے اس بات کو عام کر دیا۔ بھارت کی ایک مسلمان عورت کی طلاق ہو گئی، لیکن وہ یہ جاننے سے قاصر تھی کہ کیا واقعی اس کی طلاق موثر ہو چکی ہے۔ وہ دوسری شادی کر سکتی ہے کہ نہیں۔ پاکستان میں رہنے والی ایک عیسائی عورت پر حدود آرڈیننس کا اطلاق مناسب ہے کہ نہیں؟''

فریدہ کا کہنا تھا ''اسی طرح کے بے شمار مسائل ان تمام عورتوں کو درپیش ہیں جو مسلم قوانین کے تحت رہ رہی ہیں۔ انہی امور کے پیش نظر ''ویمن لونگ انڈر مسلم لاز (WLUML) کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا مقصد مذکورہ مسائل کے علاوہ مسلم ممالک کی خواتین کا آپس میں تبادلہ خیال کرنا بھی ہے تاکہ اپنے اپنے ملکوں کی خواتین کی بہتری کے لئے موثر لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اس کا بنیادی مقصد عورتوں کو متاثر کرنے والے قوانین کے بارے میں بین الاقوامی بحث سے باخبر رکھنا بھی ہے۔

''پہلے یہ ہوتا تھا'' فریدہ کا کہنا تھا ''کہ مثلاً مراکش میں اگر کچھ ہوا، یا کسی اور ملک میں عورتوں کو جکڑنے کے بارے میں کوئی فتوئ دیا گیا تو اس کی معلومات مغربی ممالک تک تو فوراً پہنچ جاتی تھی لیکن ہمیں کچھ پتہ نہ چلتا اور اگر میڈیا کے ذریعے کچھ معلوم ہو بھی جاتا تو کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں تھا جہاں ان ممالک کی نمائندہ خواتین متحد ہو کر آواز اٹھائیں۔''

فریدہ شہید کو اس ادارے کی جانب سے انسانی حقوق کے فروغ کے عوض 1997ء کا ایوارڈ دیا گیا۔فریدہ اس کی کور ممبر ہیں۔

28 سال قبل فریدہ بیرون ملک سے پاکستان واپس آ رہی تھیں۔ ایوب خان کی حکومت ختم ہوگئی تھی۔ جہاز میں سب لوگ سیاست پر بات کر رہے تھے۔ ''میں نے پہلی بار سیاست کے موضوع پر اس قدر جوش وخروش دیکھا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بڑی ہوگئی تھی اس لئے ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ 1969ء کی بات ہے۔ ویت نام میں امریکہ کی جارحیت کے خلاف امن تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ امریکہ میں اس جذبے سے آشنائی ہوئی۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ چلنا اچھا لگتا تھا۔

فریدہ شہید نے جنیوا یونیورسٹی (سوئٹزرلینڈ) سے سوشیالوجی میں بی۔اے آنرز اور لیڈز یونیورسٹی (انگلینڈ) سے ایم۔اے کیا۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے لاہور میں مقیم ہیں البتہ ان کی نوعمری کا زیادہ تر حصہ بیرون ملک گزرا۔

''ہم چھٹیوں میں پاکستان آتے جاتے تھے تو یہاں آ کر ایک دھچکا لگتا تھا۔ یہاں کے عام لوگوں کی غربت، بے بسی۔ اس کے برعکس دولت مند لوگوں کا رویہ اور ملازموں کے ساتھ ان کا برتاؤ تکلیف دہ تھا۔ بیرون ملک قیام کے دوران ہمارے گھر میں کوئی ملازم نہیں ہوتا تھا۔ بہن بھائیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سب مل کر گھر کا کام کرتے تھے۔ برتن دھوتے تھے۔لیکن یہاں آتے تھے تو جنسی تفریق نظر آتی۔لڑکوں کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔''

فریدہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''لیکن یہ واضح نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا ارادہ لٹریچر پڑھنے کا تھا مگر ملکی حالت دیکھ کر سوچا کہ کچھ عملی کام کرنا چاہئے؟''

فریدہ کو اپنے ملک میں خواتین کی تحریکوں کے بارے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایک ہی جگہ پر دوڑ رہے ہیں۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اپنے ایک مضمون ''پاکستانی خواتین........... پچاس سال بعد'' میں انہوں نے لکھا:

''مختلف عورتوں کی زندگی کا رنگ مختلف ہے۔ کچھ وہ ہیں جو نہایت خود اعتمادی کے ساتھ جدید ترین سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہم کنار ہوتے ہوئے نت نئی رفعتوں کی جانب محو پرواز ہیں۔ دوسری جانب، شہری اور دیہی عورتوں کی اکثریت تابعداری، بے چارگی اور

بے نوائی کے بوجھ تلے پس رہی ہے۔ ان کی زندگی قید تنہائی کی مانند ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہیں۔ دنیا میں ہونے والی شاندار تبدیلیوں کا بھی انہیں کچھ علم نہیں جو بعض اوقات ان کے قرب و جوار میں ہی رونما ہو رہی ہوتی ہیں۔''

فریدہ سنہ 77ء میں مستقل طور پر پاکستان آ گئیں۔ زندگی کا زیادہ تر حصہ مغرب میں گزارنے کے بعد انہیں اقوام متحدہ کے ایک پروگرام کی غرض سے دو سال ایران میں رہنا پڑا۔ شاہ کا آخری زمانہ تھا۔ ایران کے عام ماحول میں بے چینی اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پاکستان واپس آ گئیں اور انہیں پنجاب یونیورسٹی کے جنوب ایشیائی تحقیق کے شعبے میں ملازمت مل گئی۔

فریدہ یاد کرتی ہیں ''ضیاء حکومت کو اعتراض تھا کہ پاکستان پر تحقیق کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا جرم تھا۔ اشاعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اگر ہندوستان پر تحقیق کرنا مقصود ہے تو ہندوستان کے رسالے کیوں آتے ہیں ہم نے ایک کل پاکستان سیمینار پروگرام بنایا تھا جس کا مقصد ان محققوں اور دانشوروں کو جمع کرنا تھا جو پاکستان کی سیاست، اقتصادیات یا خارجہ پالیسی وغیرہ پر کام کر چکے ہیں۔ انہیں بلایا جائے اور وہ عام لوگوں سے مکالمہ کریں۔ ضیا نے اس پروگرام کو منسوخ کروا دیا۔ اس قسم کی صورت حال دیکھ کر میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور شرکت گاہ میں شامل ہو گئی۔

اس دوران انہوں نے عورتوں کے متعلقہ امور پر بہت سے تحقیقی منصوبوں پر کام کیا۔ وہ ویمن آف پاکستان کی معاون مصنفہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین ملکی اور غیر ملکی جریدوں مس شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے آئندہ منصوبوں میں ''ریاست سے عورتوں کا تعلق'' شامل ہے۔ وہ کہتی ہیں:

''گزشتہ برسوں میں عورت پر کئی ذریعوں سے مذہب کا تسلط کر کے اسے پست کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً جب عورت کے ضمن میں بات ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے یہ اسلامی لباس ہے جبکہ مردوں کے لئے وہ قومی لباس ہوتا ہے۔ نیز عورت مذہب سے زیادہ علاقائی روایتوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اپنی کم علمی کی بنا پر اپنے حقوق سے ناآشنا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ جس ملک میں رہتی ہے وہاں وہ آئین کے مطابق اپنا حق کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔''

فریدہ اپنی ذاتی حیثیت میں اور اپنے ادارے شرکت گاہ کی طرف سے عورتوں کو قانونی شعور سے بہرہ ور کرنے کے ان منصوبوں پر کام کر رہی ہیں جنہیں عورتوں کی دیگر شہری اور دیہی چھوٹی تنظیموں کے ساتھ مل کر چلایا جاتا ہے۔

فریدہ شہید کو اس بات کا افسوس ہے کہ بائیں بازو کی جمہوریت پسند تنظیموں نے جمہوری عمل کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایک طرف وہ جمہوریت کی بات کرتے ہیں لیکن کبھی پارٹی الیکشن نہیں کرواتے۔ نہ ہی ان کی قیادت میں کسی تبدیلی کا امکان ہے۔ اس کے برعکس دائیں بازو کی جماعتوں میں قیادت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

یہ باہر کے دباؤ کی وجہ سے ہو یا کچھ اور، بہرحال حکومت اپنی پالیسیوں میں عورتوں کی شمولیت کو تسلیم کر رہی ہے لیکن اقلیتوں کے بارے میں اس کا طرزِ عمل مناسب نہیں۔اس کے نقصان دہ دوررس نتائج ہو سکتے ہیں۔ملکی اتحاد گروہوں میں بٹ سکتا ہے۔

گزشتہ برسوں کی جدوجہد کی کامیابیوں کے بارے میں فریدہ کا کہنا ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ہیں اور ہم اسی پر خوش ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر اندرون سندھ کی کوئی لڑکی ناپسندیدہ شخص سے اپنی منگنی توڑ دیتی ہے تو ہم اسے اپنی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف اس میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا ہوا بلکہ اس کے والدین اور بڑے بھی راضی ہوئے۔ گویا ان کی سوچ میں تبدیلی آئی۔

MashalBooks.org

# نسرین اظہر

ماؤزے تنگ، کارل مارکس، لینن، انسانی تاریخ میں سرخ حرفوں سے لکھے ہوئے ان ناموں سے ایک نظریہ حیات منعکس ہوتا ہے۔ دھرتی کے ہر فرد کو زندہ رہنے کے وسیلے، مساوی مواقعے اور انسانی حقوق فراہم کرنے کا منشور، جس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔

سوشلزم ہار گیا۔ منڈی کی معیشت پھیلنے لگی۔ نج کاری طرز حکومت میں شامل ہو گئی:

نسرین اظہر نے انسانی حقوق پر اپنے ایک مقالے میں لکھا:

''نومبر 1993ء میں منیلا میں منعقد ہونے والے سمپوزیم میں شرکت کرنے والی ایشیا بحرالکاہل کے خطے کی عورتوں نے نشاندہی کی کہ کمیونٹی کے تصور اور کمیونٹی کے حقوق کے بارے میں گہری خاموشی ہے۔ ان کا یقین ہے کہ ایک فرد کے حقوق کے تحفظ کے بعد کمیونٹی کے حقوق کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''طاقت ور کا کمزور پر تشدد کا آغاز اس وقت ہوا جب معاشرے میں نجی ملکیت کا تصور متعارف کروایا گیا۔ اس سے قبل زمین اور اس کی فصل پر تمام لوگوں کا اجتماعی حق تھا۔ کمیونٹی کے تمام ارکان بطور شادی یا کاشت کار زمین سے غذا حاصل کرنے کے مساوی طور پر حقدار تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ جب نجی ملکیت نے کمیونٹی کی اجتماعی جائیداد کی جگہ لی تو زمین، جانور یہاں تک کے انسان بھی طاقت ور اور جنگجو افراد کی ملکیت بن گئے۔ ایک مطالعے کے مطابق عورت نجی ملکیت کی پہلی صورت ہے۔ زمین، جانوروں اور مرد غلاموں

MashalBooks.org

سے بھی قبل کی۔ اس کے بعد پدری نظام کے ڈھانچے کی تشکیل ہونے لگی۔

نسرین کا پہلا تعارف۔

ایک جرمن خاتون کو یاد ہے:

''پچاس کے عشرے میں ہم نے کراچی آرٹ تھیٹر (KAT) کے نام سے ایک گروپ بنایا۔ ہمیں ٹیلنٹ کی تلاش تھی۔ اس گروپ میں دو نوعمر لڑکیاں شامل ہو گئیں۔ وہ بہت باصلاحیت تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام نسرین تھا۔ تھیٹر میں کام کرنے کے لئے انہیں اپنے والدین سے اجازت تو مل گئی تھی لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ ایک نگران ہوتا تھا۔''

نسرین کو یاد ہے کہ وہ جب بڑی ہوئیں تو درختوں پر چڑھنا اور کھیل کود میں دلچسپی لینا ان کا شوق تھا۔ درخت پر چڑھی ہوئی پوتی کو دیکھ کر دادی کہتیں۔ ''ارے تم لڑکی ہو۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

تیرہ سالہ نسرین کو لڑکے لڑکیوں کے کھیلوں میں تفریق کرنے والے گھرانے میں اور گردوپیش میں گھریلو ملازموں کے ساتھ زیادتیوں اور ناانصافیوں کا دکھ ہوتا۔ طاقت ور اور کمزور کا رشتہ علم بڑھا اور مطالعہ کیا تو چین کے آسمان پر سرخ ستارے نے بہت مسحور کیا۔

نسرین اظہر نے سینٹ جوزف کانوونٹ کراچی سے سینئر کیمبرج، ایس ایم کالج سے گریجویشن کیا۔ انہوں نے امریکن یونیورسٹی بیروت سے پبلک ہیلتھ میں تربیتی کورس بھی کیا۔

نسرین 16 سال کی عمر سے سٹیج ڈراموں میں مشغول رہی ہیں۔ ضیاء کے مارشل لا دور میں جب اظہار پر پہرے لگا دیئے گئے تو ''دستک'' کے تحت بریخت کے مشہور ڈرامے ''گلیلیو'' کے مکالموں پر حاضرین کی پرجوش تالیاں نہ صرف ہدایت کاری اور کردار نگاری کے لئے خراج تحسین تھا بلکہ دست نے ایک دریچہ کھولا تھا کہ تازہ ہوا کے ماحول کے حبس کو ختم کر سکے۔ نسرین دستک گروپ کے منتظمین میں سے ہیں۔

جولائی 1983ء میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے انصاری کمیشن قائم کیا۔ انیس ارکان پر مشتمل اس کمیشن کے چیئرمین محمد ظفر احمد انصاری تھے۔ کمیشن کو تین ہفتوں کی میعاد دی گئی تھی تاکہ حکومت کی جانب سے یوم آزادی کے موقع پر آئندہ کے لئے سیاسی لائحہ عمل کا اعلان کیا جا سکے۔

انصاری کمیشن کی سفارشات میں: امیرِ مملکت کا مرد ہونا۔ عورتوں کا سیاست میں آنے کے لئے 50 سال کی عمر کا ضروری ہونا۔ عورتوں کو سرکاری طور پر ریٹائرمنٹ کی عمر سے دس سال پہلے ریٹائر کرنا اور خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹی کا قیام شامل تھا۔

''ویف کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔'' نسرین کا کہنا ہے ''جو تنظیمیں اور افراد کمیشن کی مذکورہ سفارشات کے خلاف تھے وہ ویف کے پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے تھے۔ فیمی نسٹ خواتین کا حتمی فیصلہ تھا کہ ہم مجلس شوریٰ میں نہیں بیٹھیں گے۔ شرکت گاہ میں کراچی کی پہلی میٹنگ ہوئی۔ شروع شروع میں ہمیں کراچی پریس کلب میں میٹنگ کے لئے جگہ مل جاتی تھی۔ وائی ایم سی اے کراچی ہمارے ساتھ تھا لیکن پھر وہ بھی حکام کے ڈر سے ہمیں جگہ دینے سے کترانے لگے۔

اسی دوران فہمیدہ اور اللہ بخش کا کیس ہو گیا۔ ان دونوں کو عدالت کی جانب سے حدود آرڈیننس کے تحت مجرم ٹھہرایا گیا کیونکہ انہوں نے محبت کی شادی کی تھی۔ اللہ بخش کو سنگسار کیا جانا تھا جبکہ فہمیدہ کو سو کوڑے لگانے کا حکم تھا۔

ویف اور انسانی حقوق کی دیگر تنظیموں نے اس عدالتی فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔'' بے شک اس مقدمے میں کچھ قانونی سقم تھے لیکن اسے خارج کروانے میں عوام کی ناپسندیدگی بھی شامل تھی۔ یہ ہماری فتح تھی۔ اسی طرح ساہیوال کے ایک دیہات کی اندھی لڑکی کا مقدمہ تھا جو زمیندار کی ہوس کا نشانہ بنی تھی اور عدالت نے مجرم کے بجائے مظلوم کو سزا دی تھی۔ پھر جب نواب شاہ کا واقعہ ہوا۔ احتجاج اور مذمت کے شعلوں کی لپک پہلے سے زیادہ شدید ہوتی گئی۔ ہم نے اس دوران ملک بھر میں ذی حس افراد، دانشوروں اور اہل سیاست کی حمایت حاصل کرنے کے لئے دستخطی مہم چلائی۔ ہمارا مقصد اسلام کے نام پر معاشرے میں تشدد کی مذمت، فوجی حکومت کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی تھا۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ ثقافتی سرگرمیوں پر پابندی دراصل سوسائٹی کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ہے۔

نسرین اظہر ویف کی بنیادی رکن، اثر ریسورس سنٹر کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی رکن، پاکستان انسانی حقوق کمشن اسلام آباد کی کوآرڈینیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ بہبود ایسوسی ایشن کے ساتھ منسلک رہی ہیں اور ادارہ مشعل پاکستان کے لئے خواتین کے موضوع پر کتابیں ایڈٹ کرتی رہی ہیں۔ صحافت کے ساتھ بھی ان کا سابقہ رہا۔ کچھ عرصے کے لئے

MashalBooks.org

پاکستان ٹائمز لاہور کی ویمنز پیج کی ایڈیٹر رہیں۔ تین سال کراچی کے ایک ماہ نامے ویمنز ورلڈ کی ایڈیٹر بھی رہیں۔

نسرین اظہر کے رضا کارانہ فلاحی کاموں کی فہرست میں دارالفلاح راولپنڈی سے وابستگی بھی شامل ہے۔ یہ ادارہ حکومت پاکستان کی طرف سے مشرقی پاکستان سے آنے والی سینکڑوں بیواؤں کی بحالی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

نسرین نے کئی لڑکیوں کو اس وقت پڑھایا جب وہ تعلیم بالغاں پراجیکٹ کے لئے کام کر رہی تھیں۔ لڑکیاں ذوق وشوق سے پڑھنے آتی تھیں لیکن وہ چند روز بعد غائب ہو جاتیں یا پھر باپ سکول میں آتے اور اپنی بیٹیوں کو زبردستی گھر لے جاتے۔ وہ کہتے: ہمیں پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ نوکری تو نہیں کرنی۔ ایک لڑکی ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتی تھی۔ باپ لے گیا اور اس کی شادی کر دی۔ ''یہ سن کر'' نسرین کہہ رہی تھیں ''مجھے لگا جیسے ایک پہاڑ میرے سر پر گر گیا ہو۔ میں اس لڑکی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔''

نسرین نے اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ کراچی کی بستیوں میں کئی سٹریٹ ڈرامے بھی کیے۔ نسرین شادی شدہ ہیں، ان کے تین بچے ہیں۔

MashalBooks.org

# فریحہ ظفر

ایک مزدور لیڈر مارا گیا۔ مزدوروں کی تنظیموں اور دیگر سرگرم گروہوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ بائیں بازو کی تنظیموں میں نفاق پیدا ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس سانحہ پر کیا پوزیشن لی جائے؟ اس قتل کے پیچھے سیاسی سازشوں کو بے نقاب کیا جائے؟ مزدوروں کا ساتھ دیا جائے؟ یا اس طبقے کی معاشی محرومیوں کا ذمہ دار اس نظام کو ٹھہرایا جائے جس کی بدولت معاشرے میں اقتصادی عدم مساوات پیدا ہوئی؟

''فیصلہ کرنا تھا۔''

''غیر شادی شدہ لڑکیوں نے خود مختارانہ فیصلہ کیا جب کہ بیویوں نے اپنے شوہروں کی حمایت کی۔''

''ان کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی ان کی اپنی کوئی منفرد حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھیں۔''

مشرقی پاکستان (سابقہ) کے سیاسی حالات دن بدن ابتر ہو رہے تھے۔ وہ منظر بھی دیکھا۔ آپ (مغربی پاکستان کا کوئی بھی شہری) وہاں جاتے، لوگوں کی ایک لمبی قطار آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوتی۔ چہروں پر مفلسی کے نشان، پیٹ میں بھوک، بدحالی میں سوکھی ہوئی ٹانگیں، نظروں میں اپنے ملک کے خوش حال بازو سے آنے والوں پر رشک۔ احتجاج کے جذبات چھپائے ہوئے۔ سامنے سے وہ لاغر بوڑھا بھی گزر رہا تھا جس کے جسم پر ایک میلی سے لنگوٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پاؤں بھی ننگے تھے اور وہ ایک رکشا کھینچ رہا تھا جس میں ایک موٹا مرد بیٹھا تھا۔

مولانا بھاشانی ٹوبہ ٹیک سنگھ آ رہے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو وہ ریلی کبھی نہیں

بھولی جب وہاں مشرقی پاکستان کا یہ سوشلسٹ لیڈر آیا تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے۔

یہ لیڈر اپنے ہی ملک کے اس بازو سے آیا تھا جہاں لوگ کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی چیزوں اور اچھے اچھے کپڑوں کی دکانوں کو محض دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن وہ انہیں خریدنے کے قابل نہیں۔

ماؤزے تنگ نے زندہ رہنے کا ایک فلسفہ دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نئی نسل کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس کی کرشمہ ساز شخصیت نے نوجوانوں کو مستقبل کی ایک آس دی تھی۔

لاہور کی نہر کے کنارے واقع ''ساہی'' کے دفتر میں ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے فریحہ ظفر نے اپنی زندگی کے بہت سے پرانے ورق سامنے رکھ دیئے۔

''ساہی'' سوسائٹی فار ایڈوانس منٹ آف ہائر ایجوکیشن کا مخفف ہے۔ ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے سرگرم ایک غیر سرکاری تنظیم۔

فریحہ جغرافیہ میں ایم اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے لندن گئیں۔ اس سے قبل پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اپنے ملک کے سیاسی حالات اور معاشرتی مسائل سے آگاہی ہوئی تو سامنے دو راستے تھے جو واضح طور پر جدا تھے۔ نظریاتی اختلاف تھا۔ دو گروپ تھے۔ دایاں بازو اور بایاں بازو۔

''دائیں بازو کے لوگوں کا ساتھ دینا ناممکن تھا۔ یہ میرا فطری رجحان تھا۔ پھر ہم نے پہلی ٹریڈ یونین بنائی۔ ایک بسکٹ فیکٹری اور دوائیں بنانے والی کمپنی میں مزدوروں کی اجرتوں اور اوقات کار کے مسائل تھے۔ وہ عورتوں کو ملازمتیں دینے سے انکار کرتے تھے لیکن ٹریڈ یونین بن جانے کے بعد صورت حال میں نمایاں طور پر بہتری نظر آئی۔ اسی طرح ہم نے گھریلو ملازماؤں کی ایسوسی ایشن بنائی تاکہ انہیں ہفتہ وار چھٹی دی جائے۔ بھٹو کا دور آیا۔ اس سے پہلے پاکستانی عورت کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ ہم نے ملک بھر میں دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر مہم چلائی اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

فریحہ اپنے والدین کے بہت سارے بچوں کے بعد آخری بیٹی تھیں جس پر نانی نے کہا تھا ''اس کو پیدا ہونے کی کیا ضرورت تھی'' ماں نے البتہ اپنی نوعمری کے زمانے میں خواتین کی تنظیموں کے ساتھ کام کیا لیکن کبھی ملازمت نہیں کی، کیونکہ ان کا بڑا کام بچے پیدا کرنا اور ان کی دیکھ بھال تھی۔

MashalBooks.org

فریحہ بڑی ہوئی تو ماں کو شکایت تھی کہ یہ مجھ سے کسی بات کی اجازت نہیں لیتی۔ اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔ ''کیونکہ میں کہتی تھی ماں! میں یہ کرنا چاہتی ہوں۔ یہ نہیں کہتی تھی کہ کیا میں یہ کرلوں؟''

لندن میں تعلیم کے دوران ایسے لوگوں اور ایسے گروپ کے ساتھ ملاقات ہوئی جو عورت کے حقوق ، عورت کے مسائل پر بات کرتے تھے۔ ایک شعور جاگا۔ آخر ہم ان امور پر توجہ کیوں نہیں دیتے۔

بے شک اس وقت تک ویف وجود میں آ چکی تھی لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ ویف عورتوں کے مسائل کے حوالے سے زیادہ موثر سیاسی کردار ادا کرے۔ 1982ء میں جب ''ساہی'' کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ملک میں ناخواندگی کے خلاف جدوجہد کرنا تھا، لیکن ضیاء کے مارشل لا کے دوران بہت زیادہ گھٹن تھی۔ اس وقت عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ سر پر دوپٹہ لیں اس لئے کسی بھی نوعیت کا ترقی پسند کام کرنا مشکل تھا۔

''سنہ 86-85ء میں برکلے یونیورسٹی کیلی فورنیا میں پوسٹ ڈاکٹرل اسکالر کی حیثیت سے پڑھ رہی تھی اس دوران مجھے ''عورت اور ترقی'' پر مقالہ پڑھنے کی پیش کش ہوئی۔ یہ ایک اچھا موقع تھا کہ میں دنیا کے سامنے پاکستانی عورت کی گھٹی ہوئی زندگی کے بارے میں کہہ سکوں۔''

مسلسل سرگرم عمل رہنا فریحہ کا شعار ہے، ان کا طرز زندگی ہے۔ زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا لمحہ آیا ہو گا جب وقت ان کے قریب سے دبے پاؤں نکل گیا۔ ملک میں جمہوریت بحال ہوئی۔ کچھ راہیں کھلیں، کچھ زنجیریں ٹوٹیں تو فریحہ کو موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ ''ساہی'' اور پی ٹی وی کے تعاون سے ٹیلی ویژن پر تعلیمی پروگرام پیش کرسکیں۔ ''گریں گی دیواریں۔'' اس کے علاوہ کچھ تھیٹر گروپس کے ساتھ بھی سرگرم عمل رہیں۔

فریحہ ظفر 69ء سے 95ء تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے ساتھ منسلک رہیں۔ 95ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی خواہش تھی کہ ویمنز اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ قائم کیا جائے لیکن رجعت پسند عناصر آڑے آئے اور وہ ایسا نہ کرسکیں۔

فریحہ کو علاقائی پلاننگ اور ترقی، عورتیں اور ترقی، تعلیم، آبادی کی تعلیم کے شعبے میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ وہ اندرون ملک اور بہت سے بیرونی ممالک میں

یونیورسٹیوں اور کانفرنسوں میں پاکستان میں عورت کے مقام اور دیگر متعلقہ امور پر مقالات پڑھ چکی ہیں۔ وہ نیپا لاہور اور اکیڈمی فار ایڈمنسٹریٹو ٹریننگ لاہور کی جز وقتی لیکچرر رہیں ہیں۔ پکسی (عرف) شادی شدہ ہیں۔

MashalBooks.org

# خاور ممتاز

''یہ ہمارے ملکی نظام کی خاصیت ہے کہ کوئی قانون ایک دفعہ بن جاتا ہے تو وہ شاذ و نادر ہی تبدیل ہو پاتا ہے۔ البتہ حکومت کی طرف سے آئندہ بنائے جانے والے کسی ایسے قانون پر، جو مفاد عامہ کے منافی ہو، پہلے سے شور مچایا جائے اور حکومتی حلقوں پر دباؤ ڈالا جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ مثبت اثر ضرور ہوتا ہے۔''

''مثلاً'' خاور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''صائمہ وحید کا کیس تھا۔ بے شک فیصلہ تو عدالت کو ہی کرنا تھا۔ اس ضمن میں بنیاد پرست اور رجعت پسند عناصر کی جانب سے شدید دباؤ تھا لیکن جب عورتوں کی تنظیموں نے مل کر آواز اٹھائی تو یہ بات عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آ گئی کہ اب عورتوں کے بارے میں کسی بھی سطح پر من مانی ممکن نہیں ہے۔ عورتوں کی تحریک کے نتیجے میں معاشرے میں تبدیلی آئی ہے۔ شعور میں اضافہ ہوا۔ ایک بڑی بات تو یہ ہے کہ اب پالیسی دستاویزات میں عورتوں کے حوالے سے مختلف امور پر توجہ دی جانے لگی ہے۔

خاور ممتاز کا تعلق رام پور کے ایک ایسے گھرانے سے ہے جس کے افراد نے ترقی پسند ادب میں بہت شہرت پائی یعنی عصمت چغتائی یا پھر عظیم بیگ چغتائی۔ خاور کو اس کا اقرار ہے کہ ان کی ذہنی تربیت کی ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ عصمت اپنے گھر پر راج کرتی تھیں۔ وہ پدر شاہی کے معاشرے میں عورت کی بالادستی کی ایک ایسی مثال تھیں جنھوں نے مستقبل کی لڑکیوں کو سر اٹھا کر زندگی کا ڈھب دیا۔

خاور سینٹ جوزف کالج کراچی سے بی اے کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی گئیں تو ان دنوں ایوب کی آمریت کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ طلبا میں بہت جوش و

خروش پایا جاتا تھا۔ ملکی سیاست سے خاور کا یہ پہلا تعارف تھا۔ لیکن یہی وہ دور تھا جب تنگ نظر مذہبی جماعت کی پیروکار سٹوڈنٹس یونین کی جانب سے یہ اعلان عام کیا گیا تھا کہ لڑکے لڑکیاں مل کر سیڑھیوں پر نہ بیٹھیں۔ ایسی لغویات کی خلاف ورزی خاور کا فطری رجحان تھا۔

انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی کے مرکز برائے جنوب ایشیائی تحقیق سے کیا۔

خاور کو شکایت ہے کہ ضیا آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے والی تنظیم ''ویف'' کی کارکردگی کمزور ہوگئی ہے۔ اس کا سیاسی کردار پہلے کی طرح پر اثر نہیں رہا۔

خاور کو یاد ہے:

''میں ان دنوں یونیورسٹی کی ملازم تھی۔ ہم نے ویف کو اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے۔ نہ اپنی فکر ہوتی تھی نہ گھر بار کی۔ یونیورسٹی کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ میں یا تو اپنی سیاسی سرگرمیاں ترک کر دوں یا ملازمت۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی۔''

انہی دنوں مظہر علی خان کا ہفتہ وار رسالہ ''ویو پوائنٹ'' نکلا تھا۔ خاور نے وہاں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر ملازمت کی۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ آنے جانے میں ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ لیکن خاور کو اپنے یہ دو سال بہت بار آور معلوم ہوتے ہیں۔ اس دوران بہت سے روشن خیال اور ترقی پسند اخبار نویسوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک خوش نصیبی تھی۔

خاور گزشتہ کئی برس سے شرکت گاہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ پاکستان میں سرگرم عمل این جی اوز کے بارے میں ان کا مطمح نظر واضح ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی باقاعدہ تنظیم یا ادارے کے تحت مختلف منصوبوں پر کام کرنا، عورتوں کے حوالے سے مختلف مسائل اور موضوعات پر تحقیق کے بعد دستاویزات کو پالیسی سازی کے لئے حکومتی سطح تک لے جانا، عام عورتوں سے رابطہ اور ان میں خود مدد کی تحریک پیدا کرنا ایکٹو ازم کی ہی ایک صورت ہے۔ اس طرح ہم متعلقہ امور پر کل وقتی کام کر سکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ ملازم کہیں اور ہوں اور تھوڑا وقت اور توجہ اس طرف دیں۔ اس صورت میں بھرپور طریقے سے سنجیدہ معاملات پر ضروری اقدام کرنا بہت مشکل ہے۔

خاور ممتاز شرکت گاہ ویمنز ریسورس سینٹر لاہور کی کوآرڈینیٹر ہیں۔ گزشتہ برسوں

کے دوران انہوں نے قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور ورکشاپس میں مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ ''ویمن ان پاکستان'' کے عنوان سے ایک کتاب، جس کی وہ شریک مصنف ہیں، پاکستانی خواتین کے حقوق کی جدوجہد کی ایک مستند دستاویز ہے۔ نیز وہ ''پاکستان.......... روایت اور تغیر'' کی بھی شریک مصنف ہیں۔ انہوں نے ''جنوبی ایشیا کے اندرونی تنازعات'' پر مختلف افراد کے مقالات کی تالیف کی جس میں شامل اپنے مقالے ''سندھ میں لسانی تنازعات'' میں انہوں نے شہری اور دیہی سندھ کا تاریخی پس منظر، سیاسی صورت حال اور سندھی مہاجر کے اختلافات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

خاور کا کہنا ہے کہ پاکستانی خواتین کی جدوجہد کے اثرات کچھ نہ کچھ ظاہر ہونے لگے ہیں۔ عام لوگوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا شعور پیدا ہوا ہے۔ دیہی عورتیں گھریلو تشدد کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ عورت کی کمائی کو ہتک خیال کیا جاتا تھا۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ بے شک اس کی اقتصادی وجوہات بھی ہیں لیکن اس میں ملک بھر میں پھیلی ہوئی عورتوں کی تنظیموں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے عورت کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ مظلوم بن کر رہنے کے بجائے ظلم کے خلاف آواز اٹھائے۔

سندھ میں لسانی فساد کے بارے میں لکھتے ہوئے خاور نے لکھا کہ ''پہلی بار ایسا ہوا کہ عورتیں ایم کیو ایم اور سندھیانی تحریک میں بڑی تعداد میں شامل ہوئیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان تحریکوں میں عورت کا سیاسی کردار ثانوی تھا۔''

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتوں میں سیاسی شعور بہت کم ہے۔ اس مقصد کے لئے باقاعدہ مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ عورتیں سیاسی بوجھ حاصل کرنے کے بعد ملکی معاملات اور سیاستدانوں کے کردار کو سمجھ سکیں۔ لیکن رانی (عرف) کا یہ بھی کہنا ہے کہ معاشرتی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی کے لئے صرف عورتوں کی سیاست گری کافی نہیں۔ اس کی خاطر ایک یونائیٹڈ فرنٹ بنانا ہوگا جس میں ملک کے تمام مظلوم طبقے شامل ہوں۔ ان میں ٹریڈ یونینز ہوں، مزدور ہوں، ہاری ہوں۔

# فریدہ شیر

ہمارے ہاں آئے دن آئینی ترمیمیں کی جاتی ہیں لیکن آج تک انیسویں صدی میں بنایا جانے والا انگریز کے زمانے کا وہ قانون تبدیل نہیں کیا گیا کہ اگر ایک شخص کسی عورت، بچے یا دوسرے مرد کو پاگل ٹھہرا کر پاگل خانے چھوڑ آتا ہے تو اسے کوئی اور وہاں سے نہیں نکال سکتا، جب تک کہ وہی شخص خود لینے نہ آئے۔

فریدہ شیر کو کئی برس پہلے کی بات یاد آئی ''ہم لوگ سوشل ورکر کی حیثیت سے وہاں جاتے تھے۔ پاگلوں سے بات چیت کرتے۔ ہمارا مقصد ایک مطالعہ بھی تھا۔ اس دوران جن عورتوں سے بات ہوئی تو یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ وہ عورتیں دراصل پاگل نہیں تھیں۔ انہیں زبردستی وہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں اونچے درمیانے اور نچلے سب طبقوں کی عورتیں شامل تھیں۔ اونچے طبقے کی عورتیں زیادہ تر جائیداد کی خاطر وہاں پھینکی گئی تھیں تاکہ وہ اپنی وراثت حاصل نہ کر سکیں جبکہ دیگر عورتوں کو اس لئے پاگل ٹھہرایا گیا تھا کہ شوہر دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے پہلی بیوی کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔ وہ تمام عورتیں پاگل نہیں تھیں۔ بس ڈیپریشن کا شکار تھیں۔ لیکن پاگل خانے کی بدحالی، ناقص غذا، جنسی زیادتی انہیں پاگل کرنے کے لئے کافی تھی۔

فریدہ کی والدہ کا تعلق ہندوستان کے معزز ہندو بنگالی گھرانے سے ہے۔ شادی کے بعد وہ مذہب تبدیل کر کے اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان میں رہنے لگیں۔ فریدہ نے ابتدائی برسوں میں اپنی والدہ سے جو تربیت لی وہ یہ تھی کہ اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرو۔ دوسروں کے کام آؤ۔ اپنا کام خود کرو۔

MashalBooks.org

''ورکشاپس کے موقع پر جب شرکا اپنا تعارف کرواتے ہیں تو میں بڑی ہمت سے اور واضح الفاظ میں کہتی ہوں کہ میں طلاق شدہ ہوں۔ میں نے خود طلاق لی ہے۔ اس طرح میں بہت سی طلاق یافتہ عورتوں کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کرتی ہوں۔ میری بات کوئی نہیں سمجھتا تھا، یہاں تک کہ میرے قریبی دوست میرے بات سننے کے بجائے اپنی منطق جھاڑتے تھے۔ میں بظاہر ایک خوش حال عائلی زندگی گزار رہی تھی لیکن چند وجوہات ایسی تھیں کہ جذباتی طور پر میں ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ میرے لئے طلاق ناگزیر تھی۔ تو میں جب سب کے سامنے یہ بات بتاتی ہوں تو وہ عورتیں جو اپنی ازدواجی زندگی سے بے حد ناخوش ہونے کے باوجود طلاق نہیں لیتیں، ان میں ہمت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اکیلے جینے کا ڈھنگ سیکھا ہے۔ اپنے بچے کی پرورش خود کی ہے۔

فریدہ شیر نے سوشل ورک میں ایم اے کرنے کے بعد پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شادی ہوئی، بچہ پیدا ہوا۔ دو سال تک کچھ نہیں کیا۔ انہیں یہ آرام بہت پریشان کر رہا تھا۔ اس دوران اسلام آباد یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کی جانب سے ''غربت'' پر تحقیقی مطالعے کے منصوبے پر کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ اس دوران ذہنی نشوونما، غربت کو قریب سے دیکھا۔ ڈیڑھ سال تک پنجاب اور صوبہ سرحد کے دیہاتوں میں عام لوگوں سے رابطہ ہوا۔

اس سے پہلے ہم عام لوگوں کے صرف مسائل کو دیکھتے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ان کو صحت دے دو، ہنر دے دو، حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ اصل مسائل اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب رویوں میں تبدیلی آئے، سوچ میں تبدیلی آئے۔ عورتوں کو سلائی کی مشین دینے سے ان کا معاشرتی رتبہ نہیں بڑھ سکتا۔ یہ ایک طویل المدت کام ہے، کیونکہ عام لوگوں کے رویوں کی تبدیلی رات بھر میں ممکن نہیں اس کے لئے آئندہ پچاس سال بھی کم ہوں گے۔ ہمارے مسائل کی جڑیں معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالات میں ہیں۔ ہم جو سماجی فلاح و بہبود کے منصوبے چلاتے ہیں یہ محض مرہم پٹی ہے۔

فریدہ نے گزشتہ دو عشروں کے دوران بہت سے غیر ملکی مالیاتی اداروں کے تحت چلائے جانے والے منصوبوں پر کام کیا۔ ان کی حیثیت اب ایک ایکسپرٹ اور ٹرینر کی ہے۔ وہ عورت کے متعلقہ امور، عورت اور صحت، عورت اور میڈیا، عورتوں کے خلاف تشدد وغیرہ کے موضوعات پر نیپا لاہور میں لیکچر بھی دیتی ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں سماجی تبدیلی لانے کی غرض سے عالمی مالیاتی اداروں کی سرگرمیوں کے بارے میں فریدہ کا کہنا ہے کہ یہ درست ہے کہ ان اداروں یا ڈونرز کا کسی منصوبے کے پس پردہ کوئی نہ کوئی ایجنڈا ہوتا ہے لیکن اس رقم سے غریب عوام کی بھلائی ہو جائے، ان میں بیداری اور شعور پیدا ہو جائے تو یہ بھی ایک بڑا کام ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک کے مخیّر حضرات اپنی ڈرگ منی سے صرف ثواب کماتے ہیں۔ وہ معذوروں، اندھوں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ کسی طور ملک میں سماجی تبدیلی لانے کے لئے رقم خرچ نہیں کریں گے۔ وہ اس سے خوفزدہ ہیں۔ سماجی تبدیلی لانے کے لئے مالی امداد دینا ان کے لئے اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کی مانند ہے۔

خواتین محاذِ عمل (WAA) پر بنیاد پرستوں اور مارشل لا کے حکمرانوں نے یہ الزام لگایا تھا کہ یہ تحریک چند گمراہ شہریوں اور اونچے طبقے کی عورتوں تک محدود ہے۔ فریدہ شیر نے ''سیمرغ'' اور ایک اور تنظیم کے ساتھ مل کر ''جلوس'' اور ''مائی جنت'' کے نام سے دو مختصر دستاویزی فلمیں بنائیں۔ ان کا مقصد عوام تک یہ پیغام پہنچانا تھا کہ عورتوں کی اس سرگرم عمل تحریک کے بنیادی مقاصد کیا ہیں۔ اس کی طاقت دراصل نچلے طبقے میں ہے۔ یہ کسی کے خلاف نہیں بلکہ عوام کی بھلائی کی خاطر عمل میں لائی گئی ہے۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب فریدہ ویف کی سرگرمیوں میں مشغول ہوئیں تو فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن نے ان کی ملازمت پر یہ شرط لگا دی کہ آپ جلسے جلوسوں میں نہیں جائیں گی۔ فریدہ کے لئے ملازمت بہت ضروری تھی کیونکہ وہی روزی کا وسیلہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے آجروں کی شرط ماننے سے انکار کر دیا اور ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔

فریدہ کو فخر ہے کہ انہوں نے پچھلے تمام برسوں میں مختلف اداروں کے تحت کئی منصوبوں پر کام کے دوران بلوچستان اور سرحد کے پسماندہ قبائلی علاقوں کی عورتوں تک رسائی حاصل کی اور ان کی بہتری کے لئے اقدامات کئے۔ وہ گزشتہ دس بارہ برس سے علیل ہیں۔ وہ اب عملی کاموں کے لئے زیادہ وقت دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی طور خود کو مصروف رکھتی ہیں۔ پھر ان کی سب سے بڑی ''انوسٹمنٹ'' وہ لوگ ہیں جنہیں انہوں نے فلاحی کاموں کی تربیت دی اور وہ خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

لیکن فریدہ کا کہنا ہے ''کاش ہم اس سے زیادہ کام کر سکتے۔ اس سے زیادہ تعداد میں عام لوگوں کو متحرک کر سکتے۔''

فریدہ اپنی نئی نسل کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں ''ہمارے نوجوان بہت تذبذب کے عالم میں ہیں۔ ان کی قدریں، مادہ پرستی اور سطحیت پسندی ہے۔ ہم نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔

MashalBooks.org

# روبینہ سہگل

''پیسہ بہت تھا۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش میسر تھی۔ مگر وہ گھر محبت سے خالی تھا۔ بہت ٹھنڈا گھر تھا۔'' روبینہ کہتی ہیں۔

☆۔ پاکستانی کلچر میں خاندان کی خیر خواہی، خاندان کی محبت کے تصورات بہت مضبوط ہیں۔ خاندان اس بے رحم دنیا میں امن اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔ عورتیں ان سب کو محفوظ رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس ذہنی تناؤ کے باوجود جو تحفظ کے افسانوں اور تشدد کی حقیقت کے تضاد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے'' روبینہ نے اپنے مضمون ''خاندان اور عورتوں کی تحریکیں'' میں لکھا۔

''شعور سنبھالا تو نجی سطح پر بے انصافی اور شدید تشدد دیکھا۔ بے انصافی، جبر، مرد کی بالادستی، عورت کی بے بسی، یہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں بھائیوں سے زیادہ قابل تھی، ذہین تھی۔ لیکن گھر میں کوئی حیثیت نہیں تھی، کوئی اہمیت نہیں تھی۔

☆۔ گھریلو علمی نظام ہر لحاظ سے عورتوں اور مردوں کی تقسیم کرتا ہے۔ اس تقسیم میں مرد کو فوقیت اور اعلیٰ حیثیت حاصل ہوتی ہے جبکہ عورت کا رتبہ کمتر اور ادنیٰ ہوتا ہے۔ اس تقسیم سے بیشتر متضاد صفات کو جوڑا جاتا ہے۔ مرد کو عقل سے اور عورت کو جذبات سے منسوب کیا جاتا ہے۔

☆۔ ''میں اپنے گھر سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خودمختار زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرلوں، اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاروں، اپنے فیصلے خود کروں۔ یہ ایک طرح کی بغاوت تھی۔''

---

نوٹ: ستارے کے نشان کی عبارتیں روبینہ کی تحریروں کے اقتباسات ہیں۔

MashalBooks.org

☆۔عورتیں ہر تہذیب اور ثقافت میں روایت اور شناخت کی علامت بنتی ہیں۔
تمام معاشرے، جو ہر لحاظ سے جدید، روشن خیال یا ترقی پسند بنتے ہیں عورتوں کے معاملے میں اپنے رویے روایتی رکھتے ہیں۔ ہمارے بڑے مفکروں سرسید احمد خان اور علامہ اقبال جہاں جدیدیت اور روشن خیال قدروں کے قائل تھے وہاں عورتوں کے معاملے میں ان کے رویے اور خیالات انتہائی قدامت پسند اور فرسودہ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ پدر شاہی نظام ہے۔ یہ نظام نہایت قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہ نظام ختم نہیں ہوا۔ البتہ اس نے اپنی شکل اور اپنا انداز بدل لیا ہے۔

''میں پڑھنے کے لئے باہر گئی، لیکن وہاں بھی عورت کی صورت حال ہم سے مختلف نہیں تھی۔ عورت وہاں بھی مرد کی ماتحت ہے۔ فرمانبردار ہے۔ ان پر بھی گھریلو تشدد ہوتا ہے۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ میں نے اس ترقی یافتہ معاشرے سے ہزاروں میل دور ایک پسماندہ ملک میں آنکھ کھولی تھی۔ مرد کی حاکمیت دیکھی تھی۔ ہمارے معاشرے میں تو عورت کی تربیت کا اہم ترین وسیلہ ''بہشتی زیور'' رہا ہے۔!!

☆۔نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کے خلاف جو دوسرا ردعمل ہوا اس کے بڑے علمبردار اشرف علی تھانوی ہیں جنہوں نے ''بہشتی زیور'' میں مسلمان عورت کی ایک خاص شناخت بتائی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بیٹیوں کی نصیحت کے لئے فسانہ مبتلا، مرأت العروس یا بنات النعش ............ مولانا تھانوی عورت کو محض ایک بیوی پیش کرتے ہیں اور اس کی اپنی علیحدہ شخصیت اور انفرادیت ختم کر دیتے ہیں۔

روبینہ سہگل نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا۔ کنیئرڈ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد کولمبیا یونیورسٹی سے ڈیولپمنٹیل سائیکولوجی میں ایم۔اے کیا جبکہ روچیسٹر یونیورسٹی سے سوشیالوجی آف ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کیا۔

روبینہ بچپن میں جب گھریلو تشدد پر احتجاج کرتیں تو ایک بار والد نے ماں سے کہا ''اسے گھر سے نکال دو۔ ویکھاں گا کتھے جاندی اے''۔ (دیکھوں گا کہاں جاتی ہے) روبینہ نے اپنی راہیں خود تلاش کیں۔ باپ سے کچھ نہیں مانگا لیکن ایک بڑے صنعت کار کی بیٹی کے پاس تحفے میں ملے ہوئے جو ہیرے جواہرات تھے، انہیں فروخت کر کے اپنا گھر بنا لیا۔
روبینہ ویف کی بنیادی رکن ہیں۔ کہتی ہیں ''ویف بنی تھی تو اس میں جانا ہی تھا۔

وہ ایک تحریک تھی عورتوں کے حقوق کے لئے عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے خلاف بہت جلسے کئے، جلوس نکالے، نعرے لگائے، جیل بھی گئی لیکن یہ تمام ایکٹوزم سطحی ہے۔ اس کا احساس مجھے بہت عرصہ پہلے سے ہوگیا تھا۔ اب میں پوری طرح قائل ہوں کہ یہ سب بہت بے سوچی سمجھی تحریک ہے۔ ہمارا مقصد واضح نہیں ہے۔ ہم انسانی حقوق کی بہت بات کرتے ہیں۔ یہ محض ایک فیشن بن گیا ہے۔ سامراجیت ہمیں کئی بہانوں سے زیر کرتی ہے۔ ہم پر اپنے ایجنڈے مسلط کرتی ہے۔ کہاں گئے ہمارے روشن خیال اور ترقی پسند لوگ۔ سامراجیت کے خلاف ملا ہی کیوں بول رہا ہے۔ یہ لوگ سب خاموش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب مختلف تنظیموں اور اداروں کے ذریعے انہی کی سوچ کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہم اس کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ ہم جو خود کو انسانی حقوق کا علمبردار، ترقی پسند خیال کرتے ہیں، ہم بڑی قوتوں کے اقتدار کے کھیل میں آلہ کار بن گئے ہیں۔''

☆۔ انسانی حقوق دراصل واشنگٹن کی طاقت کے دلالوں کی بدولت ایک بڑی بین الاقوامی صنعت کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ان کے اپنے ماہرین، معلوماتی بنیاد، تصورات، تنظیمیں اور تربیت یافتہ عملہ ہے۔ اب کے وہ براہ راست نو آبادیاتی تسلط کے بجائے ''مقامی لوگوں کو تہذیب یافتہ بنانے'' کے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے ذریعے عمل پیرا ہیں۔

☆۔ یہ جو آزاد حیثیت کا ڈھونگ ہے، یہ سب منافقت ہے۔ یہ بڑی طاقتیں دراصل بین الاقوامی غنڈے ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر میں عالمی معاشی نظام مسلط کیا ہے۔ یہ لوگ ایک طرف امن کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف چھوٹے ملکوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم سے قرضہ لے کر ہتھیار خریدیں۔ ان کی معیشت کا بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی میں صرف ہو جاتا ہے اور عوام جوں کے توں بدحال رہتے ہیں۔

''ہمارے ملکوں میں بنیاد پرستی کا فروغ سامراجیت کی ہی ایک کڑی ہے۔ اس کی پیداوار ہے۔

☆۔ اقوام متحدہ نے 1994ء کو خاندان کا سال قرار دیا۔ یہ امریکی بنیاد پرستی کی ایک صورت ہے۔ 1980ء کے عشرے میں ریگن اور بش کے ذریعے نئے دائیں بازو کی طاقتوں کا الحاق ہوا تھا۔ خاندان کا سال دراصل امریکہ کی ایک اور نظریاتی جنگ ہے۔

امریکہ اقوام متحدہ کے ذریعے اپنی نئی مذہبی اور قدامت پسند سوچ کو دنیا بھر میں برآمد کرنا چاہتا تھا جس کی بنیاد صرف اور صرف پدرشاہی کو بحال کرنا ہے۔

روبینہ سہگل نے کہا تھا ''میرا ایکٹوازم میری عملی زندگی سے آیا ہے۔''

روبی (عرف) کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات اور جرائد میں مستقلاً مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ روٹی کمانے کے لئے ملازمت کرنا مجبوری ہے۔ اس لئے کچھ کتابیں جو ان کے ذہن میں ہیں ان پر کام شروع نہیں ہو سکا۔

MashalBooks.org

# فرزانہ باری

ماں نے کہا ''وہ مجرم ہے۔تمہاری شادی اس کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔تم منگنی توڑ دو۔''

''نہیں ماں وہ مجرم نہیں ہے۔ سیاسی کارکن ہے۔ ایک مقصد کے لئے لڑ رہا ہے۔''

''وہ دوسری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔تمہاری اس سے شادی نہیں ہوسکتی۔''

ذات برداری کا فرق، انسانوں کے درجے گھٹانے بڑھانے کے فرسودہ طریقے ہیں۔ ذہن میں اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا خیال آیا۔ضد کی۔'' کچھ بھی ہو جائے، میں اسی سے شادی کروں گی۔'' فرزانہ باری کا غیر متزلزل ارادہ۔گھر والے اس لئے بھی پریشان ہوتے کہ یونیورسٹی میں طلبا کے ایک سرکش گروہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر پولیس گھر پر پہنچ جاتی تھی۔

راولپنڈی کے محلوں میں شعور سنبھالا۔ سکول اور کالج کے نصاب کی کتابیں پڑھیں، امتحان پاس کرنے کے لئے۔ زندگی مخصوص ضوابط کے تحت گزر رہی تھی۔ ماں باپ نے جو دنیا بتائی تھی بس اسی سے آشنائی تھی۔ایسی دنیا جو تھوڑے سے فاصلے کے بعد ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے چاروں طرف روایتوں اور عقیدوں کی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ زندگی کے اوائل کی تربیت یہی تھی۔ کالج میں یونین کی سرگرمیوں اور الیکشن وغیرہ میں حصہ لینے سے کتراتی تھیں۔ جیسے وہ سب غلط تھا، بے کار تھا۔ جیسے اچھی لڑکیاں یہ سب نہیں کرتیں۔ وہ کلاس میں دھیان سے پڑھتی ہیں۔ ہوم ورک کرتی ہیں۔ امتحان کے لئے محنت کرتی ہیں۔ پاس ہو جاتی ہیں۔گھر والے بہت خوش ہوتے ہیں۔

اگست 1996ء میں فرزانہ باری کا اخبار میں ایک مضمون شائع ہوا۔''جب لوگ بلدیاتی اداروں کے معاملات میں ملوث ہوتے ہیں تو اس عمل میں ان کا سیاسی شعور بڑھتا

ہے۔ حکومت میں شریک ہو کر انہیں احساس ذمہ داری ہوتا ہے اور وہ اپنے منتخب نمائندوں کی کارکردگی پر نظر رکھتے ہیں جس سے احتساب بہتر اور بدعنوانی کم ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

''تہذیب کا ارتقاء'' سبط حسن کی ایک تصنیف...... زندگی نے ''موسیٰ سے مارکس تک'' شعور کی کتنی ارتقائی منزلیں طے کیں؟ فرزانہ کو اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب یونیورسٹی میں ایک کلاس فیلو سے ملاقات ہوئی۔ وہ این ایس او (طلبا کی تنظیم) کا رکن تھا۔ اس سے گفتگو ہوتی، باہمی تبادلہ خیال ہوتا۔ یہ مارشل لا کا دور تھا۔ اس نے کچھ کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ ممتاز مارکسی دانشور سبط حسن کی تصانیف پڑھنے کے بعد ذہن کے پرت ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔ ان دنوں سرگرم عمل طلبا جمہوریت کی بحالی کے لئے مواد تقسیم کرتے تھے۔ فرزانہ کو راولپنڈی کی وہ مشہور رات یاد ہے جب کچھ سٹوڈنٹس لیڈرز دکانوں کے بند دروازوں کے نیچے سے پمفلٹس پھینکتے ہوئے گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کا سرغنہ انڈر گراؤنڈ چلا گیا تھا اور پھر وہ جلا وطن ہو کر لندن فرار ہو گیا لیکن یہ اپنے مقاصد سے فرار نہ تھا۔ فرزانہ کی زندگی کا انقلاب تھا۔ کچھ عرصہ بعد فرزانہ کا اس مفرور شخص سے فون پر نکاح ہوا اور وہ اس کے کاموں میں شریک ہونے کے لئے اس سے جاملیں۔

فرزانہ کے گھر کے نیچے ایک بورڈ لگا تھا ''پتن''۔ یہ وہ تنظیم ہے جو گزشتہ سیلابوں کے دوران متاثرہ افراد کی آبادکاری کے لئے عمل میں آئی تھی۔ فرزانہ کے رفیق حیات اس کے سربراہ ہیں۔ جبکہ وہ ملتان، سرگودھا، جلال پور کے علاقے میں ترقیاتی کاموں کے اس ادارے کے بانی رکن ہیں۔

فرزانہ باری راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ بی اے، سی بی کالج راولپنڈی سے اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے تاریخ میں ایم۔اے کیا۔

''برطانیہ میں خاندان کے اندر پاکستانی عورتوں کے مقام پر ملازمت کے اثرات'' یہ غالباً اپنی نوعیت کی پہلی تحقیق تھی، کیونکہ برطانیہ میں عام طور پر جو پاکستانی آباد ہیں ان کی عورتوں کو باہر کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی باور کرایا جاتا ہے کہ عورت گھر میں بیٹھ کر ہی عزت دار ہوتی ہے۔ بہرحال فرزانہ نے اس دلچسپ موضوع پر تحقیق کے بعد سسیکس یونیورسٹی برائیٹن (برطانیہ) سے ڈاکٹریٹ کیا۔ اس کے بعد رائل ٹراپیکل انسٹی

ٹیوٹ، ہالینڈ سے ''جینڈر اینڈ ڈیویلپمنٹ'' کا ایک کورس بھی کیا۔

برطانیہ میں قیام (جو سات آٹھ سال پر مشتمل تھا) کے دوران تعلیم اور تحقیق کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ پاکستان کے بہت سے سیاسی لیڈر وقتاً فوقتاً لندن جاتے رہتے تھے۔ ان سے رابطہ رہتا اور کئی محاذوں پر کام ہوتا رہا۔ اس دوران یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ملک کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے عام عورت سے رابطہ ضروری ہے۔ یہ اس وقت ہی ممکن ہو سکا جب ملک میں جمہوریت بحال ہوئی اور عورتوں کی تنظیمیں سرگرم ہوئیں تو یہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوگئیں لیکن ملک کے دیگر عورتوں کی طرح فرزانہ باری کو بھی شکایت ہے کہ پاکستانی عورت کو سیاست میں خاطر خواہ نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ فرزانہ نے حالیہ انتخابات سے پہلے کے عبوری دور میں ''سیاست میں عورتوں کی آوازیں'' کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ

''یہ توقع کی جاتی ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں عورتوں کے لئے خاطر خواہ جگہ نکالیں گی تاکہ وہ اپنے مسائل کے بارے میں آواز اٹھا سکیں۔ عورتوں کو اپنی سیاسی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ جواب سے پہلے تاریخی، سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کی بنا پر انہیں حاصل نہیں تھا۔''

لیکن انہیں اس کا احساس بھی ہے کہ سیاست میں بڑھتی ہوئی کمرشلائزیشن سے عورتوں کا پارٹی سیاست میں حصہ لینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ سیاسی پارٹیوں میں مردوں کی بالادستی کی وجہ سے عورتوں کو فعال کردار ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ سیاسی پارٹیوں کی کارکن عورتیں عموماً نچلے درجے کے کام کرتی ہیں اور انہیں فیصلہ سازی میں شامل نہیں کیا جاتا۔

فرزانہ باری 1993ء سے قائداعظم یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور وہ ویمنز اسٹڈیز سینٹر کی ڈائریکٹر ہیں۔ خواتین کے بارے میں تحقیق کے لئے قائم کئے گئے اس شعبے کے بارے میں وہ کہتی ہیں کہ ''اس نوعیت کے شعبے کراچی، پشاور، لاہور اور کوئٹہ میں بھی قائم ہیں۔ لیکن انہیں بھرپور طریقے پر چلانے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ جبکہ دیگر ممالک یعنی یورپ، امریکہ، جاپان، سری لنکا، کوریا اور بنگلہ دیش میں یونیورسٹی کی سطح پر ان شعبوں سے گریجویشن اور ایم اے کی ڈگری دی جاتی ہے۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ گزشتہ حکومتوں نے اس

لئے فنڈز تک ریلیز نہیں کیے۔ جب بجٹ ہی نہیں ہو گا تو کوئی سرگرمی کیسے ہو گی۔ ان شعبوں میں گریجویشن تو دور کی بات ہے، یہاں صرف سرٹیفکیٹ کورس کروایا جاتا ہے۔ جب تک عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق کے بارے میں تحقیق نہیں ہو گی تو ملکی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی لانا ممکن نہیں ہے۔

فرزانہ باری کا یہ خواب ابھی تک ادھورا ہے کہ ویمنز اسٹڈیز سینٹر کو بھرپور طریقے پر چلایا جائے اور اس کا درجہ ایم اے کی ڈگری تک بڑھایا جائے۔

MashalBooks.org

# نیلم حسین

اس کا آغاز تو بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔

''ہمارا ایک گھر تھا۔ اس میں ہم، ماں، باپ، بہن بھائی، چچا، چچی ان کے بچے تھے۔ ایک ہی چار دیواری کے اندر زندگی بھرپور انداز میں جاگتی تھی۔ سب مل کر خوب مزے کرتے تھے۔ سب لڑکے خوب گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن میرے لئے جیسے یہ پہلے سے تھا کہ یہ گڑولیوں سے کھیلے گی۔ بھائی نیکر پہن کر باہر چلا جاتا تھا۔ ہمارے لئے برقعہ پہننا ضروری تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہوا ہو جاؤں۔ آخر یہ لڑکے بھی تو جاتے ہیں۔''

''میرے لئے یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ کم پڑھے گی۔ بھائی زیادہ پڑھے گا۔ سوال اٹھتا تھا اور جی ہی جی میں کڑھتی تھی کہ بھلا میں اس قابل کیوں نہیں کہ اتنا نہ پڑھ سکوں گی جتنا بھائی کو پڑھایا جائے گا۔''

''شادی ہوئی تو باپ نے کہا کہ اب تم ان کے خاندان کی ہو۔ جیسے میں ایک جنس تھی، ایک ملکیت تھی جسے دوسروں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔''

''گویا اپنی کوئی حیثیت نہیں، کوئی شناخت نہیں۔ سوال اٹھا کیوں؟''

اس کا جواب کتابوں میں اس طرح ملا:

''پدر شاہی نظام میں ضروری ہوتا ہے کہ عورت پر طاقت کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور اس کی خواہشات کو سماجی نظام کی تسلیم شدہ حدود میں رکھا جائے۔ اولاد کو باپ کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ نسل مرد کے نام سے چلتی ہے۔ عورت کے سماجی اور سیاسی کردار کی حیثیت کم کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح پدری نظام کی بقا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔''

''گھر میں کچھ ان کہے قواعد و ضوابط تھے۔ والد کا تعلق بائیں بازو کی سیاست

سے تھا۔ گھر میں تحریک آزادی کی باتیں ہوتی تھیں۔ میری کسی بات پر وہ مسکرا کر اتفاق ضرور کرتے تھے، لیکن کچھ ایسی ممانعت تھی جو عزت دار گھرانوں میں ہر لڑکی پر عائد کر دی جاتی ہے۔ اسے اجازت نہیں ہوتی کہ وہ کسی بات پر اپنی رائے دے سکے۔ بھلا لوگ کیا کہیں گے۔ گویا زبان بندی اچھی لڑکی کی علامت ہے۔''

''شادی ہو گئی۔ بے شک شوہر روشن خیال اور ترقی پسند نظریے کے حامی تھے لیکن مجھ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ میں غیروں کے سامنے خود کو کم ہوشیار ظاہر کروں۔ دوسرے الفاظ میں مجھے عمومی طور پر احمق نظر آنا چاہئے تھا۔ ازدواجی زندگی میں میری معتبری بہت کم تھی، اس لئے کہ شوہر کی قمیض کا بٹن نہیں لگا ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ بیویاں تو یہ کام کر کے فخر کرتی ہیں۔''

''زندگی کے مہ و سال بیتتے چلے گئے۔ نیلم کو انگریزی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ ٹیچر بننا چاہتی تھی۔

نیلم کے رول ماڈلز: برانٹے بہنیں، جین آسٹن، سیمون ڈی بوا اور مراکش کی فیمنسٹ دانشور فاطمہ مرنیسی۔

فاطمہ مرنیسی کے مقالے ''بنیاد پرستوں کے ذہن پر عورت کا تسلط'' کے بارے میں نیلم نے لکھا کہ ''فاطمہ مرنیسی عورت کے اخلاق یا اخلاقی عمل کے بارے میں بنیاد پرستی کے ضبط اور اس کی مرکزی دلچسپی، بنیاد پرست کی شناخت اور عصر حاضر کے تقاضے، ایک اہم سوال'' سے مخاطب ہیں۔

مغربی میڈیا بنیاد پرست کو خون کا پیاسا، جاہل، عورت سے متنفر اور اقتصادی طور پر مفلس، سیاسی طور پر ناکام اور ایسا دہشت گرد قرار دیتا ہے جو اسلحہ سے لیس ہے، جب کہ مسلم معاشروں، خصوصاً پاکستان میں اسے منافق، تادیبی اور حلوہ خور مسخرہ قرار دیا جاتا ہے۔

نیلم کی رائے میں یہ دونوں تاثر غلط ہیں۔ پہلی رائے کی جڑیں ترقی یافتہ دنیا کے سیاسی اور اقتصادی حقائق میں مضمر ہیں۔ اسی طرح دوسری رائے دراصل طاقت اور معاشرتی اقتصادی حکمت عملی کے مابین تعلق کی نشاندہی کرتی ہے۔

نیلم نے سیمون ڈی بوا کی بات سنی کہ ''میں نے نوجوان لڑکیوں کی طرح تعلیم

MashalBooks.org

حاصل کی۔ جب میری تعلیم مکمل ہوگئی تو سوسائٹی میں میری حیثیت ایک عورت کی ہی تھی جہاں عورت اور مرد کی انصاف کو دو متصادم فرقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ میں نے کئی طریقوں سے اس عورت کی طرح ردِعمل ظاہر کیا جو کہ میں تھی۔''

جین آسٹن نے اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھا، اس میں چاہت پائی۔ جین آسٹن نے محسوس کیا کہ پہلے سے مقرر کئے گئے اخلاقی اصول کمزور ہو رہے تھے اور معاشرے کی اقدار تبدیل ہو رہی تھیں۔

شارلٹ برانٹے کا کردار جین اور روچسٹر کے باہمی تعلق، شخصی انا اور انفرادی پہچان سے ٹکراتا ہے تو کبھی طبقاتی امتیاز کے سامنے کمزور پڑتا ہے۔

مرد کا خیال ہے کہ عورت کے لئے ریشمی ملبوسات اور مہنگے زیورات کا تحفہ ہی بہترین اظہار محبت ہے، جبکہ عورت سوچتی ہے کہ میرے پاس ذرا سی خود مختاری آ جائے تو میں یہ کبھی برداشت نہ کروں کہ روچیسٹر مجھے گڑیا کی طرح سجائے۔ اسے گرانقدر تحفے اپنی حدتک محسوس کرتے ہیں۔ اسے ایک موقع پر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عورت جس قدر اپنی عزت کرتی ہے وہ اتنی ہی تنہا ہوتی جاتی ہے۔

عورت ہونے کا تجربہ۔ ہر زمانے، ہر معاشرے، ہر تہذیب کی عورتوں کے اپنے اپنے تجربات ہیں، اپنے اپنے احساسات نیلم نے سوچا وہ اکیلی نہیں ہیں۔

نیلم حسین جب پی ایچ ڈی کرنے کے لئے انگلینڈ گئیں تو ان دنوں مارکسزم اور فیمنسٹ تحریکوں کا بہت زور تھا۔ ان سرگرمیوں میں شرکت سے ان کی سوچ اور لکھنے کے انداز میں تبدیلی آئی۔ انہیں بوجوہ ایک سال کے بعد 1985ء میں پاکستان واپس آنا پڑا۔ ضیا کے مارشل لا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ خواتین محاذِ عمل (WAF) تشکیل پا چکا تھا۔

''سیاست، عورتیں اور تاریخ'' پر بحث چل نکلی تھی۔ نیلم ان تحریکوں کا حصہ بن گئیں۔ سامنے بہت سی راہیں تھیں۔ بے شمار موضوعات تھے۔ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں عورت کی جسم فروشی، تشدد، ٹریفکنگ، عالمی مالیاتی اداروں کی ترقی پذیر ممالک پر کرم فرمائیاں۔ ایک سوال اٹھتا ہے کہ ہمارا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ ہم کس طرح خود کفیل بن سکتے ہیں؟ ''سیمرغ'' کے نام سے تحقیق و اشاعت کے معاملات پر تحقیق لازمی ہے، ورنہ ہم

متصادم قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تحقیق سے حاصل ہونے والے حقائق کو اپنے ایکٹوزم میں شامل کر کے ہی خود کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔

کیا حاصل ہوا؟

اس سوال کے جواب میں نیلم کا کہنا ہے کہ ہم دوڑ دوڑ کر ''ہف'' گئے ہیں، لیکن بظاہر وہیں کے وہیں ہیں۔ ہم نظام نہیں بدل سکتے۔ عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین تبدیل نہیں ہوئے لیکن یہ تو ہوا کہ عورتوں نے لوگوں کو پریشان کیا۔ اب عورت کی بات کی جاتی ہے۔ معاشرتی ڈھانچے میں مثبت تبدیلی لانے میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرد ذات بہت ڈرپوک ہے۔ اس کی انا بڑی لاغر ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ عورت کو آزادی دینے سے مراد مرد کو آزادی دینا ہے۔

نیلم حسین گزشتہ کئی برسوں سے کنیئرڈ کالج کے ساتھ منسلک تھیں۔ اب وہ اپنا پورا وقت ''سیمرغ'' کی سرگرمیوں میں صرف کرتی ہیں۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد جب وہ انگلینڈ چلی گئیں تو اس دوران بقول ان کے بچوں کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو بچے ہیں۔

# سلیمہ ہاشمی

ہمارے معاشرتی منظر میں جو نمایاں تبدیلی آئی ہے، وہ یہ کہ پاکستان کی عورتیں ضیا دور کی سب سے بڑی فاتح بن کر ابھری ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں سرگرم عمل دکھائی دیتی ہیں۔ انکی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کی تخلیق کاری میں پختگی آئی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ ردعمل ہے ان طویل برسوں کے دباؤ اور ان پابندیوں کا جو ان پر عائد کی گئی تھیں، ان رکاوٹوں کا جو ان کی راہ میں کھڑی کی گئی تھیں۔

سلیمہ ہاشمی کا مشاہدہ، ایک حساس اور باشعور شہری ہونے کی حیثیت سے۔

طویل قامت مصور پکا سو نے عورتوں کو ایک بے جان شے کی طرح پیش کیا تھا۔ ایک عورت جب اپنے جسم کی تصویر بناتی ہے تو وہ اس سے مختلف ہوتی ہے جیسا کہ ایک مرد اسے دیکھتا ہے اور بناتا ہے۔ مرد کے لئے عورت کا جسم محض ایک جنسی مفعول ہے، جب کہ عورت خود کو پینٹ کرتی ہے تو اس میں روحانی عناصر اور احساسات کا اضافہ کرتی ہے۔ دنیا بھر میں فیمنسٹ پینٹرز نے فنونِ لطیفہ کے مروجہ تخلیقی عمل کو للکارا اور احتجاجاً اپنی تخلیق کاری میں جدت اور انقلابی تبدیلیاں لانے کے عمل کا آغاز کیا۔ پاکستان کی مصور خواتین اپنی تخلیقات اور موضوعات کو بتدریج خواتین کی تحریک کے ساتھ مربوط کر رہی ہیں۔

سلیمہ ہاشمی جو خود ایک فیمنسٹ پینٹر ہیں انہوں نے عورت کے بارے میں مردوں کے عام رویوں اور فن برائے زندگی پر یقین رکھنے والی مصور خواتین کی روش پر تبصرہ کیا۔

سلیمہ ہاشمی بیک وقت کئی کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک اداکارہ، ایک مصور، فوٹو گرافر، استاد۔ روپ کوئی بھی ہو، مقصد ایک ہی ہے۔ عام آدمی کی بہتری۔ ان تمام کرداروں میں ایک ایسے حساس شخص کا کردار ہوتا ہے جو انسان ہے۔ زندہ رہنے کا حق مانگتا ہے۔ وہ سر اٹھا

کر زندگی گزارنے کی خواہش رکھتا ہے۔

سلیمہ کی پوری زندگی اسی سے عبارت ہے۔ رجعت پسند قوتوں کے خلاف جنگ، انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج کہتی ہیں:

''وقت بدلتا ہے، حکومتیں بدلتی ہیں، لیکن حالات نہیں بدلتے۔

''ہم ان دنوں کشمیر میں تھے۔ میری عمر 5 سال کی تھی۔'' سلیمہ یاد کر رہی تھیں۔'' تقسیم ہند کی خونریزی کے خلاف امن جلوس نکالا گیا تھا۔ مجھے ایک خچر پر بٹھایا ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ اس جلوس میں بہت سارے بچے پیش پیش تھے۔''

وہ واقعہ بھی ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔ یہ سنہ 47ء کی گرمیوں کا موسم تھا۔ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا۔ ہم لاہور کے میٹرو ہوٹل کے قریب رہتے تھے۔ ایک دم شور سنائی دیا۔ ماما سو رہی تھیں۔ میں چھت پر چڑھ گئی۔ سکھوں کا ایک ہجوم تھا جسے ایک شخص لیڈر کر رہا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں کرپانیں تھیں۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ وہ ماسٹر تارا سنگھ تھا۔ یہ جلوس بھی لاہور میں سکھوں کے قتل و غارت کے ردعمل میں نکالا گیا تھا۔

وہ دن بھی یاد ہیں جب میں اپنی ماں کے ساتھ مہاجروں کے کیمپ میں جاتی تھی۔ لاہور کالج کے قریب والدین سے بچھڑنے والے بچوں کا ایک کیمپ لگایا گیا تھا۔ وہاں ماما کے علاوہ اور بھی خواتین آتی تھیں جو بچوں کی بازیابی میں مدد کرتی تھیں۔

لیکن سب سے تکلیف دہ دور وہ تھا جب والد جیل گئے۔ ان پر سازش کا الزام تھا۔ ہمارے ٹیلی فون ٹیپ کئے جاتے تھے۔ بہت سے دوستوں نے کنارہ کشی کر لی تھی۔ یہ لیاقت علی خان کا دور تھا۔ ایوب کے دور میں جب بنگالیوں کے خلاف ہوا چل پڑی تھی تو کئی بنگالی دوست ہمارے ہاں پناہ لئے ہوئے تھے۔ بھٹو کے دور میں بنگش ہماری حفاظت میں تھے۔ ضیا کے دور میں انٹیلی جنس کی جیپ گھر کے باہر کھڑی رہتی تھی۔ مجبوراً والد کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تھی۔

''ہاں، وقت کے ساتھ اگر کوئی تبدیلی آتی تو وہ ایشوز کی نوعیت کی تھی۔ لاہور کالج میں پڑھتی تھی تو عائلی قوانین کے نفاذ پر بنیاد پرستوں کی مزاحمت کے خلاف جلوس نکالا گیا تھا۔ سنہ 1952ء میں سویز نہر پر برطانوی حملے کے خلاف پلے کارڈ میرے ہاتھوں میں تھے۔ کوریا کی جنگ کے خلاف امن تحریک میں شامل تھی۔ سنہ 1958ء میں مہنگائی کے

MashalBooks.org

خلاف ریلوے ورکرز کے احتجاجی جلوس میں شامل افراد کو شملہ پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنی حمایت کا اشارہ دے رہی تھی۔ زندگی کے یہی حوالے ہیں۔''

پاکستان ٹیلی ویژن سے اکڑ بکڑ، سچ گپ اور ٹال مٹول کے پروگراموں کی پیشکش کے علاوہ ان میں سلیمہ نے اہم کردار ادا کیا۔ سلیمہ کو اعتراف ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پی ٹی وی میں خاصی آزادی تھی۔ مذاق مذاق میں بہت سے سنجیدہ معاملات کو منظر عام پر لایا گیا تھا لیکن جب ضیا کے دور میں ٹیلی ویژن سیریل ''بلبلا'' چلا تو اسے چند ابتدائی قسطوں کے بعد بند کر دیا گیا۔ وہ ایک تفریحی پروگرام تھا۔ لیکن ضیا کے درباریوں نے اس میں سے کئی خطرناک باتیں نکال لیں جو ایک آمر کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ سلیمہ ہاشمی اور ان کے گروپ کو ٹیلی ویژن پر ممنوع کر دیا گیا۔

اس دوران ویف کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اب ہاشمی گروپ کی تخلیقات ویف کی سرگرمیوں میں شامل تھیں۔ ٹیلی ویژن، تھیٹر، اسٹریٹ تھیٹر اور کارنر تھیٹر بن چکا تھا یا پھر ان پروگراموں کو نجی ادارے سپانسر کرتے تھے، کیونکہ گھٹن کی اس فضا میں لوگ ہنسنا چاہتے تھے۔ یہی ان کے لئے ایک سیفٹی والو تھا۔

مارشل لاء دور میں تفریح کے انداز اور رجحانات پر بات کرتے ہوئے سلیمہ کا کہنا تھا کہ اسی دوران بھانڈوں کی جگت بازی نے فروغ پایا جو سٹیج پر ذو معنی فحش مکالمات سے حاضرین سے حاضرین کو محظوظ کرتے تھے۔ ان دنوں اردو سینما تقریباً ختم ہو گیا۔ پنجابی اور پشتو فلموں نے مقبولیت حاصل کہ ان میں تشدد اور گھٹیا تفریح شامل تھی۔

سلیمہ کا خیال ہے کہ اس دوران میڈیا نے بھی بہت اہم رول ادا کیا۔ الیکٹرانک میڈیا کا جو کردار رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ٹی وی پروڈکشن کا معیار گرا اور صحافت تیسرے درجے میں پہنچ گی۔

کہنے کو جمہوریت آئی ہے لیکن ریاستی تشدد اپنی جگہ ہے۔ کیونکہ ہماری ایک ذہنیت بن چکی ہے کہ ہر دور کا ایک آمر ہوتا ہے جو فن کی تمام ہیئتوں کا دشمن ہے۔

سلیمہ ہاشمی نے پاکستان نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے مصوری میں تربیت حاصل کی۔ پھر لندن سے فوٹوگرافی اور مصوری کی تعلیم مکمل کی اور روڈز آئی لینڈ (امریکہ) سے فائن آرٹس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے نیشنل کالج آف

آرٹس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے نیشنل کالج آف آرٹس کے ساتھ بطور لیکچرر منسلک رہی ہیں۔ ان دنوں کالج کی پرنسپل ہیں۔

بطور استاد اپنے طلبہ کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ ''ہماری نئی نسل ہمیشہ کی طرح پرامنگ اور آئیڈیلسٹ ہے لیکن وہ سیاسی طور پر متذبذب ہے۔ وہ رہنمائی چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی رول ماڈل نہیں جسے وہ اپنا راہبر خیال کر سکیں۔ انہیں عصر حاضر میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو اپنے قول وفعل میں کھری ہو۔

چھیمی (عرف) فطرتاً رجائیت پسند ہیں۔ بقول ان کے یہ خاصیت انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے۔ کہتی ہیں ''بھلا ہم یہ کیوں کہیں کہ ہمارا ہی وقت اچھا ہو۔ ناموافق حالات ہی تو آزمائش ہوتے ہیں، کچھ کرنے کے لئے زندگی کو کچھ دینے کے لئے۔ چھیمی شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔

MashalBooks.org

# انیس ہارون

تشدد ہماری معاشرتی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔خصوصاً کراچی میں اس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا ہے۔ 95-1994ء میں تو صورت حال بدترین ہوگئی جس سے شہر بھرخوف و ہراس کی لپیٹ میں آ گیا۔ رمضان کے مہینے میں مسجد میں نمازیوں کا قتل، عید کی شام کوایک خاندان کوموت کے گھاٹ اتار دیا گا۔ مزدوروں کوایک کمرے میں مار دیا گیا۔ شہر بھر سے 23 افراد کو اٹھا کر بس میں سوار کیا اور قتل کر دیا گیا۔ پولیس شہریوں کو مار رہی تھی، شہری پولیس والوں کو۔ پولیس کے جھوٹے مقابلے میں نوجوانوں پر تشدد اور ان کا قتل اس تکلیف دہ صورت حال سے کوئی حساس اور امن پسند شہری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ویف کا مطمح نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ مظلوم شہریوں کی کس طرح مدد کی جائے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر احتجاج کیا جائے۔عملی اقدام کئے جائیں۔'' انیس ہارون کے ایکٹوزم کی ایک کڑی۔

انیس ہارون نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ یہ وہ دور تھا جب بھٹو کی کرشمہ ساز شخصیت نے روشن خیال، ترقی پسند اور جمہوریت کی خواہش مند ایک نسل کو متاثر کیا تھا۔ انہوں نے ایک خوبصورت مستقبل کے خواب دیکھے تھے۔ انیس ہارون، جو اس وقت انیس تفضّل تھیں، اس انسانی دھارے کا ایک فعال جزو تھیں۔ صحافت ان کا وسیلہ روزگار تھا، مگر سیاست ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ طالب علمی کے دور میں ان کی جو پہچان ایک دھواں دھار ڈبیٹر کی بنی تھی وہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

یہ بھی انیس ہارون کی سرشت میں شامل ہے کہ ان کے ہاتھ میں امید کی چھوٹی سی کرن ہوتو وہ اسے لے کر تاریکیوں کی طرف بڑھنے لگتی ہیں کہ شاید ان کی کسی کوشش سے، کسی اقدام سے تاریکیاں چھٹنے لگیں۔ کسی نظام کو اگر یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم

اس میں دراڑیں تو ڈالی جاسکتی ہیں۔

انیس کہتی ہیں ''ناانصافیوں کے خلاف غصہ ہوتا ہے تو ایکٹوزم پیدا ہوتا ہے۔ سنہ 60 اور 70 کے عشروں جو تحریکیں چلی تھیں ان میں ایک جوش و جذبہ تھا لیکن اب اس دور کے لوگ رضا کارانہ طور پر کام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ ہر کام ملازمت کے طور پر کرتے ہیں۔ این جی اوز کے ذریعے سیاسی ایکٹوزم کا راستہ روک دیا گیا ہے۔ پہلے جو لوگ اپنی اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود مختلف مضوضوعات پر بحث مباحثے میں شریک ہوتے تھے، اب اگر کوئی احتجاجی مظاہرہ ہوتو وہ پانچ بجے تک موجود رہتے ہیں اور اس کے بعد اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

انیس ہارون خواتین کے حقوق کے خلاف آواز اٹھانے والی تنظیموں، انسانی حقوق کے علمبردار گروہوں، امن پسند اور رواداری کے حامیوں کی ہم رکاب ہیں۔ ایک مسلسل جدوجہد، کبھی نہ رکنے والی سرگرمیاں۔ اس تمام تگ و دو سے کیا حاصل ہوا؟ اس پر ان کا کہنا ہے کہ:

''ضیاء دور میں عورت کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا گیا اس کے بارے میں عورتیں بہت واضح طور پر سمجھتی تھیں کہ انہیں اس کے خلاف آواز اٹھانی ہے۔انہوں نے بے خوفی کے ساتھ اپنے احتجاج کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت رکاوٹیں ضرور تھیں لیکن فرسٹریشن نہیں تھی۔ اب فرسٹریشن ہے۔ نام نہاد جمہوریت پسند آئے۔ انہوں نے تعلیمی اداروں، سیاسی اداروں اور سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ نیز ہماری زندگیوں میں تشدد کا عنصر شامل ہو گیا۔ پہلے جو بات بے خوفی سے کہہ دیتے تھے اب خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی صورت حال میں کوئی مثبت تبدیلی نظر نہیں آتی۔ سیاسی اور معاشی ڈھانچہ جوں کا توں ہے۔ سوویت یونین کا زوال ہوا تو اس کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ اب ہر چیز امریکہ کی گود میں ڈال دی گئی ہے لیکن ناامید نہیں ہوں۔ اگر چار قدم پیچھے جاتے ہیں تو دو قدم آگے بھی بڑھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ لوگوں کے رویوں میں تبدیلی آنی ضروری ہے۔ جب تک فکر نہیں بدلے گی ملکی حالات میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ ہم نے اپنا کام کیا۔ کل کوئی اور اس کام کو بڑھانے کے لئے آئے گا۔ یہی زندگی ہے۔

انیس ہارون نے ''پاکستان میں عورتوں کی تحریکیں'' کے موضوع پر اپنے مقالے

میں کہا تھا کہ ''تحریک سے مراد کسی ایک گروہ یا فورم کے تنہا اقدام کا نام نہیں۔ ایک مخصوص آئیڈیالوجی ہر تحریک کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کی ایک حکمت عملی ہوتی ہے جس میں سیاسی، سماجی، ذاتی اور ثقافتی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہر تحریک کو ان بین الاقوامی معاملات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے جو قومی اور مقامی ایشوز کو متاثر کرتے ہیں۔

انیس کا کہنا ہے کہ بے شک پاکستان ہی ہماری پہچان ہے، لیکن جنوبی ایشیا کے کسی ملک میں چلے جائیں تو وہاں کے تمام مسائل ہمارے مسائل کی مانند ہیں۔ اس لحاظ سے میں خود کو جنوب ایشیائی ہی خیال کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمام جنوب ایشیائی ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ شدید قسم کا نیشنل ازم مجھ پر کبھی طاری نہیں ہوا۔

اپنے خطے کے مسائل کے حل کے لئے یک جہتی پر یقین رکھنے والی اس خاتون کو کچی عمر میں جمال عبدالناصر نے متاثر کیا تھا۔ یاد کرتی ہیں:

''یہ 1956ء کی بات ہے۔ میں کراچی کے ایک سکول میں چھٹی کلاس میں تھی۔ بہت سے طلبا بس میں بھر کر ہمارے سکول آئے۔ نہر سویز کا قصہ چل رہا تھا۔ جمال عبدالناصر ہیرو کے طور پر ابھر رہے تھے۔ طلبا نے ہم سے کہا کہ جو بھی ان کے احتجاجی جلوس میں چلنا چاہے چلے۔ ہم دو لڑکیاں ان کے ساتھ لیں۔ پیدل چلے۔ تقریریں ہوئیں، نعرے لگائے گئے۔ لڑکے جمال ناصر کی تصویریں اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سب کچھ اس قدر سحر آلود تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ جلسہ ختم ہو گیا اور سب لوگ چلے گئے۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں شہر کے کس حصے میں ہوں۔ ایک پولیس والے نے مجھے رکشا میں بٹھا کر گھر چھوڑا۔ گھر پر امی سے ڈانٹ پڑی مگر ابا خوب ہنسے اور پھر مجھے سمجھایا۔ ابا بائیں بازو کی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ اس کا ادب شوق سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ بابا چاہتے تھے کہ میں سیاست میں حصہ لوں۔

انیس جب کالج گئیں تو ایوب خان کی آمریت کا دور تھا۔ طلبہ نے اس کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کر دی تھی۔ حیدر آباد کے ویمنز کالج میں اس سے پہلے کبھی ایسی سرگرمیوں میں کسی نے شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن انہوں نے کئی لڑکیوں کو اپنے ساتھ مل کر کالج میں ہڑتال کروا دی۔

انیس نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم۔اے کراچی یونیورسٹی سے اور پھر اسلامیہ لا کالج سے ایل ایل بی کیا۔ ارادہ وکالت کرنے کا تھا لیکن صحافت میں آ گئیں۔ 5-4 برس بعد شادی، گھر اور بچے۔ صحافت چھوڑ دی۔ 1976ء سے 1981ء تک غیر فعال زندگی گزاری۔ انیس ہارون کے 3 بچے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

''مارشل لاء لگ چکا تھا۔منتخب وزیراعظم کو پھانسی دے دی گئی۔ سیاسی طور پر ایک تکلیف دہ دور تھا۔ اندر ہی اندر ایک لاوا سا ابل رہا تھا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ 1981ء میں ویمنز ایکشن فورم بنا۔ اس میں مجھے بھی شامل کرلیا گیا۔ یہ مختلف تجربہ تھا۔ اس تنظیم نے پہلی بار عورتوں کے استحصال اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کا مسئلہ اٹھایا۔ میں ان کے ساتھ ضرور تھی لیکن گزشتہ 5-4 سال کی گھریلو زندگی گزارنے کے بعد خود کو اس کیفیت سے نکالنے میں بہت وقت لگا۔ اس دوران اثر،عورت فاؤنڈیشن اور انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے موضوعات سامنے آتے گئے۔ ان پر ریسرچ بھی کی اور عملی طور پر عورتوں کے مسائل اور انسانی حقوق کے مسائل کے حل کے لئے کام بھی کیا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے کراچی تشدد آمیزی کی زد میں رہا جس سے ہزاروں گھرانے متاثر ہوئے۔ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی گروہ سے ہو، وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اس سے قطع نظر اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ متاثرہ افراد کو قانونی، طبی اور مالی امداد فراہم کی جائے۔ اس ضمن میں ویف نے انیس ہارون کی سربراہی میں پیش قدمی کی۔ سب سے پہلا مرحلہ ان تک رسائی تھی۔ تشدد سے خوفزدہ عورتیں بات کرنے کو تیار نہ تھیں۔ کسی پر اعتماد نہیں کرتی تھیں۔ ویف نے بند کمروں میں نشستوں کا اہتمام کیا تاکہ وہ اپنی روداد بیان کر سکیں۔ اس دوران انہیں چند دیگر تنظیموں کا تعاون بھی حاصل ہو چکا تھا۔ جب اعتماد کی فضا قائم ہوئی تو وہ عورتیں جن کے بھائی بیٹے اور شوہر یا تو مارے جا چکے تھے یا وہ جیل میں تھے اور ان میں سے بیشتر اپنے گھر چھوڑ کر دوسرے علاقے میں رہائش پذیر ہو گئی تھیں، ان سب نے اپنی مشکلات بیان کیں اور پھر انہوں نے عوامی اجتماع میں اپنے دکھ بیان کئے، تاکہ میڈیا کے ذریعے عوام تک صحیح صورت حال پہنچائی جائے۔ یہ سب کام بخوبی ہوئے۔ یہی نہیں، وہ عورتیں جنہوں نے اپنے پیاروں کی جان کی قربانی دی تھی اور اس المیے کو

قضائے الٰہی خیال کر کے خاموش تھی ان میں اب اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ویف کے امدادی کاموں میں معاون کے طور پر کام کرتی ہیں اور ان میں مستقبل کے لئے ایکٹوزم بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عورتوں کے حقوق کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی۔

MashalBooks.org

# ثمینہ رحمٰن

''گزشتہ ایک ڈیڑھ عشرے کے دوران عورتوں کی سرگرم تحریکوں کے ردعمل میں عورتیں بے شک راکھ سے عنقا کی طرح بلند نہیں ہوئیں لیکن وہ الاؤ یقینی طور پر شعور، سیاست اور عورتوں کے اظہار پر اثر انداز ہوا ہے۔ عورتوں کے ادبی اظہار کو ضیا دور کی سیاست اور ایکٹوزم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہی برسوں میں عوام اور نجی جگہوں کے درمیان لکیر کھینچ دی گئی تھی۔ حکومتی پالیسی کے تحت کی گئی یہ تقسیم ملکی سیاسی تاریخ کا پہلا مظہر تھا۔ ایک طرف عورتوں کو زبردستی عوامی جگہوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن بدخصلت مردوں کی ''ٹکٹکی'' ادیب خواتین کی بڑی تھیم رہی ہے۔ یہی وہ عرصہ تھا جب عورتوں کے خلاف قوانین وضع کئے گئے۔ اسی دوران عورتیں حکومتی طاقتوں کے ساتھ بطور عورتیں متصادم ہوئیں۔''

ثمینہ رحمٰن کے مقالے ''عورتوں کی احتجاجی آوازیں'' کے مندرجہ بالا اقتباسات ان کے ادب سے لگاؤ، مطالعے اور تحقیق کی گواہی دیتے ہیں۔

ثمینہ نے علی گڑھ کے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جس کی عورتیں سیاست، ادب، ثقافت اور سماجی سرگرمیوں میں بہت پہلے سے سرگرم عمل تھیں۔ انہوں نے عورتوں کی ترقی کے لئے جدوجہد کی اور خاندان کی عورتوں کو برقعے سے باہر نکالا۔ والد ادیبوں کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ سب ایک طرح ثمینہ کے لئے خوش نصیبی تھی کہ ان کی راہ سے عورتوں کے بارے میں روایت پسندی اور تنگ نظری پہلے سے ہٹائی جا چکی تھی۔ دستیاب ادب میں لینن، مارکس، انیگل چے گویرا اور ماؤزے تنگ کی تصانیف تھیں۔ عام آدمی کی بھلائی کے لئے ان کے نظریات ذہن پر پنا نقش چھوڑ رہے تھے۔

ثمینہ نے سینٹ جوزف کالج کراچی سے انٹرمیڈیٹ کنیئرڈ کالج لاہور سے بی۔اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ وہ ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کیمبرج (انگلینڈ) گئیں تو وہاں کے حالات نے انہیں اپنا مضمون تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ نتیجتاً سوشل اور پولیٹیکل سائنس کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔

''ان دنوں ویت نام کی جنگ کے خلاف بائیں بازو کی طلبا تنظیمیں بہت پرجوش تھیں۔ یہ ایک عالمی مسئلہ تھا۔ دنیا بھر کے طلبا و طالبات ان سرگرمیوں میں شریک تھے۔ انہی دنوں یہ احساس ہوا کہ عورت یورپ میں بھی دوسرے درجے کی شہری ہے۔ سٹوڈنٹس کی غیر نصابی سرگرمیوں کے دوران تمام اہم فیصلے مرد کرتے، جبکہ لڑکیوں کا کام چائے بنانا، کھانا بنانا اور دیگر خاطر تواضع تھی۔ اگر کسی عورت کی طرف سے کوئی رائے یا مشورہ دیا جاتا تو اس کا فوری طور پر مردانہ ردعمل یہ ہوتا کہ چھوڑو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ ارے تم تو بیوقوف ہو۔ اگر اس قسم کی بات نہ بھی کہی جاتی تو اس کی رائے کو سنی ان سنی کر کے نظر انداز کر دیا جاتا۔

ایشیائی لڑکوں کی یورپی لڑکیاں دوست تھیں۔ وہ ان کے لئے تفریح کا سامان تھیں۔ بظاہر ان کی ہم رکاب تھیں لیکن..........

!'' عورتوں کے ساتھ صحیح برتاؤ نہیں ہو رہا۔'' ثمینہ نے سوچا تھا۔''غیر مساوی اقتصادی تقسیم ہی ان غیر مساوی رشتوں کی بنیاد ہے۔''

ثمینہ سنہ 1971ء میں فارغ التحصیل ہو کر پاکستان لوٹیں تو سقوط ڈھاکہ کا سانحہ ہو چکا تھا۔ بھٹو کا دور شروع ہو گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا قلق، بہتر مستقبل کی کچھ آس، ثمینہ نے پنجاب یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ پھر شادی ہو گئی، بچے ہو گئے۔ زندگی نجی سطح پر بہت مصروف ہو گئی۔ اسی دوران کے شوہر کا اسلام آباد میں ایک ملازمت پر تعین ہوا تو وہ قائداعظم یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔ شوہر بہت لبرل اور بائیں بازو یک سیاست میں ملوث تھے لیکن عائلی زندگی میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔

''انگلینڈ میں تعلیم کے دوران کچھ پاکستانی طالبات سے ملاقات ہوئی اور پاکستان آ کر ان سے دوستی پختہ ہو گئی۔ کیونکہ اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بہت سے معاملات پر بخوبی تبادلہ خیال ہو سکتا ہے۔ ان کے ساتھ بندھن مضبوط ہونے لگا۔ اس

دوران فیمنزم پر بات چیت ہونے لگی تھی۔ اس ضمن میں باہر سے لٹریچر آ رہا تھا۔ عورت کی اپنی پہچان کے حوالے سے ان تحریروں کے ساتھ ذہنی مطابقت پیدا ہونے لگی۔'' ثمینہ یاد کرتی ہیں۔

''بھٹو کو پھانسی ہوگئی۔ ضیاء الحق نے عورتوں کے حقوق پر ہاتھ ڈالا۔ ویف بن گئی۔ اس میں جو ایشوز اٹھائے گئے تو یوں لگا جیسے عورت ہونے کے حوالے سے جو بے چینی سی اندر ہی اندر پکتی رہی تھی اس کے نکاس کا وسیلہ بن گیا ہے۔ زندہ رہنے کا جواز مل گیا ہے۔ ویف میں باہم مل کر کام کرنے سے ایک نیا شعور ملا کہ عورتوں اور معاشرے کے دوسرے دبے ہوئے طبقوں کے مسائل کو کس طرح دیکھا جائے۔ کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔ کیونکہ یہ مسائل بہرحال ملکی سیاست کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

ثمینہ کو یاد ہے کہ ویف کے لائحہ عمل پر غور کے وقت یہ بھی ہوا تھا کہ کیا ہم مذہبی وکٹ پر لڑیں گے یا نہیں۔ کیونکہ اس پر مولوی مسلط ہے۔ کیا ہمیں قرآن کی تشریح کو زیر بحث لانا چاہیئے یا نہیں یا یہ سب مولویوں پر چھوڑ دیں اور اپنی جدوجہد کو دوسرا رنگ دیں؟

''ان سارے کاموں نے میری زندگی کا دھارا تبدیل کر دیا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ جو کام میرے خاندان کی عورتوں نے شروع کیا تھا اسے میں نے اگلی نسل میں منتقل کیا، جیسے میں نے ایک فرض نبھایا ہو'' ثمینہ کہہ رہی تھیں۔

ٹھیک ہے ہمیں ابھی تک کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہم پر بہت سی تہمتیں بھی لگیں کہ یہ سب مغرب زدہ عورتیں ہیں لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ کچھ بھی سہی، امید کی ایک کرن ضرور ہے کہ ان تمام برسوں میں عورتوں کو ایک پہچان، ان کے خواب و خیال کو جو آواز ملی ہے کسی نہ کسی وقت کا اثر معاشرے کی سوچ پر ضرور پڑے گا۔

بہرحال عورتیں اب پہلے سے زیادہ خود اعتمادی سے کام کر رہی ہیں۔ پڑھنے کے لئے لڑ رہی ہیں۔ اگلی نسل کی لڑکیاں بے شک ہماری طرح تحریکوں میں شامل نہیں ہوئیں، لیکن ہماری بیس سالہ جدوجہد سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ لڑکیاں اپنے فیصلے خود کر رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا بھر میں جو یپی (Yuppy) کلچر بن رہا ہے، ہمارے بچے بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کا مقصد پیسہ کمانا ہے۔ ان میں ہماری طرح کا نظریاتی جنون نہیں ہے۔ وہ کنزیومرزم کے شکار ہیں۔ اپنا وقت تحریکوں کے جلسے جلوسوں میں ضائع کرنے کے

بجائے ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں۔

مینا (عرف) علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے تین بچے ہیں چند سال قبل شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ شعبہ تعلیم کا فروغ ان کا پیشہ اور مشن ہے۔ وہ ویف کے علاوہ ''ساہی'' کی بھی بنیادی رکن ہیں۔ وہ لاہور کالج آف آرٹس کی پرنسپل رہی ہیں۔ لاہور گرائمر سکول کی بانی اور ڈائریکٹر ہیں۔ لاہور گرائمر سکول 1978ء میں آٹھ عورتوں کے ایک گروپ نے قائم کیا تھا۔ یہ غالباً پہلی تعلیمی ادارہ ہے جس میں سکول کی سطح پر ویمن سٹڈیز کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے آئندہ پروگراموں میں حکومت کے تعاون سے سرکاری سکولوں کے نظم ونسق سنبھال کر معیار تعلیم کو بہتر بنانا اور اساتذہ کی تربیت کرنا ہے۔

مینا زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج لاہور کے جریدے راوی کی ایڈیٹر رہیں اور بہترین ایڈیٹر کا ایوراڈ حاصل کیا۔ وہ متعدد کتب کی مصنفہ اور ایڈیٹر ہیں۔

# لالہ رخ

’’آپ ایک کیلنڈر دیکھتے ہیں۔خوش ہو جاتے ہیں۔ بڑا خوبصورت ہے۔تعریف کرتے ہیں۔لیکن گہرائی میں نہیں جاتے۔ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کیلنڈر کی امیجری آپ سے کیا کہتی ہیں۔ وہاں کس خیال کی عکاسی کی گئی ہے۔بس واہ واہ کرتے ہیں کہ اس میں مشرقی فن نظر آ رہا ہے۔

’’ہمارے قومی مونیومنٹس (یادگاری عمارتیں) بہت شاندار نظر آتے ہیں لیکن انہیں غور سے دیکھیں تو وہاں خالص مردانہ فورمز نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ قائداعظم کا مزار ہو یا علامہ اقبال کا۔ یہ ہمارے صدیوں پرانے پدری نظام کی علامتیں ہیں۔ مرد کا دبدبہ، اس کا غلبہ، اپنے گردوپیش پر چھا جانے کی خواہش، اپنی اس خواہش کی تکمیل کا فخر۔‘‘ لالہ کا کہنا ہے۔

لالہ بنیادی طور پر پینٹر ہیں۔ لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس سے منسلک ہیں۔ لالہ تربیت یافتہ فوٹو گرافر ہیں۔ وہ اپنے اندر اور باہر کو برش اور کیمرے کے لینز دونوں وسیلوں سے گرفت میں لیتی ہیں۔ یہی ان کا طرز اظہار ہے، ان کا ایکٹوزم ہے۔’’سیمرغ‘‘ کی جانب سے’’عورتوں کی عدالت‘‘ کےعنوان سے سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ لالہ اپنے ویڈیو کیمرے کی وساطت سے افغان جنگ کے دوران’’مجاہدین‘‘ کے ہاتھوں لٹنے والی عورتوں، سری لنکا کی خانہ جنگی سے بے گھر ہونے والی، ملتان کے قریب گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی عورتوں، اپنی دکھ بھری داستان بتانے والی خواتین کی زخمی روح، ان کے چہروں کی مظلومیت، ان کی جرأت کا اظہار، دوسری عورتوں کے ساتھ اپنا دکھ بانٹنے کا اقدام، انسانی حقوق کے دعوے دار عالمی تنظیموں تک اپنی آواز پہنچانے کی کاوش وہ سب کچھ لالہ کے کیمر ے میں سٹ آیا ہے۔

MashalBooks.org

لالہ فیمی نسٹ ہیں۔!! ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ ہم پر حکم صادر کئے جا رہے تھے۔ میرے نزدیک ''اتھارٹی'' ناقابل برداشت ہے۔ مارشل لا کی اتھارٹی ہم پر مسلط کی جا رہی تھی۔ انہی حالات نے ہماری تحریک کو جنم دیا۔ ہم لوگ سب ناتجربہ کار تھے لیکن جذبہ تھا۔ ہماری تحریک میں ہر ایسا شخص جو ذی حس تھا، ذی شعور تھا، غیر جمہوری نظام کے خلاف تھا۔ وہ ٹریڈ یونین کے لوگ تھے۔ طلباء، وکیل، صحافی، ادیب، مصور، مرد اور عورتیں ہم سب کی جدوجہد ایک تھی۔ ہماری ایک سمت تھی۔

لیکن اب!! ایک اجتماعی کاوش۔ ایکٹوزم کا بہت سارا حصہ بک گیا۔ عورتوں کی تحریکوں کی جیسے روح ختم ہوگئی۔ جیسے ہم اصل منزل سے منحرف ہو گئے ہوں۔ ہم سے پہلے ترقی پسند تحریکوں کے ہاں ایک تسلسل تھا۔ وہاں ادب کے ذریعے یا فنونِ لطیفہ کے دیگر اصناف کے وسیلے سے مسلسل آگے کی طرف جانے کی تلقین ملتی تھی۔ محرکات موجود تھے۔

قومی اور عالمی سطح پر عورتوں کے حقوق کے ضمن میں ایک زبان استعمال نہیں ہو رہی۔ بیجنگ کی مثال لیجئے۔ وہاں دائیں بازو کے لوگوں کی لابی زیادہ مضبوط تھی۔ وہاں ہمیں ویف نظر نہیں آیا۔ اس لئے کہ ہم نے اپنے مقصد کی پیروی کی خاطر خواہ طور پر نہیں کی۔ جبکہ دائیں بازو کے گروہوں نے ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھا۔ اس لئے وہ بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔

ہمارے ہاں فنون لطیفہ پر تنقید ہوتی ہے۔ ادیب، فن کار، شاعر کبھی یہ بات نہیں کرتے کہ ادب میں عورت کی عکاسی کس طرح کی جاتی ہے۔ عوامی جگہوں پر کیا ہو رہا ہے۔ لوک کہانیوں، اشتہاروں، کارٹونوں، فیشن، تھیٹر کی امیجری کیا ہے۔ وہ آپ سے کیا کہتی ہے۔ آپ کی فلمیں کیا دکھاتی ہیں۔ شاکر علی چغتائی، اللہ بخش ہمارے ملک کے بڑے مصور ہیں۔ ہم ان پر ناز کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی قومی شناخت عورت کے جسم کے وسیلے سے بنائی۔ ٹیلی ویژن ڈراموں میں عورت کی کیا پہچان ہے۔ سب اپنے اپنے طریقوں سے عورت کے جسم کے وسیلے سے، ٹیلی ویژن ڈراموں میں عورت اور چادر کا پرچار کرتے ہیں۔

سیمرغ کے زیر اہتمام ''من گھڑت عورت'' کے عنوان سے ضیا کے دور میں ذرائع ابلاغ میں عورت کی عکاسی کے ضمن میں ٹیلی ویژن ڈراموں، فلم، اشتہارات پر تحقیقی مقالوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی گئی تھی۔ لالہ رخ نے اشتہارات پر تحقیق کی۔ اس کتاب کا

MashalBooks.org

سرورق تیار کرتے ہوئے لالہ نے اخبارات میں شائع ہونے والے فلموں کے اشتہاروں کو کمپوز کیا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے دعوے داروں کے عہد میں عورت کی عکاسی کچھ اس طرح تھی۔

جہاں مردانگی کے روایتی عکس کو فروغ دیا جاتا ہے وہاں عورتیں مرد ماڈلوں کے پیچھے کھڑی ہوتی ہیں اور غیر متحرک ہوتی ہیں۔

جب عورت بولتی ہے تو وہ غیر متحرک اور خالی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ایک تامل ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بمشکل چند الفاظ کہہ پاتی ہے۔

جب کبھی مرد اور عورت کے درمیان رابطہ ہوتا ہے تو مرد کو بطور محافظ یا ولی دکھایا جاتا ہے۔

اس زمانے میں سینما بورڈ کے عکس بے حد ڈرامائی ہو گئے تھے۔ عورت کے جسم کی عکاسی واضح ہو گئی تھی اور اس میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا۔ ان بورڈز کے ذریعے مردانہ تصورات، جو طاقت، جارحیت، تشدد اور جنس سے متعلق تھے تقویت پانے لگے۔

پاکیزہ اور نیک عورت کو بے بس اور جان نثار اور ہمیشہ التجا کی حالت میں دکھایا گیا۔

بدکردار عورت کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ ناچنے والی، جذبات کو مشتعل کرنے والی، مغرب زدہ عورت۔ چست پتلون، بغیر آستین کے بلاؤز، برہنہ کمر، آزاد خیال، بدکردار عورت، جس سے مردوں اور معاشرے کو خطرہ ہے مگر وہ عیاشی کی علامت ہے۔

لالہ رخ جب گزشتہ دس پندرہ برسوں پر نظر ڈالتی ہیں تو ایک اتنا سا اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ سنہ 1981ء سے پہلے عورت ایک ایشو نہیں تھی۔ کوئی اس کی بات نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ ہم ابھی پارلیمنٹ تک نہیں پہنچ پائے اور ہم امتیازی قوانین بھی ختم نہ کرا سکے لیکن ایک شور تو ہوا۔

لالہ کا تعلق لاہور کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ شادی نہیں کی۔ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں۔ ان کا سب سے قیمتی اندوختہ وہ تین ہزار تصویریں ہیں جو انہوں نے خواتین کی جدوجہد کے دوران بنائی ہیں۔

# مہناز رفیع

''جاگیردارانہ اور قبائلی سوچ، کلچر اور رسومات سے چھٹکارا پانے کے لئے معاشرے میں نئے فکری انقلاب کی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آزادانہ اور بااختیار طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا سامان پیدا کیا جائے گا۔''

مہناز رفیع کی آواز سب سے پہلے ریڈیو اور ٹی وی آرٹسٹ کی حیثیت سے ابھری تھی۔ برسوں تک وہ دور دور تک سنائی دیتی رہی لیکن سیاست میں آنے کے بعد زندگی کا مقصد واضح ہوتا گیا۔ مہناز رفیع نے حال ہی میں حکمران سیاسی پارٹی میں شرکت کی ہے، ورنہ اس سے قبل یحییٰ خان سے لے کر ضیاء الحق تک مہناز کی جدوجہد حزبِ اختلاف کی رکن کی حیثیت سے آمریت کے خلاف رہی ہے۔ انہوں نے اس تمام عرصے کے دوران اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے یہ باور کروایا ہے کہ ان کی تمام جدوجہد عورتوں کے حقوق کے لئے ہے۔ کئی برس تک ملک کے سیاسی میدان میں سرگرم عمل رہنے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ سیاسی جماعتوں میں خواتین کی حیثیت سیاسی مزارع جیسی ہے۔

پچاس سال گزرنے کے باوجود سیاسی سطح پر عورتوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔ ملک کے قوانین اور منصوبوں میں عورتوں کی سوچ کی عکاسی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ قوانین اور پالیسیاں جن کا عورتوں کی زندگیوں سے گہرا تعلق ہے ان کے بنانے میں بھی عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔

مہناز رفیع کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ وہ جاگیردار یا صنعت کار نہیں ہیں۔ انہوں نے اکثر اس خواہش کا ظہار کیا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ سیاست میں متوسط طبقے کی نمائندگی ہو۔ انہیں یہ اعتراف ہے اور فخر بھی کہ

آج کی پاکستانی عورتوں کی سوچ تعمیری ہے۔ وہ زندگی کے تمام بڑے شعبوں میں عملی اور علمی سطحوں پر سرگرم نظر آتی ہے لیکن عورتوں کے بارے میں سیاسی جماعتوں کا رویہ حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

مہناز کا کہنا ہے "عام انتخابات کے لئے سیاسی پارٹیاں ٹکٹ نہیں دیتیں۔ ان چند عورتوں کو چھوڑ کر جن کی موروثی سیٹیں ہیں باقی عورتوں کے لئے عام رائے یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس دولت اور سیاسی تجربہ نہیں۔ یہ رویہ خواتین کارکنوں کے لئے خاصا مایوس کن ہے۔"

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ معاشرتی پابندیوں کے باوجود جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے عورتوں نے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

مہناز رفیع اپنے سیاسی کیریئر کے دوران چھ بار جیل جا چکی ہیں۔ سب سے پہلی تحریک استقلال کے پلیٹ فارم سے حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے دوران 1977ء میں ہاؤس اریسٹ ہوئیں۔ پھر 1982ء سے 1983ء تک ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران تین دفعہ جیل گئیں۔ ایک بار ڈیڑھ ماہ جیل میں رہیں۔ 1994ء میں چار دن اور پھر 1995ء میں چار دن کی جیل کاٹی۔

مہناز رفیع کہتی ہیں کہ "جمہوریت کی ابتدا بلدیاتی اداروں سے ہوتی ہے۔ اس لئے عورتوں کی نمائندگی اس سطح پر بھی بہت ضروری ہے۔ ایک بار اس ضمن میں وزیراعلیٰ اور وزیر قانون سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ عورتوں کی نمائندگی پر اعتراض نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ عورتیں ملتی نہیں ہیں۔ یہ محض بیجا عذر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کارکن عورتوں سے بھری ہوئی ہیں لیکن انہیں موقع نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی مرد کونسلر اپنے علاقے میں سڑک بنواتا ہے یا کوئی مرکز قائم کرتا ہے تو اس کے نام کی بڑی سی تختی لگا دی جاتی ہے۔ کبھی ایسی تختی دکھائی نہیں دی جس پر عورت کا نام ہو اس لئے اس کی کارکردگی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

مہناز رفیع کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب سے وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئی ہیں مسلم لیگی عورتوں میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ اس سے قبل وہ کبھی سڑکوں پر دکھائی نہیں دیں۔ اب وہ مہناز رفیع کی قیادت میں اہم موقعوں پر سڑکوں پر نکل آتی ہیں۔

مہناز رفیع لکھنؤ کے ایک نواحی مقام پر پیدا ہوئیں۔ انہیں سیاسی تربیت اپنے والد سے ملی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے مدرسۃ البنات سے ابتدائی تعلیم کے بعد گلبرگ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ والدہ کے انتقال کی وجہ سے انہیں مجبوراً تعلیمی سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ ریڈیو کے ساتھ طویل وابستگی کے علاوہ مہناز رفیع کا شمار پاکستان ٹیلی ویژن کے بانی ارکان میں ہوتا ہے۔ وہ خواتین محاذِ عمل کے ساتھ جمہوریت کی بحالی اور عورتوں کے خلاف بنائے گئے قوانین کو ختم کرنے کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہیں۔ مہناز کے سیاسی مضامین اکثر اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے روس، امریکہ، چین، فلپائن اور دیگر ممالک میں عورتوں کے حقوق کے ضمن میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ کئی مواقع پر جب پاکستانی عورت کی معاشرتی اور آئینی حیثیت کا ذکر ہوا تو نہوں نے عورتوں کی جدوجہد اور مختلف تنظیموں کے کردار کے بارے میں بھی دنیا بھر کے نمائندوں کو آگاہ کیا کہ ہمارے ہاں کی عورت کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔

مہناز رفیع کے شوہر کا تعلق تعلقاتِ عامہ کے شعبے ہے۔ ان کے تین بچے ہیں۔

# کوثر۔ایس۔کے

بدھ 12 اکتوبر 1983ء کو کراچی پریس کلب میں ''عورتیں اور جمہوریت'' کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔

کوثر ایس کے ویمنز ایکشن فورم (WAF) کے کراچی میں پہلے اجلاس میں شامل تھیں۔

کوثر نے لکھا: ''عورتیں اور جمہوریت کے موضوع پر ہونے والے اجلاس میں ویف کی جانب سے عورتوں کی دیگر تنظیموں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ یہ اجلاس دراصل ایک لمبی سڑک پر چھوٹا سا قدم تھا کہ عورت کی مظلومیت کو یکسر ختم نہیں کیا جا سکتا۔محکومی کی ہر دیوار کو گرانے کے لئے مردوں اور عورتوں کا باہمی اتحاد لازمی ہے۔''

فیمی نزم کا یہی مسلک ہے، سرگرمیاں جاری رہیں، گزشتہ پندرہ برس کے دوران عورت کو ایک انسان کی طرح منوانے، اس کے انسانی اور قانونی حقوق دلانے، اس کی معاشرتی زنجیروں کو توڑنے، اس کی خاموشی توڑنے، معاشرے میں اس کو باعزت مقام دلانے کے لئے جدوجہد کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔

''17 جنوری 1997ء کو کوثر ایس کے کا ایک مضمون شائع ہوا۔عنوان تھا خاموشی اور تشدد کی ثقافت۔''

کوثر کا سوال ہے: ''مرد عورتوں کو کیوں کنٹرول کرنا چاہتے ہیں؟ چاہے وہ طالبان ہوں جو عورتوں کو برقع پہناتے اور گھروں میں بند کرتے ہیں۔ چاہے وہ سعودی عرب ہو یا ایران جنھوں نے عورت پر حجاب اور دیگر پابندیاں عائد کیں۔ چاہے وہ صائمہ کا باپ ہو جس نے بیٹی کی پسند کی شادی کی شدید مخالفت کی یا وہ جسٹس چیمہ ہوں جنھوں نے ولی کے کنٹرول کا شوشا چھوڑا۔

اکتوبر 83ء سے جنوری 97ء تک کی تمام تر تگ و دو کے بعد پاکستان کی عورت سوال اٹھاتی ہے۔ سوال کا جواب مانگتی ہے۔ حکمرانوں سے اور معاشرے کے ٹھیکے داروں سے، ریاست کے والیوں سے۔

لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔

کوثر کہتی ہیں، ناکامی کا احساس نہیں البتہ تھکن اور تکلیف کا احساس ہے کہ اتنی جدوجہد کے بعد ہم عام رویوں میں مثبت تبدیلی نہ لا سکے۔ حکومتی سطح پر امتیازی قوانین کو ختم کرنے کی پیش رفت نہیں ہوئی۔ پہلے سب کچھ واضح تھا، ہماری جنگ آمریت کے خلاف تھی۔ لیکن جمہوریت کی بحالی کے بعد سب کچھ مبہم ہو گیا ہے۔

کوثر کو بھی اپنی ہم عصر ساتھیوں کی طرح شکایت ہے کہ ہماری نئی نسل میں رضا کارانہ کام کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ البتہ انہیں کسی تحقیقی منصوبے یا ترقیاتی کاموں کے لئے ملازمت مل جائے تو خوشی خوشی کرتے ہیں۔

کوثر ایس کے کے والد بینکر تھے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ کوثر کا بچپن چھوٹے شہروں اوکاڑہ، ملتان اور لاڑکانہ وغیرہ میں گزرا۔ جب وہ آٹھویں میں تھیں تو والد کراچی آ گئے۔ انہوں نے سینٹ جوزف کالج سے بی اے اور کراچی یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد میک ماسٹر یونیورسٹی ہملٹن اونٹاریو کینیڈا سے بھی فلسفے میں ایم اے اور مذہبیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ اس دوران کوثر نے بدھ ازم اور ہندو ازم کو بھی پڑھا، جبکہ پی ایچ ڈی میں ان کا موضوع مغربی فکر اور معاشرہ تھا۔

''میں پی ایچ ڈی کا اپنا تھیسز جمع کروا کر پاکستان واپس آئی تو پھر اس کی تصریح کرنے کینیڈا نہیں گئی۔ کیونکہ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے پاکستان میں رہنا ہے۔

کوثر جب خواتین کی سرگرمیوں میں مصروف ہوئیں تو وہ ان دنوں شرکت گاہ کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔

''اصل معنوں میں عمل کا دور اس وقت آیا جب ضیا کے عہد میں عورتوں کے حقوق پر زد پڑی اور عورتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئیں۔''

ان اجلاسوں کے دوران ہی کوثر کی ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوئی جو کچی آبادیوں میں کام کرتی تھیں۔ کوثر ان کے کاموں میں شریک ہونے لگیں۔ اس کے بعد یعنی

تقریباً تیرہ سال قبل وہ آغا خان یونیورسٹی کے کمیونٹی ہیلتھ سائنسز کے شعبے کے ساتھ منسلک ہوگئیں۔ دراصل یہ ایسا کام تھا جو ان کے ایکٹوزم اور وسیلہ روزگار کو یکجا کرتا تھا، اس لئے وہ ان کے لئے خاصا اطمینان بخش تھا لیکن ان تمام برسوں میں کوثر ایس کے نے تحریک کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اگر کسی موقع پر سڑکوں پر نکل کر احتجاج ضروری ہوا تو کوثر اس میں شامل تھیں۔ اسی طرح بیجنگ کانفرنس کے عمل میں بھی خاصی سرگرم عمل رہیں۔

ویف کی ارکان نے کچھ عرصے سے کراچی کے فسادات میں متاثرہ خاندانوں کی عورتوں اور بچوں کے لئے امدادی کام کئے جس کا اولین مرحلہ ان عورتوں کی زبانی ان کی کہانی سننے کے لئے نشستیں ہوتی تھیں۔ ان کا ریکارڈ رکھنا اور صورتِ حال کا تجزیہ کرنا اس کا کام تھا۔ شہری بدامنی سے نہ صرف جانی نقصان ہوتا ہے بلکہ اس سے اقتصادی صورت حال بگڑ جاتی ہے اور بچوں کی تعلیم کوش دید نقصان پہنچتا ہے۔ کوثر اس کام میں بھی شریک رہیں۔

آغا خان یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد کوثر کی کارکردگی کی طویل فہرست ہے۔ زیادہ تر کام صحتِ عامہ کے حوالے سے کئے گئے جن میں کچی آبادیوں، صحت اور غذا کے بارے میں ویڈیو فلمیں بنانا شامل ہیں۔ انہوں نے اندرون ملک منعقد ہونے والی ورکشاپس اور کانفرنسوں کے علاوہ جنیوا، فلپائن، امریکہ، بنگلہ دیش، ڈنمارک، چین، کینیا میں مختلف موضوعات پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ طالب علمی کے زمانے میں سپورٹس میں کپ اور سرٹیفکیٹس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے پر طلائی تمغہ لیا۔ کے ایم سی میرٹ سکالرشپ، میک ماسٹر بنی فیکٹرز سکالرشپ اور یونائیٹڈ نیشنز یونیورسٹی فیلوشپ حاصل کی۔

کوثر نے شادی کی لیکن ڈیڑھ سال بعد طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد یہ معاملہ ثانوی حیثیت میں چلا گیا۔

# نجمہ صادق

''جب سول معاشرے نے جنگل کے سردار کو خفا کر دیا'' نجمہ صادق کا یہ مضمون سنہ 1997ء کے دوسرے نصف میں ایک اخبار میں شائع ہوا جو ایک خبر کے حوالے سے ہے کہ کان وادی کے قصبے جرید میں ایک ترقیاتی ادارے پر، جو مقامی عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل ہے، یہ الزام لگایا ہے کہ عورتوں کے یہ پروگرام غیر مہذب ہیں اور فحاشی پھیلاتے ہیں۔ اگر نہیں فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو خون خرابہ ہوسکتا ہے۔

نجمہ صادق کی تحقیق کو متحرک کرنے کے لئے ٹمبر مافیا کی یہ دھمکی کافی تھی۔ انہوں نے وہ تمام حقائق گنوا دیئے کہ پہاڑی علاقوں میں مختلف تنظیموں کی جانب سے چلائے گئے ترقیاتی منصوبے جنگلات کے خود ساختہ مالکوں کے مفاد کو کس طرح نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان علاقوں کے غریب عوام ایک طرف غیر سرکاری تنظیموں کے تحت پہنچائی جانے والی بنیادی سہولتوں سے خوش ہیں لیکن وہ صدیوں پرانے جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے، اس لئے وہ سمجھوتے پر اتر آتے ہیں۔ ''ان کی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی'' نجمہ کے قلم سے تاسف کی یہ سطر ٹپکی۔

نجمہ صادق گزشتہ کئی برسوں سے کراچی میں مقیم ہیں لیکن ان کا بچپن اور تعلیم کا زمانہ ڈھاکہ میں گزرا۔ انہیں یاد ہے۔

''یہ غالباً 1960ء کے عشرے کا ذکر ہے۔ میں ڈھاکہ سے کراچی آ رہی تھی۔ ایئر لائن میں ایئر ہوسٹوں کی نئی یونیفارم کا اجرا ہونے والا تھا لیکن ان کا رویہ اور سروس بہت خراب تھی۔ میں نے ڈھاکہ کے ایک اخبار میں ایڈیٹر کے نام خط لکھا۔ وہ ایک طویل خط تھا جسے ایک مضمون کی صورت میں شائع کیا گیا۔ میرا یہ مضمون اس روز شائع ہوا جب فرانسیسی ڈریس ڈیزائنر کے تیار کردہ یونیفارم کے فیشن شو کا انعقاد ہو رہا تھا۔''

سنہ 1973ء سے صحافت نجمہ کا وسیلہ روزگار ہے۔ ان تمام برسوں میں انہوں نے سماجی، اقتصادی ماحول اور خواتین کے علاوہ دیگر بے شمار موضوعات پر لکھا۔ نجمہ فطری طور پر ''اینٹی اسٹیبلشمنٹ'' ذہن کی مالک ہیں۔ کاغان وادی کے جھگڑے پر حکومت کی جانب سے قانون نافذ کرنے والوں کی کارروائی پر انہوں نے لکھا کہ ''کیا یہ مسائل کا حل ہے؟'' اسی طرح سابقہ حکومت کے دوران جب وزیراعظم وقت منیلا میں ماحولیات کی ایک کانفرنس کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی تھیں تو نجمہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں ''مادام وزیراعظم! آپ نے ماحول کی بہتری کے لئے بہت مفید باتیں کی ہیں لیکن آپ کے اپنے ملک میں جو میرا بھی ملک ہے، ایسے ترقیاتی منصوبے بنائے جا رہے ہیں جو ماحولیاتی ابتری کا باعث ہیں۔''

نجمہ کا کہنا ہے ''میرا ایکٹوازم 1975ء سے شروع ہوا۔ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان کے ہر بڑے شہر سے خواتین جمع تھیں۔ اس موقع پر طے پایا کہ خواتین کی معاشی ترقی کے لئے بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح خواتین کے ایک چھوٹے سے گروہ نے مل کر ''شرکت گاہ'' بنائی جس کے تحت عورتوں کو درپیش مسائل پر بات ہونے لگی اور ہم ایک پریشر گروپ کے طور پر کام کرنے لگے۔

نچلے طبقے کی عورتوں کو اقتصادی قوت دینے کے لئے شرکا گاہ کے تحت سب سیپ ہلے ''کھدر پراجیکٹ'' پر کام کیا گیا۔ کراچی کے علاقے لانڈھی میں عورتیں کھدر بنتی تھیں اور تیار شدہ کپڑے کو مرد بازار لے جا کر فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ فیشن بدلا اور لوگوں کی ترجیحات بدلیں تو کھدر کی مانگ تقریباً ختم ہو گئی۔ اس موقع پر اس پیشے سے منسلک خاندانوں کو اقتصادی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔ مرد کھدر کا کام چھوڑ کر دوسری ملازمتیں تلاش کرنے لگے۔ عورتیں بیکار ہو گئیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح اس روایت کو زندہ رہنا چاہئے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے مالی تعاون حاصل کیا اور عورتوں کو دھاگہ فراہم کیا کہ وہ اپنا کام از سر نو شروع کر دیں۔ وہ کھدر بناتی تھیں اور ہم اسے فروخت کرتے تھے۔ کھدر کے کپڑوں میں جدت پیدا کرنے کے لئے ماہرین کا تعاون بھی حاصل ہوا۔

اسی دوران عورتوں کے خلاف وضع کئے گئے امتیازی قوانین کی رو سے فیصلے دیئے جانے لگے۔ نجمہ صادق اور شرکت گاہ کی دوسری ساتھیوں نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ اب یہ

وقت ہے کہ آمریت کے خلاف قدم اٹھایا جائے۔ لیکن یہ کام صرف ایک تنظیم کے بس میں نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ وسیع بنیاد پر خواتین کو کیسے متحرک کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ملک بھر کی خواتین کی مختلف تنظیموں سے رابطہ کیا گیا کہ وہ سب اپنے اپنے حلقے میں اپنے اپنے انداز میں ان امور پر کام کریں۔ اس طرح ویمنز ایکشن فورم کا قیام عمل میں آیا۔ یہیں سے پاکستان خواتین کی ایکٹوازم کا نیا دور شروع ہوا۔

1988ء میں جب فوجی حکومت کی آمریت عروج پر تھی اور عوام کا صبر انتہا کو پہنچ چکا تھا، بہت نئی تنظیموں کے پلیٹ فارم سے احتجاجی اور مزاحمتی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ نجمہ صادق نے اپنے مقالے ''طاقت کی بے چارگی'' میں لکھا:

''عسکری نظام کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد بہت ہی تنگ مرکزی حاکم اور ماتحتوں کی اندھی فرمانبرداری پر ہوتی ہے تاکہ یہ معلوم کرنا ممکن نہ ہو کہ وہ کس بات کے لئے جنگ لڑ رہا ہے۔''

''دنیا بھر میں اس مفروضے کو پھیلایا گیا کہ عسکری نظام امن اور تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، جبکہ اس کے برعکس آج کی جمہوری دنیا میں وہ پسندیدہ نہیں خیال کیا جاتا، کیونکہ جنگیں، تصادم دشمنیاں اور سرد جنگیں اسی کی پیداوار ہیں۔ عوام کبھی جنگ کی پیش قدمی نہیں کرتے۔ نہ ہی یہ حکومتوں اور فوج کا اجتماعی فیصلہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ افراد ہیں، ایک لیڈر یا طاقت ور گروپ ہے جو جنگ کرواتا ہے۔ انہیں ایسی تباہ کن طاقت نہیں ملنی چاہئے۔ یہ حق لوگوں کو واپس ملنا چاہئے۔''

نجمہ ہمیشہ سے اپنی والدہ کی شخصیت سے متاثر ہیں۔ وہ اس واقعے کو یاد کرتی ہیں جب ان کے نانا بنگال کے ایک علاقے میں گئے تو پتہ چلا کہ وہاں لڑکیوں کا کوئی سکول نہیں ہے۔ اس زمانے میں مسلمان لڑکیاں تعلیم حاصل نہیں کرتی تھیں۔ یہ 1935ء کا قصہ ہے۔ نانا نے وہاں لڑکیوں کا ہائی سکول بنوایا۔ نجمہ کی والدہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے پی ایچ ڈی کیا۔ وہ ڈھاکہ میں پروفیسر رہی ہیں۔ نجمہ کے شوہر کا خاصا عرصہ پہلے انتقال ہوگیا ہے۔ ان کے دو بچے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دونوں برسر روزگار ہیں۔

عورتوں کو اقتصادی طور پر طاقت ور بنانے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے نجمہ کا کہنا ہے ''ہر عورت جو روزی کماتی ہے اس کی صرف دو وجوہات ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ وہ اپنی کفالت کرتی ہے دوسرے وہ دوسروں کی مدد کرتی ہے لیکن اس کی راہ میں بہت ساری معاشرتی رکاوٹیں آ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنا ضروری ہے لیکن افسوس ہے کہ عورتوں کے ایشوز پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ ایسے موضوعات پر لکھنا صرف خاتون صحافیوں کا ہی کام نہیں، مرد صحافیوں کیوں نہیں لکھتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ خود صحافیوں کا یک بہت بڑا گروہ عورتوں کی ترقی کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مسائل عورتوں کو متاثر کرتے ہیں، چاہے وہ مسلح جنگیں ہوں، غربت ہو، تعلیم کی کمی ہو، صحت کا مسئلہ لیکن حکومتوں نے ان امور پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ پچاس سال گزر جانے کے باوجود عوام کو بنیادی سہولتیں فراہم نہیں کی گئیں۔ ملک میں جو ترقیاتی کام ہوئے وہ اس ملک کی 20 فیصد آبادی کے لئے تھے۔ ہمارے ہاں وسائل کی تقسیم نامناسب اور غیر مساویانہ ہے۔ معیشت کو کیسے چلایا جائے؟ یہ بات عوام کو نہیں بتائی جاتی، بلکہ ان سے چھپائی جاتی ہے۔ معلومات چھپا کر عوام کو بے دست و پا بنا دیا جاتا ہے۔ جس طرح تعلیم ضروری ہے اسی طرح ملکی معیشت کی سوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔

نجمہ صادق نے عالمی معیشت پر اپنے مضمون میں ان امور کا احاطہ کیا ہے کہ بڑی طاقتیں دنیا کو کیسے چلاتی ہیں اور ہم کیوں غریب ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے نتیجے میں بھوک، افلاس اور بیروزگاری جنم لیتی ہے۔ اس لئے معاشی حقوق کو کس طرح انسانی حقوق سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک سوال تھا: دنیا بھر میں پیدا ہونے والا غلہ کون کھاتا ہے؟

جواب: ''زیادہ تر خوشحال لوگ اور مویشی۔ دنیا کا تقریباً 40 فیصد غلہ شمال کے مویشیوں کو کھلا دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مالدار ممالک صرف اپنے مویشیوں کو اس سے زیادہ غلہ کھلا دیتے ہیں جتنا تمام غریب ملکوں کے انسانوں اور مویشیوں کو مجموعی طور پر کھانے کو ملتا ہے۔''

نجمہ کی دلچسپی معاشی ایشوز کے ساتھ بدستور ہے۔ وہ اس پر مزید تحقیق کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ ان کی خواہش ہے کہ وہ اس موضوع پر انٹرنیٹ پر آئیں تا کہ ان مسائل پر دنیا بھر میں جو کام ہو رہا ہے اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

MashalBooks.org

# طاہرہ عبداللہ

’’ہر سال نصف ملین عورتیں حمل یا بچے کی پیدائش کے وقت مر جاتی ہیں۔ ان عورتوں میں تقریباً سب کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہے۔‘‘

’’دنیا بھر میں 780 ملین افراد کو دیرینہ طور پر کم غذا میسر ہے۔ گزشتہ 20 برسوں کے دوران غیر صنعتی ممالک میں غذا کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے لیکن آبادی کے تیزی سے بڑھنے کی صورت میں غذا کی فراہمی کی صورت حال جوں کی توں ہے۔‘‘

طاہرہ عبداللہ جس بین الاقوامی ادارے کے ساتھ منسلک ہیں اس کا بنیادی مقصد آبادی کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے، تاکہ وسائل اور ضروریات میں توازن پیدا ہو سکے۔ لوگوں کو غذا اور دیگر بنیادی سہولتیں بہتر طور پر میسر آئیں تاکہ وہ صحت مند زندگی گزار سکیں۔ ان کے طرز حیات اور معیار حیات میں خوشگوار تبدیلی لائی جا سکے۔

یہ کام طاہرہ عبداللہ کا وسیلہ روزگار ہے۔ ان کی خود مختار زندگی کا مضبوط سہارا ہے۔

کچھ برس پہلے اسلام آباد میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس شام ہمارے ملک کے ایک مقبول اور ممتاز شاعر بھی مدعو تھے۔ شاعر نے عورت کی تعریف میں اشعار سنانے شروع کئے تو حاضرین میں سے ایک احتجاجی آواز بلند ہوئی۔ ’’معاف کیجئے گا، یہ عورتوں کا عالمی دن ہے۔ اس دن عورتیں اپنے حقوق کی بات کرتی ہیں اور وہ معاشرے میں اپنا درجہ بڑھانے کے مطالبے کو دوہراتی ہیں۔ آپ کے یہ رومانوی اشعار جس میں عورت کے حسن کی تعریف کی گئی ہے، اس دن کی توہین کرتے ہیں۔‘‘

یہ آواز طاہرہ عبداللہ کی تھی۔ یہ ایک فیمی نسٹ اور عورتوں کے حقوق کے لئے ایک

سرگرم عمل ایکٹوسٹ کا احتجاج تھا۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ طاہرہ کو مردوں سے نفرت ہے۔ انہیں مرد کی صدیوں پرانی سوچ سے شکایت ہے جس کے نزدیک عورت کی حیثیت جنسی علامت سے زیادہ نہیں ہے۔ انہیں وہ عورت کی شخصیت میں انسان نہیں بلکہ محض جھیل جیسی آنکھوں، گھٹا جیسے گیسو، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور دیگر جسمانی خدوخال کا مرقع نظر آتی ہے۔ وہ عورت کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ بے خبر ہیں عورت کے اس مقام سے جسے ملکی قانون، اقتصادی تقسیم، انسانی حقوق اور سیاسی صورت حال متعین کرتی ہے۔

لیکن وہ عورتوں کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بھی خلاف ہیں کہ عورتیں معاشرے کے بڑے دھارے سے کٹ کر اپنے حقوق حاصل نہیں کرسکتیں۔ جو طرزِ عمل بعض ترقی یافتہ ممالک نے اپنایا ہے وہ اس کے بھی خلاف ہیں۔ یعنی مرد، عورت کے نزدیک دشمن ہے جو اس کا استحصال کرتا ہے۔ اس پر تشدد کرتا ہے۔ ان عورتوں نے جینڈر یعنی صنفی مسائل کا حل لیزبین ازم (Lesbianism) میں تلاش کیا۔

طاہرہ کہتی ہیں ''یہ کہنا غلط ہے کہ ہم مردوں کے بغیر جی لیں گے، ہمیں اب مردوں کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ یہ جنگ مرد اور عورت کے درمیان نہیں بلکہ یہ جنگ دو طبقوں کی جنگ ہے۔ غیر مساوی اقتصادی نظام کے خلاف جنگ ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک طرح کے سیاسی حالات سے یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں۔''

''لیکن'' طاہرہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہم مردوں پر ایک چھڑی کی طرح انحصار نہیں کرنا چاہیئے۔ تاہم جب تک مرد شانہ بشانہ ہماری جدوجہد میں شامل نہیں ہوں گے ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عورت کے بارے میں مرد کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئے۔ وہ یہ تسلیم کریں کہ عورتیں محروم طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ذہنی طور پر تیار ہوں کہ اسے اختیار کر دینا ہے۔''

یہ اختیار اسے اس وقت مل سکتا ہے جب اسے وراثت میں سے حصہ دیا جائے۔ اس کے مالکانہ حقوق ہوں۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایک عورت پورا مہینہ فیکٹری میں محنت و مشقت کرتی ہے۔ گھر داری اور بچوں کی ذمہ داری اٹھاتی ہے۔ شوہر کے جنسی مطالبے پوری کرتی ہے اور مہینے کے آخر میں اسے جو تنخواہ ملتی ہے وہ شوہر لے لیتا ہے۔

MashalBooks.org

طاہرہ عبداللہ کا تعلق اس نسل سے ہے جس کے شعور کو مارشل لاء نے جھنجھوڑا تھا۔ جب پاکستان میں عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین وضع کیے گئے اور طاہرہ کہتی ہیں ''ہم نے اس وقت اس قدر موثر انداز میں تحریک چلائی، اتنا شور مچا دیا کہ اگر ان قوانین کو روک نہیں سکے تو معاملہ ایک حد تک دب ضرور گیا تھا۔

طاہرہ عورتوں کے لئے کوٹہ مختص کرنے یا ان کے لئے الگ خانے بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ عورتوں کی الگ وزارت سے بھی اتفاق نہیں کرتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کے مسائل بھی اسی طرح حل ہونے چاہئیں جس طرح ملک کے سب عوام کے۔ انہیں ملکی ترقی کے بڑے دھارے میں شامل کیا جائے اور ہر ایک کو میرٹ کے اعتبار سے موقع فراہم کیا جائے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب آبادی کا ایک حصہ واضح طور پر پسماندہ ہو تو اس کے لئے میدان ہموار کرنا ضروری ہے۔

طاہرہ مارشل لاء کے زمانے میں اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ''ہمارے لئے کسی تحریک کو چلانا بہت مشکل تھا کیونکہ پرنٹ میڈیا پر سنسر شپ تھی اور الیکٹرانک میڈیا مکمل طور پر سرکار کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے ہم نے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے سٹریٹ تھیٹر اور دیگر ذرائع اختیار کیے۔

''ہم پر اپنی ماؤں اور نانیوں کا قرض ہے۔ ہمیں وہ اتارنا ہے۔ ہماری ماؤں نے تحریک پاکستان میں بھرپور طور پر شرکت کی۔ اب پاکستان کے عورتوں کو پسماندگی سے نکالنا اور انہیں حقوق دلانا ہمارا فرض ہے۔''

طاہرہ نے ابتدائی تعلیم مالٹا میں حاصل کی۔ پھر لبنان اور لیبیا میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ اسدوران کالج کے جریدے ''راوی'' کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ پوسٹ گریجویشن کی تعلیم امریکہ اور کینیڈا سے حاصل کی۔

طاہرہ کو احساس ہے کہ ہمارے ہاں اکیلی عورت کا زندگی گزارنا محال ہے جبکہ بیرون ملک یا ترقی یافتہ ممالک میں اس امر کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ عورت طبعی اور جذباتی طور پر مرد سے مختلف نہیں ہے۔ وہاں 50 فیصد عورتیں اکیلی رہتی ہیں اور اسے غیر معمولی بات نہیں سمجھا جاتا۔

''دنیا بھر میں'' طاہرہ کہتی ہیں ''پاکستانی عورت کا تاثر یہ ہے کہ وہ بہت پسماندہ

ہے۔ اس لئے کبھی باہر جانے کا اتفاق ہوتو وہ لوگ کہتے ہیں، تم ایک پڑھی لکھی، مضبوط اور روشن خیال عورت ہو۔ وہاں تمہارا گزارا کیسے ہوتا ہے۔''

MashalBooks.org

# شگفتہ علی زئی

بیجنگ کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستانی عورتوں کی ایک بڑی کھیپ جہاز میں سوار تھی۔ ایئر لائن کی اس خصوصی پرواز میں وسطی ایشیا کی خواتین کا ایک گروہ بھی شامل تھا۔ مائیک پر آواز آئی: ''ہیپی برتھ ڈے شگفتہ علی زئی'' اور پھر شگفتہ کی سالگرہ کا کیک مسافر خواتین میں تقسیم کیا گیا۔

ایک خوشگوار لمحہ، خوبصورت احساس۔

شگفتہ نے زندگی کا یہ رنگ اپنی محنت سے، اپنی لگن سے کمایا تھا۔ جب لاہور، کراچی، اسلام آباد میں بیجنگ کانفرنس کے سلسلے میں قومی کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں تو شگفتہ کے چہرے پر دن رات کی مصروفیات کی تھکن نظر آتی تھی۔ ان دنوں وہ ایم۔ ایف۔ یو جو کانفرنس کے ضمن میں تشکیل دیا گیا تھا، کی کوآرڈینیٹر تھیں۔ گویا پاکستان بھر سے بیجنگ کانفرنس میں شرکت کرنے والی منتخب خواتین کے سفری انتظامات، ان تک ضروری معلومات پہنچانا، بیجنگ میں ان کی رہائش کا بندوبست کروانا، ان تمام کاموں کی ذمہ داری شگفتہ پر تھی اور انہوں نے اس کام کو بڑی مستعدی اور قابلیت کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ انہیں اس کام کے اولین مرحلے میں ملک کی سرگرمِ عمل تنظیموں کا تعاون حاصل ہوا۔ لیکن حکمتِ عملی وضع کرنا، پاکستان کی قومی رپورٹ کی تیاری، چوتھی عالمی کانفرنس میں زندگی کے ہر شعبے سے پاکستانی عورتوں کی نمائندگی ایک دقت طلب کام تھا۔ شگفتہ ان تمام مراحل سے بڑی بردباری کے ساتھ گزری تھیں۔

شگفتہ علی زئی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا لیکن ایسا کرنا ان کی کوئی دیرینہ خواہش نہ تھی۔ ایک روز اخبار میں شادی کا اشتہار پڑھا۔ عجب سا لگا کہ ہمارے ملک میں لڑکے کے لئے رشتے کا اشتہار آتا ہے تو جہیز کی شرط لگائی جاتی ہے۔

MashalBooks.org

وہ سینٹ جوزف کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد فارغ تھیں۔ایک ماہنامے کے دفتر میں جا کر ایڈیٹر سے کہا کہ آپ شادی دفتروں پر ایک فیچر شائع کریں۔ یہ ایک کاروبار بن گیا ہے جس میں کچھ غیر ذمہ دار افراد بھی ملوث ہیں اور لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے آرزومند والدین ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ ایڈیٹر نے کہا کہ یہ فیچر آپ بنالائیں۔ مناسب لگا تو شائع ہو جائے گا۔ چنانچہ فیچر بنا اور وہ ایک موقر ماہنامے کی لیڈ اسٹوری تھی۔ شگفتہ صحافت کے داخلی دروازے سے گزر کر اپنے لئے ایک راستے کے انتخاب کی دھن میں تھیں اور پھر تحقیقاتی رپورٹنگ کو اپنایا۔ اس کے ساتھ وہ ویمنز ایکشن فورم کی رکن بھی تھیں، جس کے تحت خواتین کے لئے امتیازی قوانین کے خلاف تحریک پر زوروں پر تھی۔ شگفتہ نے اس جدوجہد میں اپنا کردار صحافت کے راستے سے ادا کیا۔ انہوں نے ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد میں جیلوں میں عورتوں کی حالت، نابالغ بچوں کی جیلیں، کاروکاری اور عورتوں کے دیگر مسائل، معاشرے میں ان کے مقام ان کے ساتھ ناروا سلوک پر مضامین لکھے جو ملک کے بڑے اخباروں میں شائع ہوئے۔ پھر ایک ماہنامے کی ادارت بھی کی۔

شگفتہ علی زئی فطرتاً باغی نہیں ہیں۔ وہ فیمی نسٹ ہیں لیکن مرد ذات سے نفرت نہیں کرتیں۔ شادی شدہ ہیں اور عائلی زندگی خوشگوار ہے۔ شوہر ان کی سرگرمیوں میں تعاون کرتے ہیں، جیسے لندن کے ایک صحافی یاسمین علی بھائی براؤن نے لکھا تھا کہ ترقی پذیر ملکوں کی عورتیں مردوں کے تشدد کے خلاف احتجاج تو کریں گی لیکن انتہائی قدم نہیں اٹھائیں گی۔ شگفتہ میانہ روی کے حق میں ہیں۔

ان کے خیال میں ہمیں اپنے ماحول اور اپنی ثقافتی اقدار کے مطابق اپنی شناخت برقرار رکھنی ہے۔ اگر کینیڈا میں نہیں برقعے میں ڈھکی چھپی عورتوں کو دیکھ کر ثقافتی دھچکا لگتا ہے تو ہمیں بھی فرانس کے ساحلوں کے انسانی مناظر پر ثقافتی دھچکا لگتا ہے۔

1985ء میں نیروبی میں منعقد ہونے والی عورتوں کی تیسری عالمی کانفرنس میں شگفتہ نے بطور فری لانس جرنلسٹ شرکت کی تھی۔ انہیں عالمی تناظر میں اپنے ہاں کی عورت کے مسائل اور محدود وسائل کا احساس ہوا۔ دس سال بعد بیجنگ کانفرنس کے بعد اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس میں شگفتہ علی زئی نے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستانی عورتوں کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے امکانات اور سرکاری سطح پر کیے جانے والے اقدامات کے

بارے میں پراعتماد ترجمان کا کردار ادا کیا تھا۔

شگفتہ نے اپنے ایک مضمون میں اس جوان لڑکی کا حوالہ دیا تھا جو محبت کی شادی کرنے کی پاداش میں اپنے شوہر کے ہمراہ حدود آرڈیننس کے تحت جیل کاٹ رہی تھی۔ حدود آرڈیننس آج بھی بدستور قائم ہے جس کے تحت ملک کی بے شمار بے گناہ عورتیں جیل کی سزا کاٹ رہی ہیں۔ لیکن یہ تو نہیں ہوا کہ باشعور اور باضمیر آوازیں خاموش رہیں اور کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ کسی بھی نظام میں انقلابی تبدیلی لانے کے لئے احتجاجی آوازیں اور تحریریں پہلا چراغ جلاتی ہیں۔

شگفتہ علی زئی نے سندھ کی فرسودہ روایت کاروکاری کے خلاف قلم اٹھایا۔ عورت کی مظلومیت کے حق میں آواز بلند کی۔ وہ اس پر یقین رکھتی ہیں کہ عورت کو محض ایک علامت خیال نہ کرو۔ اس پر پدر شاہی مسلط نہ کرو۔ اسے بھی انسان خیال کرو۔ آؤ کہ ہم ایک دوسرے کی بات سنیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شگفتہ نے ایم۔ ایف۔ یو سے پہلے شرکت گاہ میں بطور کوآرڈینیٹر کام کیا۔ آج کل وہ یونی سیف کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ پاکستانی عورتوں کے صحت اور تولیدی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے اس ادارے نے نمایاں قدم اٹھائے ہیں۔ بیجنگ کانفرنس میں جن بارہ توجہ طلب امور کی نشاندہی کی گئی تھی ان میں صحت اور تولیدی صحت بھی شامل تھی۔ ایک ایکٹوسٹ ہونے کی حیثیت سے شگفتہ علی زئی کا موجودہ کام خاصا تسکین بخش ہے۔ لیکن ان کا ارادہ یہی ہے کہ جب کبھی موقع ملا وہ عملی صحافت کی طرف لوٹ آئیں گی کیونکہ پرنٹ میڈیا میں عورتوں کے ایشوز پر خاطر خواہ طور پر نہیں لکھا جا رہا اور وہ اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنا فرض ادا کرنا چاہتی ہیں۔

# شہناز احمد

''ایک طویل جدوجہد ہے۔ بے شمار مسائل ہیں۔ آئے دن ایک نیا ایشو کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے صائمہ وحید کا کیس۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اس پر لگ جاتے ہیں۔ خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے۔ مارشل لاء دور میں جمہوریت کے لئے لڑ رہے تھے لیکن پھر جمہوری آمریت کے خلاف آواز اٹھانی ضروری تھی۔

اسمبلیوں میں عورتوں کی سیٹوں کی بحالی کا معاملہ ہے۔ عورت کے خلاف تشدد کا مسئلہ ہے۔ ملکی معیشت میں عورت کے کردار کی پہچان کا مسئلہ۔ مرد کی بالادستی اور عورت کی محکومیت کی بنا پر قائم کئے گئے سماجی رشتوں میں مثبت تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ان تمام مسائل پر طویل مباحثہ کی ضرورت ہے۔ ہم مردوں سے کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ہم بھی ہیں آپ بھی ہیں۔ چلیں مل کر بات کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ صرف آپ کہیں اور ہم سنتے رہیں۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کی بات سننی ہوگی۔''

شہناز احمد کی باتیں۔

شہناز احمد کو ''ویف'' نے تحریک دی۔ اس وقت اس ملک گیر تنظیم کا نصب العین ملک میں جمہوریت کی بحالی اور خواتین کے خلاف وضع کئے گئے امتیازی قوانین کا خاتمہ تھا۔ بقول شہناز کے دیرپا ایکٹوازم کے لئے ایک لائحہ عمل بنانا پڑتا ہے۔ اپنے راستے کا تعین حالات کے مطابق ہوتا ہے کہ صورت حال کیا ہے۔ کیا یہ مظاہرہ کرنے کا مقوع ہے یا اپنے مدعا کو ڈائیلاگ کے ذریعے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

شہناز کا خیال ہے کہ کسی بڑے مسئلے کے حل کے لئے صرف ایک تنظیم سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بہت سی چھوٹی بڑی تنظیموں کا نیٹ ورک بنایا جائے۔ اس سے دائرہ کار وسیع ہو جاتا ہے۔ انفرادی کارکردگی کو قوت ملتی ہے۔ مثلاً ہم نے

اسمبلیوں میں خواتین کی مخصوص نشستوں کی بحالی کے لئے مہم چلائی تو ہمارے ساتھ بہت سی تنظیمیں مل گئیں۔ وہی اتحاد ہماری طاقت بنا۔ گو کہ ابھی تک سرکاری سطح پر اس سلسلے میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی لیکن ہم پرامید ہیں کہ ایک نہ ایک دن ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

شہناز اپنی دو بہنوں سے چھوٹی ہیں۔ لاڈ پیار سے پرورش ہوئی۔ بچپن میں کسی محرومی یا ناانصافی کا احساس نہیں ہوا۔ رجائیت پسندی شہناز کی فطرت کا خاصا ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتی ہیں کہ اگر آپ دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بدسلوکی سے پیش آئیں۔

شہناز نے ابتدائی تعلیم لاہور کے کانوونٹ آف جیزز اینڈ میری سے حاصل کی، جبکہ بی۔ اے کنیرڈ کالج سے کیا۔ فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ اور قائداعظم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا۔ وہ آج کل عورت فاؤنڈیشن اسلام آباد کی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر ہیں۔

شہناز کی شادی سنہ 77ء میں ہوئی اور وہ 80ء میں بیوہ ہوگئیں۔ ان کی ایک بچی ہے۔

گزشتہ آٹھ نو سال کے دوران انہیں غیر سرکاری تنظیموں کی مختلف ورکشاپس اور کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ دہلی میں آئی۔ ایل۔ او کے زیر اہتمام ''عورت کی سربراہی میں چلنے والے گھر'' بنکاک میں عورت کے خلاف تشدد پر کانفرنس میں شرکت کے علاوہ 1994ء میں منیلا میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ''پاکستان کے ایجنڈے پر خواتین کے ایشوز کا اندراج'' اور 1994ء میں ہی بنکاک میں ایک ورکشاپ میں ''عورتوں کی پالیسی ایجنڈے پر ڈالنا'' مقالات بھی پڑھے۔ انہی تجربات کی بنیاد پر بیجنگ کانفرنس کے موقع پر تیار کی گئی پاکستان کی قومی رپورٹ میں شہناز احمد نے بھرپور حصہ لیا۔

لیکن انہیں اپنے سماجی کاموں کے اوائل میں حاصل ہونے والی کامیابیوں پر تسکین بہت یاد ہے اور وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے جاگ اٹھتی ہیں۔ یہ سنہ 86ء کا ذکر ہے جب انہوں نے اپنے ادارے کی جانب سے پسماندہ علاقوں کی عورتوں کو اکٹھا کرنے کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ ''ہمجولی'' کے نام سے چلائے گئے اس پروگرام کا مقصد عورتوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ شہناز نے انہی دنوں ماسٹرز کیا تھا۔ وہ اپنے لئے کسی مشغولیت کی

تلاش میں تھیں کہ یہ موقع ہاتھ آ گیا۔ عام عورتوں سے رابطے میں انہیں ایک مقصد ہاتھ آ گیا۔ ایک راہ سجھائی دی کہ اگر کوئی بڑا ہدف ہے تو اپنے کام کا آغاز سطح زمین سے کرنا ہو گا۔ قومی سطح کے مسائل کے حل کے لئے پہلے نچلے طبقے میں شعور پیدا کرنا ہو گا۔ انہیں یہ موقع دینا ضروری ہے کہ معمولات کی باہن سے نکل کر اپنے بارے میں سوچیں، اپنے قرب و جوار کو دیکھیں۔

یہ پراجیکٹ ایوان صدر کے پیچھے بری امام کے ساتھ کچی آبادی میں شروع کیا گیا تھا جہاں پر عورتوں کو صحت اور حفظان صحت کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے علاوہ اس علاقے کی عورتوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے مختلف پروگرام مرتب کئے گئے۔ ان کے ذریعے انہیں یہ ترغیب دی گئی کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے خود اپنی عزت کرنا، اپنے بارے میں اچھی رائے قائم کرنا کس قدر اہم ہے۔ انہیں یہ موقع دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں سے نکل کر کچھ وقت اپنے علاقے کی دوسری عورتوں کے ساتھ گزاریں۔ ادارے کی جانب سے ایسے کھیل اور بامقصد گیت تیار کئے گئے۔

اب عورت فاؤنڈیشن کی جانب سے وسیع پیمانے پر ''سیاسی شعور'' کے منصوبے پر کام کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں مختلف مقامات پر سیمیناروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ شہناز کا کہنا ہے کہ ہماری عورتوں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی سے ووٹ دے سکیں۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ سیاست کا ملکی ترقی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اگر عورت مقامی سطح پر ایک قوت بن جائے تو پھر یہ جان لینا مشکل نہ ہو گا کہ گاؤں کا سکول کیوں نہیں چل رہا یا کہ ڈسپنسری میں ڈاکٹر کیوں نہیں ہے۔

شہناز احمد اپنے کام میں ٹاپ گیئر لگائے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا کام کمیونٹی کی سطح پر قائم کی گئی تنظیموں (CBOS) کے درمیان رابطہ قائم کرنا ہے۔ ''ایک سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ کامیابی ضرور ملے گی۔''

''ناکامی تو اس وقت ہوتی ہے جب آپ شور مچانا بند کر دیں۔''

MashalBooks.org

# کوثر شیخ

لاہور ایئرپورٹ 13 نومبر 1982ء نیو دہلی روانہ ہونے والی پرواز تیار تھی۔ دہلی میں 19 نومبر سے ایشاڈ گیمز (ASIAD) شروع ہونے والی تھیں۔ ان میں شرکت کے لئے، حکومت پاکستان کے فیصلے کے مطابق، صرف مرد کھلاڑی جا رہے تھے۔ پھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے۔ ان کا قافلہ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ رہا تھا کہ چھناک سے چوڑیاں ٹوٹیں اور ان کی کرچیاں فرش پر بکھر کر پھولوں کی پتیوں کو زخمی کر گئیں۔

تحریک خواتین کی آواز پر بہت سی تنظیموں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کا اجتماع ایئرپورٹ پر پہلے سے اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ ان کے ہاتھ میں احتجاجی بینرز تھے۔ نعرے بلند ہوئے: ''مرد بنو، ساتھ دو، مولویوں سے مت ڈرو۔''

کوثر شیخ کی آواز بھی اس احتجاج میں شامل تھی۔

یہ احتجاج، ضیاء حکومت کی جانب سے عورتوں کو کھیلوں میں روکنے کے خلاف اٹھائے گئے قدم کی ایک کڑی تھی جس کا آغاز نومبر 1980ء میں ہوا تھا جب سری لنکا میں سنہ 1981ء کے آغاز میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی کھیلوں کے لئے خواتین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کھلاڑی لڑکیوں نے لاہور میں ڈیڑھ ماہ کی تربیت مکمل کر لی تھی۔ لیکن سری لنکا روانگی سے 5 روز قبل انہیں شرکت سے اچانک روک دیا گیا۔ تربیتی کیمپ اکھیڑ دیئے گئے اور کھلاڑیوں کو گھر بھیج دیا گیا۔ اسی طرح کھلاڑی لڑکیوں کو 17 اگست کو جاپان میں منعقد ہونے والے ایشیائی کھیلوں کے سلسلے میں تین ماہ تربیتی کورس کے لئے بلایا گیا لیکن چودہ اگست کو انہیں تربیت بند کرنے اور گھر جانے کا حکم ملا۔

ضیاء حکومت اپنے بنیاد پرست حامیوں کی بات نہیں ٹال سکتی تھی جن کا استدلال یہ تھا کہ شریف لڑکیوں کی نامحرموں کے سامنے اچھل کود معیوب ہے۔

MashalBooks.org

کوثر کو یاد ہے ''ہم نے ویف کے پلیٹ فارم سے حکومتی اہلکاروں سے رابطے کئے۔ لڑکیوں کی بین الاقوامی کھیلوں میں شرکت پر پابندی کے بارے میں مذاکرات کئے لیکن کوئی یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تاہم خواتین تنظیموں کے مسلسل احتجاج پر 20 اپریل کو ضیاء نے قوم کے سامنے یہ کہا کہ عورتیں کھیل میں حصہ لے سکتی ہیں مگر چار دیواری سے گھرے ہوئے میدانوں میں اور ایسا صرف ملک کے اندر ہوگا۔ انہیں بین الاقوامی کھیلوں میں شرکت کے لئے بیرون ملک جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

حکومت نے کئی بہانوں، کئی طریقوں سے پاکستانی عورت کو اس کے انسانی حقوق سے محروم کرنے، اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے کے احکامات جاری کئے اور خواتین کے حقوق کے علمبردار تنظیموں اور گروہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ کوثر اس تمام عمل میں سرگرم رہیں۔ چاہے وہ عورتوں کے عالمی دن (آٹھ مارچ 1983ء) پر قانونِ شہادت کے خلاف احتجاج ہو یا اکتوبر 84ء کو لاہور کی مال پر وہ تاریخی مظاہرہ ہو جب پولیس نے عورتوں کے جلوس پر آنسو گیس چھوڑی اور لاٹھی چارج ہوا۔ پچاس عورتیں گرفتار ہوئیں۔ یا پھر صائمہ وحید کی پسند کی شادی پر لاہور کی ایک عدالت کا یہ فیصلہ کہ پاکستانی عورت ولی کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتی جس پر باشعور شہریوں نے پرزور احتجاج کیا تھا۔

کوثر شیخ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ کنیئرڈ کالج سے بی اے آنرز کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے انگلش میں ایم اے کیا۔ عملی زندگی کے آغاز میں پاکستان ٹوریسٹ ڈیویلپمنٹ سینٹر میں ٹورسٹ انفارمشن افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ سنہ 68ء سے اب تک وہ مختلف اداروں میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ ان دنوں کنیئرڈ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

کوثر کی بیٹری ان کی طالبات ہیں۔ وہ گزشتہ 17 برس سے سٹوڈنٹس کونسل سے منسلک ہیں۔ اس دوران انہیں اپنی نئی نسل کے رجحانات اور ان کے طرز فکر کے بارے میں جاننے کے مواقع ملے۔ بقول ان کے ''سٹوڈنٹس کی سوچ میں ان کے معاشرے کی جھلک ہوتی ہے۔ ہم ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں بدعنوانی طرز زندگی ہے اور ایمانداری کو حماقت خیال کیا جاتا ہے۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں ہم کہاں جائیں؟ سب لوگ ایسے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ ان کے ذہن اچھائی کو تسلیم کرنے سے انکار

کرتے ہیں۔ وہ دن بھر کچھ اور دیکھتے ہیں۔ برائی کی نشو ونما، ریا کاری، رشوت پھر بدلتی ہوئی اقدار میں انہیں اپنا کوئی رول ماڈل نہیں ملتا۔ وہ ڈس الیوژنڈ ہو رہے ہیں۔''

کوثر نے شادی نہیں کی۔ وہ ایک خودمختار خاتون ہیں۔لیکن اس انتخاب میں بھی بہت سی دشواریاں ہیں۔کوثر کہتی ہیں ''اپنی آزادی خود فتح کر کے بھی کیا حاصل۔آپ خود چاہے کتنا ہی لبرل کیوں نہ ظاہر کریں مگر کسی ریسٹوران میں اکیلی نہیں جاسکتیں کہ بہت سی نظریں اٹھتی ہیں۔ چہروں پر بہت سے سوال ہوتے ہیں جبکہ ایک عورت چھوٹی سی بچی یک انگلی پکڑ کر وہاں چلی جاتی ہے تو گردوپیش میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

''کوثر شیخ کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل پر بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں، اس لیے کہ وہ ان بچیوں کے قریب رہیں جن کے والدین بیرون ملک رہتے ہیں۔ رشتے دار انہیں بہت آزاد خیال تصور کرتے ہیں۔کوثر نے ان کی بات سنی، انہیں دلاسا دیا، ان کی رہنمائی کی، ان کے اعتماد کو بحال کیا۔

کوثر شیخ ''سیمرغ'' کی ورکنگ کمیٹی کی رکن ہیں۔ نیز وہ اپنے کالج کی بہت سی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔خصوصاً کالج آرٹ کلب ان کا پسندیدہ شعبہ ہے۔ کوثر کے خیال میں معاشرتی تبدیلی لانے کے لئے تھیٹر، ڈرامہ فلم اور پوسٹرز اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ عموماً اپنی طالبات سے کالج کے آرٹ کلب کی جانب سے پیش کئے گئے ڈراموں کے سکرپٹ لکھواتی ہیں۔ ان کہانیوں میں انہیں اپنے معاشرے کے کئی مثبت اور منفی رنگ ملتے ہیں۔

کوثر شیخ نے ''عورت اور میڈیا'' سیمرغ کے زیر اہتمام تشدد پر علاقائی ٹربیونل ''عورت کی عدالت'' کے علاوہ کئی تربیتی ورکشاپس اور سیمینارز میں شرکت کی۔ انہیں نیویارک میں ''بچوں کے حقوق'' پر منعقد کی گئی عالمی کانفرنس میں جانے کا موقع ملا۔

یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جب ہم خود کو عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں۔سب کا مطمح نظر مختلف ہوتا ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ جس اعتماد سے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں کیا ہم ویسا نہیں کر سکتے۔ ہم مسائل پر بات کرتے ہیں لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا۔

MashalBooks.org

# زبیدہ مصطفیٰ

1980ء کے عشرے کے اوائل سے 1990ء کے عشرے کے آخر تک، مارشل لاء کے دور میں، عورتوں کے انسانی حقوق سلب کرنے سے لے کر فرسٹ ویمنز بنک کی نجکاری تک زبیدہ نے عورتوں کے مسائل پر اور عورتوں کے حق میں لکھنے میں ہمیشہ بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ملک کے ایسے موقر اخبار سے منسلک ہیں جس نے ہر دور میں حکومت میں متوازن پالیسی اختیار کی ہے اور عورتوں کے مسائل کے بارے میں اس کا ہمیشہ مثبت رویہ رہا ہے۔ اس ضمن میں اپنے اخبار کی پالیسی کو مضبوط کرنے میں زبیدہ نے ہمیشہ موثر کردار ادا کیا۔ ادھر کسی مسئلے نے سر اٹھایا اس پر اگلے ہی روز اداریہ یا ادارتی نوٹ شائع ہوگیا یا آئندہ ہفتے زبیدہ مصطفیٰ کی بائی لائن کے ساتھ مضمون چھپ گیا۔

سنہ 83ء میں جب فوجی حکومت کی آمریت اپنے عروج پر تھی اظہار پر پابندیاں تھیں، زبیدہ نے عورتوں سے متعلق ہر موضوع پر لکھتے ہوئے جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

معیشت میں عورت کی قوت کے بارے میں لکھتے ہوئے زبیدہ کے مضمون کی سرخی تھی ''مخفی صلاحیت قدر شناسی کی منتظر ہے۔'' پاکستانی عورتیں جو ملک کی تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہیں، ملکی معیشت کی بہتری کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کے لئے انہیں ترقیاتی عمل میں شامل کرنا لازمی ہے۔ اس کے خلاف واویلا مچانے والے دراصل وہ مرد ہیں جو معاشرے میں عورت کے غلامانہ کردار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

زبیدہ مصطفیٰ نے کراچی یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کیا۔ جس کے بعد انسٹی ٹیوف آف پاکستان انٹرنیشنل افیئرز میں سات سال تک کام کیا اور مختلف امور

پر تحقیقی مضامین لکھے۔ اسی دوران یعنی سن 75ء سے انہیں روزنامہ ڈان کراچی سے پیشکش ہوئی۔ تب سے اب تک وہ اسی اخبار کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

جب وہ اخبار کے سٹاف میں شامل ہوئیں تو شروع شروع میں انہیں بین الاقوامی امور کی بیٹ سونپی گئی لیکن اندرون ملک درپیش مسائل کو نظر انداز کرنا زبیدہ کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے معیشت اور معاشرتی مسائل پر تحقیقی مقالے لکھے۔

کہتی ہیں ''ان دنوں رجعت پسند فوجی حکومت نے عورتوں کو ٹارگٹ بنایا تھا۔ میں نے ان مسائل پر خصوصی توجہ دی۔ یہ کام شروع کیا تو پھر ختم نہیں ہوا''

مارچ 1990ء میں سیاسی منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ مارشل لا ختم ہو چکا تھا۔ جمہوریت آ گئی تھی۔ ماحول میں خوشگواری رچنے لگی تھی۔ عورتوں کے مسائل پر مثبت اقدامات کی توقع کی جا رہی تھی۔ رویوں میں تبدیلی آئی تھی۔ زبیدہ نے لکھا:

''معاشرے میں عورتوں کے کردار کے بارے میں شعور پیدا ہونے کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرتی امور کو نئے زاویے سے دیکھا جانے لگا ہے۔''

انہوں نے اس مضمون میں آگے جا کر لکھا کہ گھریلو کام کاج کا فرض جو بنیادی طور پر عورتیں ادا کرتی ہیں، ملکی معیشت کے لئے ایک پوشیدہ امدادی نظام ہے، لیکن روایتی طور پر قومی سطح پر اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ وہ عورتیں جو گھریلو کام کو نمٹانے میں کئی گھنٹے محنت کرتی ہیں انہیں کارکن بھی نہیں سمجھا جاتا۔''

اخبارات کی یہ عام روش ہے کہ ان میں عورتوں کے خصوصی صفحات شائع کئے جاتے ہیں جو ہفتے میں ایک بار چھپتے ہیں۔ زبیدہ کا کہنا ہے کہ ''میں نے اپنے اخبار میں عورتوں کا صفحہ بند کروایا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ عورتوں کے مسائل بھی دیگر مسائل کی طرح ہیں تو پھر انہیں الگ خانے میں کیوں ڈالیں۔

زبیدہ مصطفیٰ ان چند خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں طالب علمی کے زمانے میں یا ملازمت کے دوران والدین، شوہر اور کام کے ساتھیوں سے ہر طرح کا تعاون ملا۔ انہیں عورت ہونے کے ناطے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سوائے............

''جب ایڈیٹر بیرون ملک جانے کے لئے کہتے ہیں تو میں فوری طور پر ہاں نہیں کہہ سکتی کیونکہ اپنا پروگرام طے کرنے سے پہلے مجھے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ بچوں کا خیال کون

کرے گا۔ گو کہ اس صورت میں اکثر میرے شوہر دفتر سے چھٹی لے کر بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں لیکن مجھے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس دوران میں باہر رہوں گی کیا انہیں تو کہیں نہیں جانا ہو گا۔ جبکہ میرے مرد ساتھیوں کو ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ ایسے موقعوں پر فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں۔

زبیدہ مصطفیٰ اپنے اخبار کی پہلی خاتون ہیں جو ایڈیٹوریل بورڈ پر ہیں، یاد کرتی ہیں: ''میں جب ضیاء دور میں ایڈیٹوریل کانفرنسوں میں جاتی تھی تو اکثر لوگ حیران ہوتے تھے کہ پاکستان کے ایک اخبار کی نمائندگی عورت کر رہی ہے''!

زبیدہ مصطفیٰ نے اندرون ملک اور بیرون ملک بہت سفر کیا۔ والد ریلوے میں تھے اس لئے ملک بھر میں گھومے۔ ان کے اخبار میں کچھ عرصہ پہلے تک مختلف ممالک کے خصوصی ایڈیشن شائع کئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں زبیدہ نے دس سال تک دنیا کے 16 ممالک کا سفر کیا۔ ان ممالک کے تہذیبی، معاشرتی اور دیگر پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور ان کی ''کنٹری رپورٹ'' تیار کی۔

زبیدہ کا دعویٰ ہے کہ سیاسی طور پر لکھنے کا اثر ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ ایشوز کیا ہیں۔

پچھلے دنوں جب عورتوں کے مسائل، ان کے حقوق، امتیازی قوانین میں ترمیم کی سفارشات پر مبنی انکوائری کمیشن رپورٹ آئی تو زبیدہ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ رپورٹ اتنی اچھی ہے کہ اسے عملی جامہ پہنانا ناممکن نہ ہوگا۔

زبیدہ نے لکھا ''اس رپورٹ میں بہت حساس موضوعات کو چھیڑا گیا ہے۔ اس پر ایکٹوسٹ خواتین کی طرف سے خوشی کا اظہار کیا گیا ہے کہ کمیشن نے ایسے مسائل کو کھلم کھلا اٹھایا جو محض بند کواڑوں کے پیچھے زیر بحث لائے جاتے تھے۔

زبیدہ نے تجویز پیش کی تھی کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کمیشن نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے اس پر کھلا مباحثہ ہو۔ وہ مذہبی علماء جو کمیشن کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہیں وہ اپنا عندیہ بیان کرتے ہیں تاکہ اس معاملے پر ایک اچھے تبادلہ خیال کا آغاز ہو سکے۔''

زبیدہ کے شوہر ایک بینکار ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی

MashalBooks.org

ہے۔ جب پہلی بچی پیدا ہوئی تو زبیدہ کو لندن سکول آف اکنامکس کا سکالرشپ ملا تھا۔ ان کے میاں بھی جا رہے تھے۔ زبیدہ بچی کو والدین کے پاس چھوڑ کر چلی گئیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر لوٹ آئیں۔ انہیں پی ایچ ڈی نہ کرنے کا افسوس بھی ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ ان کی اپنی بچیوں کے ساتھ بہت مفاہمت اور قربت ہے۔

MashalBooks.org

# زہرہ یوسف

''1980ء کے عشرے میں عورتوں کی تحریک نے پاکستان میں این جی اوتحریک کوجنم دیا۔ گوکہ بہت سی ایکٹوسٹ خواتین پر اپنی صلاحیتوں اور توانائی کو این جی او کے کام میں صرف کرنے اور اسے وسیلہ روزگار بنانے کا الزام لگایا جاتا ہے، لیکن ایک قوت آفریں این جی اوتحریک ہمارے ملک کی بیشتر عورتوں کی زندگی میں بامعنی تبدیلی پیدا کرسکتی ہے۔ یہ عمل شروع ہو چکا ہے لیکن یہ سست رو اور غیر یقینی ہے۔''

زہرہ یوسف نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایڈورٹائزنگ سے کیا تھا لیکن انہیں اب بھی عملی صحافت میں گزارے ہوئے وہ دن یاد ہیں جب ان کا اخبار روزانہ پریس جانے کے بجائے سنسر کے لئے جاتا تھا۔ یہ سنہ 1981ء سے 86ء کا زمانہ تھا۔ زہرہ اپنے اخبار میں میگزین ایڈیٹر تھیں جس کا مزاج خالصتاً سیاسی تھا، خصوصاً عورتوں کے مسائل پر بہت کھل کر لکھا جا رہا ہے۔

ہر ہفتے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد جب باقاعدہ سنسر شپ ختم ہوئی تو خود کو سنسر کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ بقول زہرہ کے یہ سب سے تکلیف دہ عمل تھا اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ عملی صحافت سے کنارہ کش ہو جائیں اور وہ ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں واپس چلی گئیں جو ان کا وسیلہ روزگار ہے۔

زہرہ نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور سنہ 70ء میں ڈھاکہ سے کراچی آئیں۔

''خاندان میں کوئی سیاست دان یا ایکٹوسٹ بھی نہیں تھا لیکن ملک میں جو سیاسی صورت حال تھی، اس سے کسی کے لئے بھی الگ رہنا مشکل تھا۔''

زہرہ شرکت گاہ کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔ اس دوران تحریک نسواں سے بھی رابطہ رہتا تھا۔ فروری 79ء میں حدود آرڈیننس جاری ہوا تو سب سے پہلے شرکت گاہ نے

اس مسئلے کو اٹھایا۔ ان کے ساتھ عورتوں کی مختلف انجمنیں بھی شامل تھیں۔ ویمنز ایکشن فورم کے قیام کے بعد زہرہ اس کے ساتھ بھی سرگرم عمل رہیں۔ پاکستان انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ 1988ء سے منسلک ہیں۔ اس تنظیم کی وائس چیئر پرسن بھی رہیں اور اب وہ اس کی جنرل سیکرٹری ہیں۔

ایک اشتہاری کمپنی کے ساتھ کل وقتی کام کرنے کے باوجود زہرہ یوسف صحافت کے منظر پر ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ ان کے مضامین اخبارات اور جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا کام جس میں کوئی کاز شامل ہو، زہرہ اس کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ مثلاً ایک بار ایک ایسی کتاب زیر اشاعت تھی جس میں عصر حاضر کے مسائل کے شمارے میں مختلف موضوعات پر مضامین شامل تھے۔ زہرہ نے اس کا سرورق ڈیزائن کیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس کا معاوضہ کیا ہوگا تو ان کا جواب تھا۔

''ہم ایسے کام کرتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔''

مجھے کام کرنے کی تحریک اپنے ساتھیوں سے ملی۔ میں جن لوگوں کے ساتھ کام کرتی تھی ان کی لگن، محنت اور لوگوں کی بہتری کے لئے کام کرنے کا جذبہ بہت متاثر کن تھا۔

زہرہ یاد کرتی ہیں: ''میں نے جب انسانی حقوق کمیشن جوائن کیا تو مارشل لا ختم ہو چکا تھا لیکن معاشرے میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ بھی معدوم ہو چکا تھا۔ جمہوری اقدار کو جو نقصان پہنچا، معاشرے پر اس کے اثرات دور رس ہیں۔ توہینِ رسالت اور عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین کی آڑ میں ذاتی دشمنی میں لوگوں کو پھنسایا جا سکتا ہے۔ پچھلے برسوں میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ ایسا کیا گیا۔ شانتی نگر کا واقعہ ناروا داری کی ایک تکلیف دہ مثال ہے۔

حکومت کا خیال ہے کہ عجلت میں کی گئی آئینی ترامیم معاشرے کی تمام برائیوں کو ختم کر دیں گی۔ ضیا کے زنا آرڈی نینس میں ترمیم کر کے اجتماعی زنا پر موت کی سزا مقرر کی گئی، جبکہ سرکاری اعداد و شمار بھی اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں کہ مذکورہ ترمیم کے بعد اجتماعی زنا کے واقعات میں اضافہ ہوا۔

انسانی حقوق کمیشن کے طریقہ کار کے بارے میں زہرہ وضاحت کرتی ہیں ''ہمارا

ایک نیٹ ورک ہے جس کے ذریعے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں رپورٹ موصول ہوتی ہے۔ اگر واقعہ اہم ہو تو ایک ٹیم اس پر تحقیق کر کے رپورٹ تیار کرتی ہے جو حکومت کو بھی بھیجی جاتی ہے۔

ان کاموں میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ گو چند معاملات میں ہمیں دھمکیاں دی جاتی ہیں، مثلاً سندھ کے ہاریوں کی رہائی میں سرگرم افراد کو دھمکایا گیا، لیکن زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوا۔ حکومت کی طرف سے اگر تعاون نہیں ملا تو رکاوٹ بھی نہیں ہوئی۔ ایسے ممالک بھی ہیں جو ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن وہاں انسانی حقوق کی کسی تنظیم کو کھلے بندوں کام کرنے کی اجازت نہیں۔

لیکن انہوں نے سنہ 97ء میں انسانی حقوق کی صورت حال کے بارے میں ایک مضمون لکھا ''ان حالات میں جب عورتوں کے انسانی حقوق کو چیلنج کرنے کا رجحان بڑھ رہا تھا، سابقہ حکومت نے پاکستان میں عورت کے مقام کے مطالعے کے لئے کمیشن قائم کیا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ اور متفقہ سفارشات وزیراعظم نواز شریف کو پیش کیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے اپنے فوری مثبت ردعمل میں ان کے نفاذ کا مطالبہ کیا لیکن ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حکومت نے انہیں کسی چولہے (Back Burner) میں پھینک دیا ہے۔

گزشتہ برسوں کی رضاکارانہ سرگرمیوں کے بارے میں زہرہ کہتی ہیں:

''جب یہ کام شروع کیا تھا تب اور اب دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنے حقوق کا احساس ہو چلا ہے۔ یہ احساس اندرون ملک زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ زیادتیاں بھی بہت ہوئی ہیں۔''

زہرہ یوسف کے والد ڈھاکہ میں شوگر ٹیکنالوجسٹ تھے۔ ان کا انتقال 66ء میں ہو گیا تھا۔ زہرہ کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ وہ اور ایک بہن اپنی امی کے ساتھ کراچی میں رہتی ہیں، جبکہ باقی بہن بھائی دوسرے شہروں اور ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ زہرہ نے شادی نہیں کی۔ کہتی ہیں ''شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور پھر ایک عمر ایسی آ جاتی ہے کہ جب انسان اپنے کام اور عادات اور طرز زندگی کا عادی ہو جاتا ہے اور کسی اور کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔

# ہلڈا سعید

''میرے پاس اپنے شناختی کارڈ نمبر ہے، لیکن میری اپنی شناخت نہیں ہے۔''

''میرے اندر کی آزردگی پھر بڑھنے لگی ہے۔ میرے ذہن میں کئی سوال اٹھتے ہیں۔ میں معاشرے کو، شوہر کو اور اپنے آپ کو کوستی ہوں۔ پھر اپنے آپ سے پوچھتی ہوں: میں کیوں ایسی ہوں؟ میں میسر نعمتوں پر شکر کیوں ادا نہیں کرتی؟''

میں کیوں چاہتی ہوں کہ مجھے سب سے پہلے ایک انسان سمجھا جائے۔ میری دیگر تمام حیثیتیں ثانوی ہیں۔''

ہلڈا سعید نے بہت ساری شہری عورتوں سے گفتگو کی تو ایک ایسی عورت کا خاکہ بنا جو بیک وقت بیوی بھی ہے، ماں بھی، کارکن بھی، لیکن شوہر اس سے ایک بہترین خانہ دار عورت ہونے کی بھی توقع کرتا ہے۔ شوہر کام سے لوٹتا ہے تو وہ گھر کو صاف ستھرا اور تازہ کھانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے یہ پروا نہیں کہ اس کی بیوی بھی کام سے لوٹی ہے۔ وہ بھی تھکی ہوئی ہو گی۔ نہیں، اسے اس سے کوئی غرض نہیں، اسے صرف اپنی آسائش مقصود ہے۔

ہلڈا کو یاد ہے وہ جب گرجے جاتیں اور پادری لڑکے اور لڑکی کا نکاح پڑھا رہا ہوتا تو لڑکی پادری کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہراتی ''میں اپنے شوہر کی تابعداری کروں گی'' جبکہ لڑکا کہتا ''میں اس کی عزت کروں گا'' اس وقت ذہن میں سوال اٹھتا تھا کہ تابعداری کا لفظ ظرف عورت ہی کے لئے کیوں ہے؟ اور پھر کیا یہ ضروری ہے کہ گرجے کا پادری صرف مرد ہو؟

راستے میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھئے۔ برقعے میں لپٹی ہوئی عورت مرد سے 5-4 قدم پیچھے چلتی ہے۔ اس کے ہاتھ لدے ہوئے ہوتے ہیں سامان سے بچوں سے اور مرد گردن اٹھائے آگے آگے چل رہا ہوتا ہے۔

ہلڈا کی عمر ایک سال تھی جب وہ اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان آئیں۔ اس وقت سے اب تک وہ کراچی میں ہی رہی ہیں۔ ہلڈا کا تعلق تعلیم یافتہ متوسط عیسائی گھرانے سے ہے۔ دادی کا ماں کے ساتھ سلوک، والد کی بالادستی، ماں کی محکومیت، رشتوں اور انسانوں میں تفاوت، ہلڈا کی نوعمری کے مشاہدے اور تجربے۔

''ماں نے چھ بچے پیدا کیے۔ چھٹے بچے کی پیدائش پر ان کا خون اتنا بہہ گیا تھا کہ بچنا مشکل تھا لیکن کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ جوں جوں شعور بڑھا تو معاشرے میں عورت کے دبے ہوئے مقام کا احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ ہمارے ہاں خاندانی منصوبہ بندی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ عورت بول نہیں سکتی کہ وہ 11-12 بچے پیدا کر چکی ہے، اسے اور بچے نہیں چاہئیں۔''

ہلڈا نے عورت کی تولیدی صحت پر تحقیق کو اولین ترجیح دی۔ اس خیال سے کہ ''اگر میرے جسم کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر رہی تو میں اور کیا حق مانگ سکتی ہوں۔

ہلڈا سعید نے بیجنگ کانفرنس کے موقع پر تیار کی گئی پاکستان کی قومی رپورٹ کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی عورت کی تولیدی صحت کے ضمن میں جو حقائق دنیا کے سامنے لائے گئے وہ یہ ہیں:

''معاشرے میں عورت کی کمتر حیثیت دورانِ حمل اور بچے کی پیدائش کے سلسلے میں درپیش خطرات پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے، جس کے تحت اس کے فیصلہ سازی کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں اور وہ کسی مشکل یا نازک مرحلے پر طبی امداد حاصل کرنے کا فیصلہ بھی خود نہیں کر سکتی۔

ہلڈا سعید نے کراچی گرائمر سکول سے او لیول اور کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا۔ وہ ویمنز ایکشن فورم کی بنیادی رکن کے علاوہ بہت سی دیگر این جی اوز اور اداروں کے ساتھ منسلک ہیں۔ کچھ برس پہلے انہوں نے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر اخبارات اور جرائد میں مضامین لکھے۔ پھر انہوں نے نیشنل ہیلتھ کے نام سے ماہی جریدہ نکالا اور وہ اس کی تیرہ برس تک مینجنگ ایڈیٹر رہیں۔ گزشتہ چند برس سے وہ شرکت گاہ کے ساتھ کل وقتی طور پر منسلک ہوگئی ہیں۔

MashalBooks.org

کام کرنے کا طریقہ کچھ بھی ہو، سلسلہ ایک ہے، جس میں بہت ساری کڑیاں مل جاتی ہیں۔ عورت کو غربت سے کیسے نکالیں۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کیسے روکا جائے۔ بے ہنگم طریقے پر کی گئی صنعتی ترقی ماحول پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ پاکستان میں عورت کو قانونی حیثیت کیا ہے۔ عورت کو اقتصادی اختیارات دینے کی ضرورت ہے؟ وغیرہ۔

ان امور پر توجہ دینے اور اس ضمن میں تحقیق سے اعداد و شمار جمع کرنے میں غیر سرکاری تنظیموں نے بہت حد تک پیش قدمی کی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ سرکاری سطح پر بنائی گئی پالیسیوں میں این جی اوز کا مشورہ شامل کیا جانے لگا ہے۔ اس طرح بین الاقوامی کانفرنسوں کے لئے تیار کی گئی دستاویزات میں ان غیر سرکاری اداروں کے ماہرین کی کاوشیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

ہلڈا کو افسوس ہے کہ خواتین کے بہت سے گروپس کی برسہا برس کی جدوجہد کے باوجود عام پاکستانی عورت کی حیثیت میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں لائی جا سکی۔ انہیں شکایت ہے کہ ہمارے ہاں کا پڑھا لکھا طبقہ ان امور پر توجہ نہیں دیتا۔ حالانکہ ان میں صلاحیت بھی ہے اور وہ وسائل بھی رکھتے ہیں۔ لیکن بے حسی ہے اور سب اپنی ذات کے خول میں بند ہیں جبکہ معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے ایک فرد ایک گروپ یا ایک طبقے کو ہی نہیں سب کو مل کر کچھ کرنا ہوگا۔ نجی مفادات سے ہٹ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا لیکن عام روش یہ ہے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے سمجھوتے کئے جاتے ہیں۔

ہلڈا سعید شادی شدہ ہیں۔ ان کی ایک بیٹی ہے۔

MashalBooks.org

# نفیسہ ہود بھائی

خشک اور گرد آلود موسم جاری رہے گا۔
بے نظیر نے بچی کو جنم دیا۔
جناح ہسپتال کی ضائع کردہ ڈرپس فروخت ہو گئیں۔
یہ ہیں نفیسہ کی چند رپورٹوں کی سرخیاں۔

نفیسہ نے ڈرپس کے بارے میں رپورٹ لکھتے ہوئے ملک بھر کے بڑے شہروں کی ان گلیوں ذکر بھی کیا جہاں ایسی دوائیں فروخت ہوتی ہیں جن کی میعاد ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ مثلاً کراچی کی کچی گلی اور وہاب مارکیٹ، پشاور کی رحمان مارکیٹ، لاہور کی امین مارکیٹ اور بہار بازار راولپنڈی۔

صحافت نفیسہ کی پہلی محبت ہے اور رپورٹنگ ان کی اولین ترجیح۔ انہوں نے اپنی چودہ پندرہ سالہ عملی صحافت میں اپنی ''بیٹ'' کو محدود نہیں کیا۔ وہ انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کی علمبردار تنظیموں کی باقاعدگی سے رپورٹنگ کرتی رہی ہیں اور ان کی فائل کی ہوئی سٹوریز میں اجمیر نگر کے فسادات اور وہاں کے متاثرہ خاندانوں کی افسردہ عید کا ذکر بھی ہے۔ وہ یو۔این۔ایچ۔سی۔آر کے سامنے ایرانی پناہ گزینوں کے اس مظاہرے کا ذکر بھی کرتی ہیں جو ایران میں سیاسی قیدیوں کی موت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے اور جس میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ایک ہلاک اور چار زخمی ہو گئے۔ ان کی سٹوریز میں میرپور خاص کے ان غریب کسانوں کا بھی ذکر ہے جو کراچی میں اپنے جانور فروخت کرنے آئے تھے اور جنہیں ڈاکوؤں نے زہر دے کر لوٹ لیا تھا۔

یہ غالباً 80ء کے عشرے کی بات ہے، کچھ لوگ قائداعظم کے مزار کے احاطے میں جمع تھے۔ صحافی، فوٹو گرافر، تماشائی۔ ان سب کو سائیکل سوار خاتون کا انتظار تھا جو اپنے

سفر کے آخری مرحلے میں کراچی پہنچنے والی تھیں۔ نفیسہ سے تعارف ہوا۔ وہ اپنے اخبار کی جانب سے رپورٹنگ کی غرض سے آئی تھیں۔ ان دنوں وہ بیرونی ملک سے تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھیں۔

برس پر برس گزرتے رہے، نفیسہ بطور رپورٹر اپنے اخبار کے صفحات پر موجود رہیں۔ شہر میں منعقد ہونے والی ثقافتی اور سماجی تقریبات کی کوریج، سکولوں کالجوں کی سرگرمیاں، عموماً خاتون رپورٹروں کو اسی قسم کی بیٹ سونپی جاتی ہے جبکہ کرائم رپورٹنگ، عدالت میں کسی بڑے مقدمے کی کوریج، سیاست، اسمبلیوں کی رپورٹنگ وغیرہ پر مرد رپورٹر کا تعین ہوتا ہے۔ نفیسہ بھی حسبِ معمول اس امتیازی سلوک سے دو چار ہوئیں۔ مگر انہوں نے اپنی محنت اور ثابت قدمی سے خود اپنے لئے جگہ بنائی۔

نفیسہ کم عمری ہی سے صحافت کی طرف راغب تھیں اور انہوں نے طالب علمی کے دور سے مختلف اخباروں میں لکھا ہے۔ نفیسہ نے ابتدائی تعلیم سینٹ جوزف کانونٹ اور گرائمر سکول سے حاصل کی۔ سرسید کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ امریکہ چلی گئیں اور نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی بوسٹن سے عالمی تاریخ میں ماسٹرز کیا۔

امریکہ میں تعلیم کے دوران انہوں نے بہت کوشش کی کہ صحافت کے شعبے میں داخلہ مل جائے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ بہرحال وہاں بھی وہ مسلسل مختلف اخبارات کے لئے لکھتی رہیں۔ نفیسہ کو امریکہ میں قیام کے دوران مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے بارے میں علم ہوا اور یہ احساس ہوا کہ امریکی عورت کے بھی مسائل ہیں اور یہ تاثر غلط ہے کہ اسے ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں۔ وہ بھی کئی سطحوں پر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔

پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا تو رپورٹنگ کے شعبے کو ہی ترجیح دی۔ انہیں اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر آپ سنجیدہ موضوعات پر تحقیقی رپورٹنگ کرنا چاہیں تو بہت سی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ خصوصاً رپورٹنگ کے لئے خطرناک صورت حال سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کام کے اوقات طویل ہیں۔ اکثر اوقات جب گھر لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے تو والدین پریشان ہو جاتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک کمٹ منٹ ہے اس لیے وہ کچھ نہیں کہتے۔

MashalBooks.org

نفیسہ ہود بھائی نے تاجر گھرانے میں آنکھ کھولی۔ دادا بھیڑوں کی اون کی برآمد کا کاروبار کرتے تھے۔ نانا سندھی جاگیردار تھے جبکہ والد بلوچ تھے۔

روزناموں میں کسی رپورٹ کا اخبار نویس کے نام سے چھپنا بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ جب کبھی کسی رپورٹر کی سٹوری بائی لائن سے چھپتی ہے تو وہ اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز خیال کرتا ہے۔ نفیسہ ہود بھائی کو یہ اعزاز عموماً ملتا رہتا ہے۔ جب کبھی ایسا نہ ہو اور سٹوری صرف سٹاف رپورٹر کے نام سے چھپی ہو تو بھی وہ خود بتا دیتی ہے کہ اسے کس نے لکھا ہے، کیونکہ برسوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد نفیسہ بآسانی معاملے کی گہرائی تک پہنچ کر حقائق کو پر اثر انداز میں لکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

نفیسہ صحافت میں رپورٹنگ کو ایک بنیادی کام سمجھتی ہیں۔ کسی بھی لکھنے والے کے لئے یہ بنیادی اینٹ کی مانند ہے لیکن یہ بھی ہوا کہ اگر کسی کام سے کسی شادی شدہ مرد کے گھر میں فون کیا تو بیوی شک میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نفیسہ نے پیشہ وارانہ دیانت داری کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہ بھی ہوا کہ جب کراچی میں لسانیت اور فرقہ واریت کی آگ لگی ہوئی تھی تو نفیسہ کی رپورٹنگ پر ایک لسانی گروہ کے ارکان نے انکا تعاقب کیا۔ نفیسہ اس پر پسپا نہیں ہوئیں، نہ ہی کسی سے سوداگری کی۔ بس ہمیشہ اپنے کام میں مصروف رہیں۔

نفیسہ مختلف معاملات پر رپورٹنگ کے علاوہ خواتین کے مسائل، انسانی حقوق، سماجی مسائل پر لکھتی ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے سے یہ ان کی اپنی دلچسپی ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ قبل ایک میڈیا کانفرنس کے دوران یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ عملی صحافت خصوصاً رپورٹنگ میں زیادہ سے زیادہ خواتین کو آنا چاہئے کیونکہ وہ معاشرتی مسائل کے بارے میں حساس ہوتی ہیں اس لئے ان موضوعات پر بہتر طور پر لکھ سکتی ہیں۔

نفیسہ ہود بھائی نے اندرون ملک اور بیرون ملک بہت سی ورکشاپس اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے جن میں سے بعض مواقع پر انہوں نے مقالے بھی پیش کئے۔ وہ بیجنگ کانفرنس کے موقع پر پاکستان کی قومی رپورٹ تیار کرنے والی ٹیم کی رکن تھیں۔ انہوں نے پاکستانی عورتوں کی دس سالہ جدوجہد سے متعلق بی بی سی کے چینل 4 کے لئے ایک دستاویزی فلم بھی بنائی۔ ان کے مضامین ہندوستان، فرانس، امریکہ، جرمنی کے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نفیسہ نے صحافت اور ایکٹوزم کو یکجان کیا ہے مگر وہ ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ بقول ان کے صرف اسی صورت میں ہی غیر جانبداری سے مسائل کے بارے میں لکھنا ممکن ہے۔

نفیسہ شادی شدہ ہیں۔ ان کے شوہر جامشورو یونیورسٹی میں فلسفے کے شعبے کے سربراہ ہیں۔ ان دونوں نے شعوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ سردست بچے پیدا کرنا ان کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ یہ ان کی محبت کی شادی ہے۔ لیکن باہمی مفاہمت کی خوبصورت مثال یہ ہے کہ نفیسہ کے رفیق حیات نے نہ کبھی یہ اصرار کیا کہ اپنا نام تبدیل کرو اور نہ یہ کہا کہ صحافت چھوڑ دو۔ نفیسہ کا کہنا ہے کہ میں اپنے شوہر کے بغیر خود کو ادھورا خیال کرتی ہوں لیکن ہم نے کچھ اس طرح انتظام کر لیا ہے کہ دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے اور اپنی خودمختاری کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھی رہیں۔

نفیسہ کی خواہش ہے کہ وہ اندرون سندھ کے مسائل پر لکھیں۔ وہ دیہی لوگوں کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتی ہیں تاکہ ان کے بارے میں بہتر اور موثر طور پر لکھ سکیں۔ مثال کے طور پر ملک کے شمالی اور وسطی علاقوں سے گزر کر آنے والے دریائے سندھ کا پانی آلودہ ہو رہا ہے۔ سیاستدانوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس اہم مسئلے کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ کہ دریا کا پانی مضر صحت ہے بلکہ اس سے زمین بند ہو رہی ہیں۔

نفیسہ کو صحافت کی دنیا میں دور تک جانا ہے۔ وہ سندھ پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں جس میں صوبے میں سماجی زندگی پر وڈیرہ شاہی کے اثرات، ہاریوں اور عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک وغیرہ شامل ہیں۔ نفیسہ کا کہنا ہے کہ وڈیروں نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھا ہے۔ انہیں اپنے ہاریوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نفیسہ کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک کے بہت سے قوانین فرسودہ ہیں۔ ان میں تبدیلی لانی چاہئے۔ ہمارے ملک کو بھی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ ملنی چاہئے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہو گا جب ہمارے لوگ تعلیم حاصل کریں گے۔ خواندگی کی شرح بڑھے گی تو ان کی تنگ نظری میں ازخود کشادگی آنے لگے گی۔

# صبا گل خٹک

''آدھی رات گزر چکی تھی۔ سوتے میں اچانک آنکھ کھل گئی۔ مجھے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ اس خوف سے کہ اگر روسی فوجیں پشاور کو طورخم سے ملانے والی شاہراہ پر آ گئیں تو..........! جنگی جہازوں اور کلاشنکوف کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ روسی فوجوں نے کابل اور پراگ کی طرح پشاور کو بھی فتح کر لیا ہے۔''

صبا خٹک کے مضمون ''پاکستان میں اسلحہ کاری، مردانگی اور شناخت کے عورتوں پر اثرات'' سے ایک اقتباس۔

''کچھ عرصہ بعد میں پڑھنے کی خاطر امریکہ چلی گئی۔ ہوائی یونیورسٹی کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں ''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ روسیوں کے بارے میں ڈروائنے خواب کے اثرات کئی ماہ تک میرے ذہن پر سوار رہے۔ یہ عادت بن چکی تھی کہ بندوق کے بغیر تحفظ ممکن نہیں۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

صبا خٹک کے والد فوجی تھے۔ صبا کے منگیتر فوجی تھے۔ ماں پڑھاتی تھیں۔ صبا نے اپنے کزن کے ساتھ زبردستی منگنی کی تھی۔

''میرے چچا بار بار کہتے تھے جلدی کیا ہے۔ کچھ انتظار کر لو۔ میں نے ضد کی کہ ابھی منگنی کروں گی۔ دراصل میری تمام دوستوں اور رشتے دار لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔''

''منگنی ہو گئی تو خیال آیا تمام زندگی چھاؤنیوں میں گزر جائے گی۔ بڑی بات ہوئی تو آرمی کے کسی سکول میں پڑھانے لگوں گی اور شوہروں کے عہدوں سے پہچانی جانے والی عورتوں کی طرح بات کروں گی کہ فلاں جنرل کی بیوی نے یہ کہا۔ فلاں بریگیڈیئر کا یہ خیال ہے۔

''میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں ایم بی اے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سول سروسز

میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں پڑھانا چاہتی تھی۔ پشاور یونیورسٹی میں یہ موقع مل گیا۔

ضیاء الحق کا دور تھا۔تعلیمی ادارے ضیاء کی تجربہ گاہیں بن چکے تھے۔ ہوسٹل اسلحہ خانے بنے ہوئے تھے۔طلبا پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ وہ سال بھر غنڈہ گردی کرتے اور نقل مار کر پاس ہو جاتے۔ میں اس سے بددل ہو گئی اور بیرون ملک چلی گئی۔

صبا گل خٹک نے سکول سے یونیورسٹی تک کی تمام تعلیم پشاور میں حاصل کی۔ پشاور یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کیا اور پھر ہوائی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔

گردوپیش کا منظر بدلا تو ذہنی کشادگی پیدا ہوئی۔ پہلے یہ عالم تھا کہ جو کچھ مطالعے میں آتا اس پر اندھا دھند یقین کر لیتے۔سوال نہیں کرتے تھے۔ ہوائی جا کر ذہن میں سوال اٹھنے لگے۔

صبا پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں پشاور میں پڑوسی ملک میں جنگ کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔عورتوں کے لئے جگہ تنگ ہو گئی تھی۔ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے افغان مجاہدین کے نظریات کی اس طرح حمایت کی تھی کہ ایک قانون بنا دیا کہ یونیورسٹی کی عورتیں چادر اوڑھیں اور علیحدہ راستے پر چلیں۔

صبا نے ہوائی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دیگر طالبات کے ساتھ مل کر ایک ویمنز سنٹر قائم کیا۔ ان میں نیپال، پاکستان، ہندوستان، ایران اور دیگر ایشیائی ممالک کی طالبات شامل تھیں۔ انہوں نے بہت سے مسائل پر کام کیا۔ ان میں ایک مسئلہ ہم جنسوں کے انسانی اور قانونی حقوق کا بھی تھا۔ اس کے علاوہ نسلی امتیاز، جنسی تشدد اور نفسیاتی اثرات، لسانیات اور ایسے ہی مسائل پر تحقیق اور مذاکرے کئے گئے جو دنیا اور خصوصاً ایشیائی عورتوں کو درپیش ہیں۔

ایشیائی ممالک میں ملٹرائزیشن اور جنگوں نے عورتوں کو جس طرح متاثر کیا ہے، صبا خٹک نے اس کا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ افغان جنگ کے نتیجے میں عورتوں کو جسمانی اور ذہنی تشدد کا سامنا ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے صبا نے لکھا تھا۔

''ان افغان عورتوں پر، جنھوں نے ناخنوں پر رنگ لگایا تھا، تیزاب ڈالنے کے کئی واقعات ہوئے۔ پشاور کے قریب واقع ناصر باغ کیمپ میں ایسے پمفلٹ تقسیم کئے گئے جن میں افغانی عورتوں پر روسی ایجنٹ ہونے کا الزام تھا جس کی وجہ سے انہیں بہت سی مشکلات کا

MashalBooks.org

سامنا کرنا پڑا۔ وہ عورتیں جو بیوہ ہوگئی تھیں ان پر روایت پرستوں نے شدید پابندیاں لگائیں یہاں تک کہ ان کا راشن کے لئے جانے کو بھی غلط قرار دیا جاتا تھا۔ وہ بیوہ عورتیں جو اپنے دیوروں اور جیٹھوں سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں ان کی شادیاں زبردستی کی گئیں۔

صبا تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان آئیں تو انہوں نے ایک سال تک یو ایس آئی ایس میں کام کیا۔ وہ آج کل ایس ڈی پی آئی کے ماحولیاتی ادارے کے ساتھ منسلک ہیں۔

یہ بھی عام رویہ ہے کہ عورتوں سے متعلق موضوعات پر کام کرنے کے لئے عورتوں کو ہی لگایا جاتا ہے۔ پہلے پہل میں اس پر بہت جھگڑتی تھی۔ پھر سوچا کہ میری تربیت پولیٹیکل اکانومی میں ہے۔ بجائے اس کے کہ اس پراجیکٹ پر کوئی غیر تربیت یافت اور نااہل شخص کام کرے مجھے یہ ذمہ داری قبول کر لینی چاہئے۔

لیکن صبا کا خیال ہے کہ ہم خوش ہوتے رہتے ہیں کہ ہم نے عورتوں کے حوالے سے بہت کام کیا، کوئی غیر تربیت یافتہ اور نااہل شخص کام کرے مجھے یہ ذمہ داری قبول کر لینی چاہیے۔

لیکن صبا کا خیال ہے کہ ہم خوش ہوتے رہتے ہیں کہ ہم نے عورتوں کے حوالے سے بہت کام کیا، لیکن معاشرتی نظام جوں کا توں رہتا ہے۔ رویوں میں نمایاں تبدیلی نہیں آتی۔

صبا اعتراف کرتی ہیں کہ بے شک وہ ایک فیمی نسٹ ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق وغیرہ پر کام کیا ہے، لیکن ابھی تک ان میں کسی کام کے لئے ایسی امنگ پیدا نہیں ہوسکی جس کے لئے زندگی وقف کر دی جاتی ہے۔

صبا کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ان کے نظریات اور کام کی حمایت کرتا تھا۔ صبا نے شادی کر لی۔ ''وہ میرے لئے ایک ''فادر فگر'' تھا۔ وہ محبت اور توجہ جو مجھے اپنے باپ سے نہیں ملی تھی، وہ نصیب ہوئی۔ لیکن وہ شادی کے ڈھائی سال بعد اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا اور میں کچھ نہ کر سکی۔''

''عورت کی زندگی میں جذبات کا بہت دخل ہے۔ اس کی بہت اہمیت ہے۔ ورنہ زندگی نامکمل ہے'' صبا خٹک کہتی ہیں۔

# شیما کرمانی

کریم آباد کے میناز بازار میں ایک ڈرامہ پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے میں پانچ بہنوں کے کردار تھے۔ حاضرین میں نچلے متوسط اور متوسط طبقے کی تقریباً دو تین سو عورتیں تھیں۔ ڈرامے کے اختتام پر کچھ عورتیں ڈرامہ کرنے والے گروپ کے پاس آئیں اور کہا:

''آپ نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی۔''

یہ ڈرامہ گروپ شیما کرمانی کی سربراہی میں تحریک نسواں کا تھا۔ اس کھیل نے عورتوں میں تحریک کی روح پھونکی تھی۔ ان کے شعور کو جگایا تھا۔

موسیقی، رقص اور ڈرامہ اظہار کے یہ تمام وسیلے شیما کرمانی کی سربراہی میں تحریک نسواں کا تھا۔ اس کھیل نے عورتوں میں تحریک کی روح پھونکی تھی۔ ان کے شعور کو جگایا تھا۔

موسیقی، رقص اور ڈرامہ اظہار کے یہ تمام وسیلے شیما کرمانی کے نام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

عورتوں کے حقوق، معاشرتی زیادتیاں، معاشی ناانصافی، پدری نظام کی فرسودہ ترجیحات اور ان کے خلاف احتجاج شیما کے ایکٹوازم کی اساس ہے۔

شیما کے والد فوج میں تھے۔ بچپن ملک کی مختلف چھاؤنیوں میں گزرا لیکن چودہ پندرہ سال کی عمر سے کراچی میں مقیم ہیں۔ اولیول کرنے کے بعد کورکڈون کالج آف آرٹس سے مصوری میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ پینٹنگ کرتی رہیں، لیکن ڈرامے اور رقص میں مشغولیت کی بنا پر اسے ترک کر دینا پڑا۔

موسیقی سے لگاؤ شیما کو اپنے والد سے ورثے میں ملا، جنہیں مغربی کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی تھی۔ شیما نے کم سنی میں پیانو بجانے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ کراچی میں آباد ہونے کے بعد گھنشام کے تربیتی ادارے میں محض شوقیہ طور پر کلاسیکی رقص سیکھا۔ یہ 70ء

کے عشرے کا ابتدائی دور تھا۔ شیما بائیں بازو کی سیاست میں شامل ہوگئی تھیں، جس میں رقص اور مصوری وغیرہ شامل نہیں تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر فنونِ لطیفہ کا شوق پس منظر میں چلا گیا۔

گو کہ تحریکِ نسواں تنظیم کی بنیاد سنہ 80ء میں رکھی گئی لیکن شیما کی سیاسی سرگرمیاں 1971ء سے شروع ہوئیں جب وہ لندن سے وطن واپسی کے بعد پڑھانے لگی تھیں۔ انہیں اس زمانے میں یہ احساس ہوا کہ عورتوں کی ایک تنظیم ہونی چاہئے جو صرف عورتوں کے حقوق کی بات کرے۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں یہ احساس اس وقت جاگا تھا جب انہیں ذاتی زندگی میں لڑکی اور لڑکے کے درمیان امتیاز نظر آیا۔ حالانکہ شیما کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور لبرل خاندان سے ہے۔ لیکن لڑکپن میں یہ سوال ستاتا تھا کہ لڑکوں کو ہر معاملے میں فوقیت حاصل ہے۔ وہ سوچتیں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر زیادہ خرچ کیا جائے۔ سماج اور ماحول کے حوالے سے بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے۔

بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں کے دوران شیما نے دیکھا کہ ٹریڈ یونین میں عورتوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ سیاسی پارٹیوں میں عورتوں کا ایک ونگ ضرور بن جاتا ہے لیکن وہ مردوں پر انحصار کرتی ہیں۔ یہ تجربہ بھی ہوا کہ عورتیں نہ صرف تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہوتی ہیں بلکہ انہیں اپنی بات کے اظہار کا بھی سلیقہ نہیں آتا۔ اس لئے عورتوں میں اعتماد اور جوش پیدا کرنے کے لئے ایک تنظیم کی ضرورت پیش آئی جو عورتوں کے مسائل اجاگر کرے۔ ابتدا میں تعلیم بالغاں پر زور دیا گا، لیکن جنرل ضیاء الحق کے دور میں جب عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین وضع کئے گئے تو تحریکِ نسواں کی سرگرمیوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ شیما نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ''پرفارمنگ آرٹ'' کو اپنا وسیلہ بنایا۔ فن برائے زندگی کا نصب العین۔

ایک ایسا ملک جہاں رقص کو فحاشی قرار دیا جائے، جس کو بہت سارے برے نام دیئے جائیں وہاں اس فن کو زندہ رکھنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔ خصوصاً ضیا کے دور میں جب عورت کو چادر پہنائی جا رہی تھی، پرفارمنگ آرٹ کے ہاتھ پاؤں کاٹے جا رہے تھے، اظہار گونگا ہو گیا تھا، شیما اس میدان میں ڈٹی رہیں۔ حکومت اور نوکرشاہی کی جانب سے ہراساں کیا گیا۔ بنیاد پرستوں نے ڈرایا دھمکایا۔ مگر شیما نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک ڈرامہ

نولیس اوراداکار کے ساتھ شادی کے بعد کبھی سمجھوتہ نہ کرنے اور تنزل پذیر قوتوں کے خلاف بغاوت کرنے کے ارادے مزید مضبوط ہو گئے۔فن کار جوڑے کی ٹیم نے کھرے جذبوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ راہ کی رکاوٹیں، ناہمواری، تند و تیز موسم۔ انہیں وقت کے ساتھ ان سب سے نبرد آزما ہونا آتا گیا۔

شیما تیرہ برس کی عمر سے رقص سیکھ رہی ہیں۔ سنہ 81ء میں وہ ہندوستان گئیں کہ کل وقتی پیشہ وارانہ انداز میں کلاسیکی رقص کی تربیت حاصل کریں۔ سنہ 84ء میں پہلی بار تین چار سو حاضرین کے سامنے سولو رقص پیش کیا تو ان کے لئے یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔ 1990ء میں ایک سال کے سکالرشپ پر بھارت گئیں اور دہلی میں گرو آلو کا پاٹیکر سے رقص کی مزید تعلیم حاصل کی۔

بقول شیما کے رقص ہر شخص کے اندر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ وہ اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ وہ ہر بار اپنے ماحول، ثقافت اور عہد کے مطابق اسے از سر نو تخلیق کرتا ہے۔ ہمارے ہاں فن کی صنف کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا کہ رقص اپنے ناظرے سے گفتگو کرتا ہے۔ یہ اظہار و ابلاغ کا ایک تمثیلی روپ ہے۔ شاعر اور ادیب سب کچھ الفاظ میں کہتا ہے، مصور رنگ و نقش کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے، جبکہ رقاص کیفیات کو، اپنے جذبوں کو جسم کی حرکات سے بیان کرتا ہے۔

لیکن رقص کے بارے میں کام رویے بہت حوصلہ شکن ہیں۔

ہال میں شو ہو رہا تھا۔ وہاں فن کے سچے قدر دانوں کے علاوہ بازار حسن کے گھٹیا خریداروں میں سے بھی کوئی تھا، جس کی داد لچر تھی، بیہودہ تھی۔

مالک مکان نے نوٹس دیا کہ آپ کے گھر سے گھنگھروؤں کی آواز آتی ہے۔ آپ گھر خالی کر دیں لیکن عدالت نے فنکار کرائے داروں کے حق میں فیصلہ دیا۔

چند دوستوں کے ساتھ مل کر سندھ کے علاقے تھر کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ واپسی پر ایک وڈیرے کے ہاں قیام کیا۔ میزبان سے شیما کا تعارف کروایا گیا کہ یہ ہمارے ملک کی ممتاز کلاسیکی ڈانسر ہیں۔ میزبان نے بہت آؤ بھگت کی۔ بڑے چاؤ سے کہا جب میرے بیٹے کی شادی ہو گی تو میں آپ کو ضرور بلاؤں گا۔

اس طرح کے بے رحم ماحول میں، نا سمجھ گرد و پیش اور بے شمار مخالفتوں میں گھرے

MashalBooks.org

رہنے کے باوجود مستقبل کا پروگرام کہ وہ رقص کا ایک تربیتی ادارہ قائم کریں گے، پاگل پن نہیں تو کیا ہے۔ لیکن شیما ایسا ضرور کریں گی۔

''تمام فنونِ ادائیگی، خصوصاً رقص، انسانی جسم اور اس کی قدر و منزلت کے تصور پر مبنی ہے۔ ایک بار جب عورت اپنے احساسِ کمتری کو ختم کر دیتی ہے (رقاصاؤں کو ایسا کرنے کی تربیت دی جاتی ہے) تو مرد اسے اپنے لئے خطرہ خیال کرتا ہے جس کی طاقت اور فضیلت کا تعین عورت کے کمزور اور لاغر جسم کے تقابل سے ہوتا ہے۔ مرد اور مردانہ ریاست رقص کو آزادی، خود اعتمادی اور طاقت کے ساتھ مربوط کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فن کی اس صنف کو دبایا جاتا ہے۔

شیما نے اپنے مقالے ''رقص اور ڈرامہ............عورت کی قوت اور مزاحمت کا مظہر'' میں لکھا۔

شیما کو یقین ہے کہ وہ ایک روز لوگوں کی سوچ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ گلیوں محلوں میں پیش کئے گئے ان کے ڈرامے، بہت دیر سے سہی، لیکن ایک روز اپنا اثر ضرور دکھائیں گے۔

بیجنگ کانفرنس کے دوران ہویرو کے این جی او فورم کی ایک ثقافتی شام میں شیما نے ایک انقلابی نظم پر مبنی رقص پیش کیا۔ اس موقع پر شیما کی پیشکش ''ون وومن شو'' پسماندہ ذہنوں کے درمیان زندگی کرنے والی عورت کی داستان کھچا کھچ بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں تالیوں کی گونج شیما کے لئے داد و تحسین دے رہی تھی۔

MashalBooks.org

# مدیحہ گوہر

مارشل لا کے دور میں نصب العین واضح تھا۔ آپ کا ایک براہ راست دشمن تھا۔ ایسا طرز حکومت جسے آپ ٹارگٹ کر رہے تھے۔ لیکن نام نہاد جمہوریت کی بحالی کے بعد بھی لوگوں کو کوئی سمت نہیں مل رہی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کا دشمن کون ہے اور دوست کون۔

''اجوکا'' کی نئی پیشکش۔ ''بالا کنگ'' کی کہانی بریخت کے ایک ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ اس موقع پر ہدایت کار مدیحہ گوہر نے کہا کہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کے لئے ہمیں غیر ملکی اداروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بالا کنگ لاہور کے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں پیش کیا گیا جس کی کہانی بادامی باغ کے ایک غنڈے بالا پہلوان کے گرد گھومتی ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کے جیتے جاگتے کردار۔

سنہ 84ء میں پہلی پیش کش ''جلوس'' سے ''بالا کنگ'' تک اجوکا نے اپنے سفر کے دوران کئی سنگ میل نصب کئے، کئی سوال اٹھائے اور بہت سے مسائل کو زبان دی۔

مدیحہ کہتی ہیں: تھیٹر میرا شوق، میرا کام، میری تخلیق اور میرا ایکٹوزم ہے۔

اجوکا کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب مدیحہ گوہر کو کالج کی ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے حکمرانوں کی طرف سے ایک شوکاز نوٹس موصول ہوا تھا کہ آپ نے سیاسی سرگرمیوں میں کیوں شرکت کی۔ اس کے بعد ان کا مطالبہ تھا کہ ایک بانڈ پر دستخط کئے جائیں کہ آپ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گی۔ مدیحہ نے انکار کر دیا تو ملازمت کی برطرفی کا پروانہ تھما دیا گیا۔ اس سے پہلے انہیں ٹی وی پر بھی ایسی ہی وجوہات کی بنا پر بین کر دیا گیا تھا۔

''اجوکا'' دراصل پرانی پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''آج کا''۔

MashalBooks.org

دراصل یہ ایک احتجاج تھا اس دور کے رجحانات کے خلاف جب ٹیلی ویژن پر رجعت پسند ادیبوں کے ڈرامے دکھائے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی عوامی سرگرمیوں پر پابندیاں تھیں۔ اجوکا ایک عزم تھا جو احساسات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنا۔ اس کے پہلے ڈرامے ''جلوس'' کو لاہور کے ایک گھر کے لان میں پیش کیا گیا تھا۔

مدیحہ نے ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ کو بائیں بازو کی سیاست میں ملوث پایا۔ ان کے والد فوجی اور فرنٹیئر سے تعلق رکھتے ہیں جن کا انتقال مدیحہ کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ والدہ گجرات (ہندوستان) کی ہیں۔

مدیحہ یاد کرتی ہیں: ''یہ غالباً ساٹھویں دہائی کی بات ہے۔ ویت نام سے ایک وفد آیا تھا۔ پھر جب بھاشانی آئے تو ہم انہیں ملنے ایئرپورٹ گئے تھے۔ بنگلہ دیش بن رہا تھا۔ گھر میں جو لوگ آتے تھے ان کا مطمح نظر اور ہوتا تھا۔ وہ پاکستانی فوج کی زیادتیوں کے خلاف تھے لیکن سکول میں کچھ اور طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔''

مدیحہ نے ابتدائی تعلیم سینٹ جیز اینڈ میری کانوونٹ اور گریجویشن کنیئرڈ کالج سے کیا جبکہ انگریزی ادب میں ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔

''کنیئرڈ کالج ایک آئیوری ٹاور تھا جہاں ایک مخصوص طبقے کی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے شوق اور دلچسپیاں بہت محدود تھیں۔ شادیوں کی باتیں، فیشن کی باتیں لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کا ماحول مختلف تھا۔ میری سرگرمیوں کا آغاز دراصل اس زمانے میں ہوا جب ویمن ایکشن فورم بن چکا تھا اور اس میں شریک تھی۔

بچپن میں طبقاتی تفریق کا بھی احساس ہوا جب بچوں کو منع کیا جاتا تھا کہ نوکروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنا لیکن ہم آدھا آدھا دن نوکروں کے کوارٹروں میں کھیلتے رہتے۔ اسی حوالے سے غریب طبقے کو قریب سے دیکھا جن کی عورتوں کو مار پڑتی تھی۔ جن کی جوان لڑکیوں پر جن آتے تو اسے نکالنے کے لئے عامل آتا تھا۔

مدیحہ نے 17 سال کی عمر سے ٹیلی ویژن پر کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت ایک جملہ اکثر کان میں پڑتا تھا کہ ''شریف گھروں کی لڑکیاں ٹیلی ویژن پر کام نہیں کرتیں۔'' لیکن مدیحہ کو ایک مخصوص طبقے کی حدود سے نکل کر ٹیلی ویژن پر ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جہاں ہیرا منڈی کی لڑکیاں بھی چھوٹے کرداروں کے لئے آتی تھیں۔

مدیحہ فطرتاً دھن کی پکی ہیں۔ سمجھوتہ ان کی لغت میں نہیں ہے۔ ان کی پہلی شادی کی ناکامی ان کے اسی اصول کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اس پر یقین رکھتی ہیں کہ عورت کو مضبوط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مرد کو اس کے ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ عورتوں کے حق میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک مرد اس کی حمایت نہ کریں۔ اس کے علاوہ حکومتوں کی پالیسیاں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے ''نیلے ہاتھ'' پیش نہیں کیا جا سکتا تھا اگر اسے سرکاری حمایت حاصل نہ ہوتی۔ خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے ''جنجال پورہ'' ایک مقبول سلسلہ تھا، لیکن سیاسی منظر کی تبدیلی کے ساتھ اسے بند کر دیا گیا کہ وہ بہت ''فحش'' تھا۔

''اجوکا'' کے زیر اہتمام موضوع اور موقع محل کے اعتبار سے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں۔

ہمارا مقصد ڈرامے کے ذریعے عوامی شعور بیدار کرنا ہے۔ بیشک صرف تھیٹر کے ذریعے معاشرتی انقلاب نہیں لایا جا سکتا لیکن پھر بھی ایک بات کہیں نہ کہیں تو پہنچ جاتی ہے۔ نیز ہمارے ہاں معیاری تھیٹر کے ضمن میں ایک خلا ہے جسے اجوکا نے اپنے تئیں پر کرنا کی کوشش کی ہے۔ اجوکا کی پنجابی ڈراموں پر مبنی ایک کتاب ''کھسماں کھانیاں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔

تھیٹر کو کامیابی سے چلانے کے بارے میں مدیحہ کا کہنا ہے کہ لاہور کے لوگوں کو فیوڈل روایات ابھی تک بہت سخت ہیں۔ اس کے برعکس کراچی ایک مختلف شہر ہے۔ وہاں تھیٹر کے لئے اچھے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں باآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں جبکہ لاہور والے آج بھی تھیٹر کو طوائفوں اور کنجروں کا کام کہتے ہیں۔

مدیحہ گوہر ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے کام کو ایک مشن کے طور پر کرتے ہیں۔ انہیں مالی مفادات سے غرض نہیں ہوتی۔ اس دور میں جب آئیڈیالوجی، مفادات پر انحصار کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے، وہ اپنی کمٹ منٹ پر قائم ہیں۔ اجوکا، آنے والے کی بات بھی کہے گا، کیونکہ کل بھی کوئی نہ کوئی، کہیں نہ کہیں بالا کنگ تو رہے گا۔

Mashalbooks.org

# ہما صفدر

''پورے ملک میں پنجاب ہی صرف ایک ایسا صوبہ ہے جہاں سے پنجابی زبان میں کوئی اخبار نہیں نکلتا۔ جہاں سے پنجابی زبان میں کوئی اخبار نہیں نکلتا۔ کوئی پنجابی رسالہ کامیاب نہیں ہوتا۔ پنجابی کہتے ہیں کہ ہم صرف پنجابی نہیں بلکہ پاکستانی ہیں۔ یہاں پر متوسط طبقے کی ماؤں نے اپنے بچوں کو رضا کارانہ طور پر مادری زبان کے بجائے اردو بولنا سکھایا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو رضا کارانہ طور پر مادری زبان کے بجائے اردو بولنا سکھایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم پاکستان کی خدمت کر رہے ہیں لیکن پاکستان کے لئے کچھ نہیں ہو رہا۔ سب اپنے فائدے کی بات کرتے ہیں۔ پنجاب کے اونچے طبقے کے لوگ خود کو پنجابی نہیں کہتے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شناخت بیچ دی ہے۔ ان کی عزت نفس ختم ہوگئی ہے۔''

''لوک رہس'' پنجابی تھیٹر کی روح رواں ہما صفدر کہتی ہیں '' پنجاب سب سے بڑا استحصالی صوبہ ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جس کا سب سے زیادہ استحصال کیا گیا۔ ہم پنجابی کی بات کرنے ہیں تو کچھ لوگوں کو برا لگتا ہے۔ وہ اسے ہمارا شاؤنزم خیال کرتے ہیں۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ ہم تو عوام کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ نہ ہی ہم سندھ کی طرح پنجاب کو لسانی تنازعے میں ڈالنا چاہتے ہیں لیکن جب آپ اپنا پیغام دیہاتوں میں پہنچانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو پنجابی ہی میں بات کرنی ہوگی۔ اجوکا گروپ سے ہمارا یہی اختلاف تھا۔''

ہم میں سیاسی شعور اس وقت پیدا ہوا جب وہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی طالبہ تھیں۔ ملک میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد سٹوڈنٹس کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی جس کے ردعمل میں نوجوان طبقے میں بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ وہ حیلوں بہانوں سے ایسی رکاوٹیں دور کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خلاف احتجاج کی راہیں تلاش کرتے تھے۔

''ہم نے ایک تھیٹر گروپ بنایا۔ اس کے تحت کالج میں ڈرامے سٹیج کرتے۔ پھر

مذاکرات ہوتے۔ یہ غالباً 83ء کی بات ہے۔ جب تحریک خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ یہ وہ دور تھا جب بہت سی تنظیمیں ویف کے پلیٹ فارم پر جمع ہوتی تھیں۔ تھیٹر اس وقت کی بڑی ضرورت تھی۔ الیکٹرانک میڈیا تو حکومت کے کنٹرول میں تھا ہی، اخبارات پر بھی سنسر شپ تھی۔ انہی حالات کے مدنظر اجوکا کا ڈھانچا بنا اور ہم بہت سے لوگ اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ اجوکا کے ڈرامے صرف اردو میں ہی ہونے چاہئیں تو اس سے اتفاق نہیں کیا گیا، جس کے نتیجے میں ایک گروپ اجوکا سے الگ ہو گیا اور ''لوک رہس'' بنا۔ کیونکہ اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم عوام کی آواز ہی تو پھر تھیٹر کے لئے انہی کی زبان اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

ہما صفدر کی ذہنی تربیت کم سنی میں ہی اپنے والد کے خیالات، نظریات اور ان کی الماریوں میں موجود سوویت یونین کے لٹریچر سے ہوئی۔ ان کا اصرار ہوتا تھا بلکہ بقول ہما کے وہ اس پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ عوام کے مسائل کا حل اجتماعی کوششوں میں ہے۔

''وہ ایک چھوٹے سے چائے خانے کا منظر تھا۔ اس کی کہانی ایک عورت کے گرد گھومتی ہے۔ وہ بائیں بازو کے سیاسی گروپ کی کارکن ہے۔ ''لوک رہس'' کے پہلے کھیل ''ھنیر ے دا پنڈ'' کی کہانی میں کوئی حل پیش نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک دعوت دے رہا تھا کہ اتحاد میں بہت طاقت ہے۔ اگر عوام مل کر قدم اٹھائیں تو ہم بہت سی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ غریبوں کا استحصال ختم ہو سکتا ہے۔ ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔

یہ کھیل پہلی بار عورتوں کے عالمی دن 8 مارچ 1986ء کو پیش کیا گیا تھا۔

لوک رہس کی فنڈنگ کون کرتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہما کا کہنا تھا ''فنڈنگ ہماری طاقت نہیں بلکہ ہمارا سیاسی نظریہ ہے۔ ہم سے بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کو پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے بڑے بڑے سرمایہ داروں میں سے کوئی ہمیں آنہ دینے کو تیار نہیں۔ یہ تو اب جا کر ہوا ہے کہ پہلے کہیں سے پیسہ آتا ہے اور پھر سیاسی سرگرمی شروع ہوتی ہے۔

''ویسے بھی ہمارے ڈراموں پر کوئی بڑا خرچہ نہیں آتا۔'' ہما نے اپنی بات جاری رکھی ''مجھے یاد ہے جب ہم نے اپنا پہلا کھیل کیا تو صرف 300 روپے خرچ آیا تھا۔ ہمیں

مہنگے سٹیج کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہمارے کھیل میدان اور گلی کوچوں میں ہوتے ہیں۔ ہم کاسٹیومز پر یقین نہیں رکھتے۔ عام شادی گھروں والی بتیوں میں ڈرامہ کر لیتے ہیں۔ اگر کسی جگہ بجلی نہیں ہوتی تو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جلا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔

ہما صفدر لاہور گرامر سکول میں آرٹ ٹیچر ہیں اور انہیں اپنے اس کام سے محبت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے لوک رہس سے کبھی ایک پیسہ نہیں کمایا۔ البتہ ہم نے سنگیت منڈلی اور لوک لہر کے نام سے کمرشل تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں۔ ہم سیاسی پارٹیوں کے لئے پوسٹرز اور بینرز وغیرہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیزائننگ اور پبلسٹی کے دیگر کام کرتے ہیں۔ لوک رہس میں شامل ہمارے کئی ساتھی ان میں باقاعدہ ملازم ہیں۔

لوک رہس کے تحت لاہور میں قلعہ گجر سنگھ سے لے کر لنڈا بازار تک، مغلپورہ، شالامار اور دیگر مزدور بستیوں میں سٹریٹ ڈرامے پیش کئے جا چکے ہیں۔ البتہ آئندہ پیش کئے جانے والے ڈراموں کے افتتاحی شو کسی ہال میں منعقد کر لئے جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات عموماً عورتوں کے ایشوز اور استحصال شدہ طبقے کے بارے میں ہوتے ہیں۔

''مثلاً'' ہما نے کہا ''بڑی طاقتیں ہمارے عوام کو کنزیومر بنا رہی ہیں۔ ادھر مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارا مقصد انہیں یہ بتانا ہے کہ اس قسم کے حالات میں گزر اوقات کیسے کی جا سکتی ہے۔ ان ڈراموں میں بھٹو پر لکھا ہوا فخر زمان کا ڈرامہ ''بندی وان'' بھی شامل تھا۔

ہما صفدر شادی شدہ ہیں اور ان کا ایک بیٹا ہے۔ وہ بنیادی طور پر پینٹر ہیں۔ کہتی ہیں:

''میں لوک رہس میں اتنی زیادہ مصروف ہو جاتی ہوں کہ مجھے پینٹ کرنے کا وقت نہیں ملتا مجھے اس کام سے بہت لگاؤ ہے، کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں اس میڈیم کے وسیلے سے بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔

MashalBooks.org

# ثمینہ احمد

''ٹیلی ویژن ڈراموں میں کارکن عورت دکھائی نہیں دیتی تھی یا کبھی ایسا ہوتا تو اس کا منفی کردار دکھایا جاتا تھا جیسے کہ وہ عورت جو اقتصادی طور پر خودکفیل ہے وہ اچھی عورت نہیں ہے۔ وہ گھر اور بچوں کی طرف سے لاپرواہی برتتی ہے۔ وہ ایک بے حس سوسائٹی وومن بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس گھر میں بیٹھی ہوئی عورت نیک، وفا شعار، شوہر کی خدمت گار ہوتی ہے۔''

ثمینہ احمد ضیا دور میں عورت کے بارے میں ''چادر اور چار دیواری'' کے بنیادی نظریے کے تحت لکھے گئے اور ٹیلی ویژن پر پیش کئے گئے ڈراموں کا تجزیہ پیش کر رہی تھیں۔

''اور پھر دوپٹے کے ایشو کو خواہ مخواہ ایک بڑا مسئلہ بنا لیا گیا۔ نیوز کاسٹرز اور کمپیئرز کے سروں پر دوپٹے اوڑھا دیئے گئے تھے۔ ڈراموں کے لئے بھی کچھ اسی قسم کے احکامات آتے تھے۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ ڈرامے حقیقت کے قریب ہونے چاہئیں مگر ان دنوں دوپٹے کی پابندی اس قدر مضحکہ خیز ہوگئی تھی کہ عورت اگر سو بھی رہی ہے تو اس کے سر پر دوپٹہ ہے۔ وہ پانی میں ڈوب بھی رہی ہے تو سر پر دوپٹہ لئے ہوئے ہے۔

''اسی طرح تھیٹر کے لئے ڈائریکٹو آتے تھے۔ اچھا لکھنے والوں پر بالواسطہ پابندی لگا دی گئی تھی۔ آرٹس کونسل کی طرف سے ان کی فنڈنگ بند کر دی گئی۔ اگر کبھی کسی کا سکرپٹ منظور ہو جاتا تو حکام اپنی احتیاطی تدابیر کچھ اس طرح کرتے کہ اگر یہ خطرہ ہوتا کہ کہ کوئی ترقی پسند ڈائریکٹر اس ڈرامہ کی ہدایات دے گا تو کہیں اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ڈال دے۔ چنانچہ غیر سرکاری طور پر متعلقہ افسر تک یہ عندیہ پہنچا دیا جاتا کہ ''یار اونوں ڈئریکٹر نہ رکھیں'' (یار اس کو ڈائریکٹر نہ رکھنا)۔

ثمینہ احمد بنیادی طور پر اداکارہ ہیں۔ انہوں نے دو ڈھائی عشروں کے دوران ٹیلی ویژن اور سٹیج پر بے شمار یادگار کردار ادا کئے۔ بقول ان کے انہوں نے ہر دور حکومت میں خود

MashalBooks.org

کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے منوانے کے لئے اداکاری نہیں چھوڑی لیکن انہوں نے اسے ہمیشہ اظہار کا ایک پراثر وسیلہ خیال کیا۔ وہ گزشتہ 18-17 برسوں سے الحمرا آرٹس کونسل کے ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں تھیٹر کے رنگ ڈھنگ، ارتقا اور زوال ان سب چیزوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔

ثمینہ نے گزشتہ پچاس سال کے پاکستانی تھیٹر پر تحقیقی مقالہ لکھا تو یہ واضح ہوا کہ چاہے وہ ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا ہو یا اسٹیج پر ''مارشل لاء سے پہلے، دوران میں اور بعد میں'' ڈرامے میں بہت واضح تقسیم ہے۔ مارشل لاء حکام نے جب دانشوروں پر پابندیاں لگا دیں تو ''معمولی قابلیت'' کو ابھرنے کا موقع دیا گیا، کیونکہ ان سے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔اعلیٰ پائے کے تھیٹر گروپ جو ملکی ثقافت کے بڑے دھارے میں شامل تھے انہیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اگر وہ اپنا کوئی ڈرامہ اسٹیج کرنا چاہتے تھے تو اول تو انہیں این او سی ہی نہملتا، کوئی ہال میسر نہ آیا۔ وہ اپنے ڈرامے کی تشہیر نہ کر سکتے تھے۔ نیز ماحول میں ایک خوف سا رچا ہوا تھا جس کی بنا پر لوگ ان کے ڈرامے دیکھنے نہیں جاتے تھے۔

ثمینہ گزشتہ تمام برسوں میں این جی اوز یا اپنی تنظیمیں اور تحریکیں جو عورتوں، بچوں اور مزدوروں کی بہتری کے لئے کام کر رہی ہیں، ان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر شریک رہی ہیں۔

''ویف کے پہلے اجلاس میں جب مارشل لاء حکام کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا تو ثمینہ نے گویا انہیں ''بلینک چیک'' دے دیا کہ کسی بھی موقع پر جہاں کہیں بھی میری پرفارمنس کی ضرورت ہو، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ شعیب ہاشمی کے لکھے ہوئے ''ہا کی ٹیم اور آدھی گواہی'' کے سکٹس متعدد بار سٹیج پیش کئے گئے۔ ثمینہ ان میں شامل تھیں۔ بیجنگ کانفرنس سے پہلے اور بعد میں خواتین کی قومی سطح کی کانفرنسوں اور تصویری نمائشوں کے انعقاد کے لئے ثمینہ کا بھرپور تعاون شامل تھا۔

ثمینہ نے ڈرامے پر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''بھٹو کے دور میں بھی ایک طرح کی پابندی یا سنسر شپ تھی۔ مثلاً ایک بار ہم نے مغلوں کی تاریخ پر ایک کھیل تیار کیا لیکن اسے روک دیا گیا کہ اس میں مغلوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ یا پھر دنیا کے اہم ڈراموں کو اردو میں پی ٹی وی پر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

''البتہ ضیا دور میں کمرشل تھیٹر کو خوب مقبولیت ملی۔ بے معنی تفریح پر کوئی پابندی نہیں تھی۔لغوقسم کے مزاح پر لوگ بہت خوش ہوتے اور ستے مذاق پر خوب جی بھر کر ہنستے ؟

اب جب جمہوریت کا دور آ گیا تو یقیناً فضا میں کشادگی آئی ہے۔لیکن نقصان یہ ہوا ہے کہ ٹیلی ویژن ڈرامے آرٹ فورم کے بجائے کمرشل ہو گئے ہیں۔ان میں بلاوجہ گلیمر ڈالا جاتا ہے۔

شاید وہ دور ہمارے ہاں کبھی نہ آئے جب تھیٹر کمپنیوں کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کی جائے۔انہیں حکومتی تعاون اور مالی امداد ملے گی۔آرٹس کونسلوں کے قیام کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مختلف آرٹ فورمز کو فروغ دیا جائے،لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ محض خانہ پری ہے۔فنونِ لطیفہ کی حوصلہ افزائی یا فروغ ہمارے مزاج میں ہی شامل نہیں ہے۔

ثمینہ اس پر یقین رکھتی ہیں کہ معاشرتی تبدیلی کے لئے سٹیج ڈرامہ ایک مضبوط میڈیا ثابت ہوسکتا ہے۔وہ نوعمر لڑکے لڑکیوں کو سٹیج اداکاری کی تربیت بھی دیتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ایسے نوجوان جو بے روزگار ہیں اور اداکاری میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اگر ڈرامے کی تکنیک سے واقفیت حاصل کر لیں تو وہ غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر ڈرامے پیش کر سکتے ہیں۔بلکہ اس کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ایک نئے تھیٹر گروپ نے اندرون پنجاب کے دیہاتوں میں معاشرتی مسائل پر مختصر کھیل پیش کیے اور اپنا پیغام عام لوگوں تک پہنچایا۔

ثمینہ احمد کی شادی ملک کے ایک مشہور فلمی ہدایت کار سے ہوئی تھی جن سے کئی برس پہلے علیحدگی ہوگئی تھی۔وہ کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گئے۔ثمینہ کے دو بچے ہیں۔

# عظمیٰ نورانی

انسانی حقوق کمیشن کی جانب سے الیکشن واچ کے لئے مختلف گروپ بنائے گئے۔ عظمیٰ اس کی رکن ہیں۔ کراچی پریس کلب میں شہر کی مختلف تنظیموں کی جانب سے خواتین کے لئے امتیازی قوانین کے خلاف ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا ہے، عظمیٰ اس میں شریک ہیں۔ شہر میں دہشت گردی اور بدامنی کے خلاف مظاہرہ ہو رہا ہے، عظمیٰ بینر اٹھائے ہوئے ہیں۔ شرکت گاہ میں ماورائے عدالت قتل کے خلاف اجلاس ہو رہا ہے، عظمیٰ سرگرمِ عمل ہیں۔

انہیں بچپن میں کوئی شوق نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی فعال زندگی گزاریں گی۔ انسانی حقوق کی پامالی پر احتجاج کریں گی۔ عورتوں کے ساتھ زیادتی کے خلاف جدوجہد کریں گی۔ بچپن پرامن تھا، زندگی میں آسائشیں میسر تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ زندگی رواں دواں تھی۔ ملک کے ایک ممتاز پبلشر پرنٹر کے بیٹے کے ساتھ شادی ہوئی اور امریکہ چلی گئیں۔ واپس لوٹیں تو ساس سسر کے ساتھ رہنے لگیں۔ سسر کا یہ عالم تھا کہ وہ ترقی پسند مصنفین کو عزیز رکھتے تھے۔ سبط حسن، فیض، سجاد ظہیر، ابن انشاء جیسی شخصیات کی تصانیف کی اشاعت ان کی اولین ترجیح تھی۔ ساس نے ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ عظمیٰ امریکہ سے لوٹیں تو ان کی ساس چونکہ ایک بڑی تنظیم کی صدر تھیں اس لئے عورتوں کے اجلاس اکثر گھر میں منعقد ہوتے تھے۔ اس پر عظمیٰ کی سوچ کا رخ ان کاموں کی طرف مڑ گیا۔ یہ وہ دور تھا جب مارشل لاء کی وجہ سے بہت سی معاشرتی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین وضع کیے گئے تھے۔ اخبارات پر سنسر تھا۔ اظہار پر ایسی پابندیوں کی وجہ سے ایک گھٹن پیدا ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں خواتین محاذ عمل (WAF) اور تحریک نسواں عمل میں آ چکی تھیں۔ تحریک نسواں کی جانب سے رکنیت کی پیشکش ہوئی تو عظمیٰ کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں سب سے پہلے ان کی ساس تھیں۔ چنانچہ وہ 1989ء میں تحریک نسواں میں شامل ہوگئیں۔ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

MashalBooks.org

عظمیٰ کے والد خاصے سخت گیر تھے۔ اس کے برعکس والدہ لبرل تھیں۔ عظمیٰ کا کہنا ہے کہ میری امی اسے تسلیم کریں یا نہ وہ ہمیشہ سے عورتوں کے حقوق کی کٹر حامی تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے اپنی بیٹیوں کو اپنے حق کے لئے لڑنے اور بولنے کا حوصلہ دیا۔ ان کے ابا نے عظمیٰ کی بڑی بہن کو ملازمت کرنے کی اجازت نہ دی مگر عظمیٰ نے بہن کو حوصلہ دیا اور ہمت بڑھائی کہ وہ ملازمت کی پیشکش قبول کر لے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ خیر انہوں نے ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ تک ابا اس سے ناراض رہے۔ بات نہیں کرتے تھے لیکن ایک پیش قدمی ہوئی تھی جو وقت کی ضرورت تھی۔ کچھ عرصہ بعد والد نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ بعد میں جب عظمیٰ نے ملازمت کی تو ابا ناراض نہیں ہوئے۔ عظمیٰ کو اس کا خوشگوار احساس ہے کہ اگر اس وقت ہم بہنیں ابا کے رعب کے مارے پسپا ہو جاتیں تو ہمارے بعد میں آنے والوں کے لئے راہیں نہ کھلتیں۔ نوعمری میں جب عظمیٰ اور ان کی بہنوں کو اپنی کس بات کے لئے دلائل دینے پڑتے اور یہ ظاہر کرنا ہوتا کہ ہمارا یہ تقاضا حق بجانب ہے تو انہیں اپنی والدہ کی حمایت اور اعانت حاصل ہوتی۔ عظمیٰ کی چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔

عظمیٰ کو شادی کے بعد سیاسی اور سماجی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے میں جہاں سسرال میں سازگار ماحول میسر آیا وہاں شوہر کا بھی تعاون حاصل رہا۔ البتہ جب وہ کسی موقع پر جوش و جذبہ کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑتی ہیں تو ان کی طرف سے محتاط رہنے کا مشورہ ضرور ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عظمیٰ کی فطری بے خونی نے کبھی اس پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ساس کہتی ہیں کہ ''تمہیں دیکھتی ہوں، تمہارے جوش و خروش کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی جوانی یاد آتی ہے۔'' ایک وہ دن بھی تھا جب سیاسی مظاہرے کے خلاف آنسو گیس پھینکی گئی تھی، لاٹھی چارج کیا گیا تھا اور عظمیٰ کی ساس گرفتار ہو گئی تھیں۔ بہو ساس کو چھڑانے جا رہی تھیں۔

عظمیٰ ویف کی ورکنگ کمیٹی کی رکن ہیں۔ عظمیٰ کا کہنا ہے کہ جب بچے چھوٹے تھے تو بعض مشکلات درپیش تھیں۔ مثلاً جب وہ کسی میٹنگ کے لئے جانے لگتیں تو بچے کہتے کہ آپ پھر جا رہی ہیں۔ آپ کی ہر وقت میٹنگز ہی ہوتی رہتی ہیں۔ عظمیٰ کے دو بیٹے اور

ایک بیٹی ہے۔ بیٹی اب اٹھارہ سال کی ہوگئی ہے اور وہ بھی ماں کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو نورانی گھرانے کی تیسری نسل بھی سرگرم عمل ہو جائے گی۔

جب عظمیٰ کے بچے سکول جانے کی عمر کو پہنچے اور اس ضمن میں کچھ مشکلات پیش آئیں تو یہ خیال آیا کہ اگر ہمیں بچوں کے بہتر سکولوں میں داخلے کے لئے تگ و دو کرنا پڑتی ہے تو بھلا غریب بچوں کا کیا حال ہوگا۔ اس پر اپنے ملک کے تعلیمی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اس ضمن میں مختلف کورسز کئے اور کچھ عرصہ ایک گوٹھ کی کچی آبادی میں واقع ایک سکول میں پڑھایا بھی پھر وہ سکول بوجوہ بند ہو گیا۔

عظمیٰ کا کہنا ہے کہ ویف اب میرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ انہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ وہ اور ان کے گروپ کی دیر خواتین اپنی ذات یا اپنے مفاد سے ہٹ کر دوسروں کی بہتری کے لئے کام کرتے ہیں۔ عظمیٰ گزشتہ کئی برسوں سے ویف کے مختلف منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ ان کا مقصد ملک کے سیاسی عمل میں تبدیلی لانا ہے۔

آج کل عظمیٰ ماورائے عدالت ہلاکتوں سے متاثرہ خاندانوں کے لئے کام کر رہی ہیں سچ میں بے گھر افراد کی آباد کاری، ان کی مالی امداد کے علاوہ ایسے بچے جو دراصل مجرم نہیں تھے مگر افراتفری میں پکڑے گئے، انہیں انصاف دلانا شامل ہے۔

عظمیٰ اپنے شوہر کے ساتھ کتابوں کی مارکیٹنگ کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ انہیں ہمارے ہاں کتابوں کے مطالعے کی عادت نہ ہونے اور بتدریج کم ہو جانے پر افسوس ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ ایک مختلف قسم کی کتابوں کی ایک دکان کھولیں۔ ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں اس دکان کا خیال ہو جس کا ذکر ناول ''سن رائز ایٹ ٹیکساس'' میں کیا گیا ہے کہ لوگ آئیں، کتابیں دیکھیں، دکن کے ایک کونے میں بیٹھ کر چائے کافی پئیں اور کتاب کو خریدنے کا ارادہ کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ کریں۔

بہرحال عظمیٰ نورانی کو اس کا افسوس ہے کہ نئی نسل کتابوں میں عدم دلچسپی کے علاوہ سماجی سرگرمیوں میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ ان کا رویہ لاتعلقی کا سا ہے۔ مادیت پرستی کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

MashalBooks.org

# نفیسہ شاہ

''کراچی میں خوش آمدید، روشنیوں کا شہر، کنکریٹ جنگل، ابلتے ہوئے سیوریج، بہرا کر دینے والا شور وغل، پرہجوم سڑکیں، پیاسے لوگ اور دوپہر میں تاریکی۔''

کراچی پیکیج پر لکھے گئے نفیسہ شاہ کے ایک مضمون کا انٹرویو۔

ایک اور مضمون کی ہائی لائٹ ''تمہارا نام بشر خان ہے، تم بلدیہ کے علاقے رشید آباد میں رہتے ہو۔ تم ایک لڑکے کے بوڑھے باپ ہو جو پولیس فائرنگ میں مارا گیا ہے۔ وہ مارا گیا پانی مانگنے کے لئے۔''

نفیسہ ایک کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھ رہی ہیں۔ موضوع ہے:

''ہجرت، غربت او ماحولیات'' چھوٹے کسانوں اور صنعت کاروں کو موجودہ منڈی کی معیشت میں گزارہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسے میں انسانی حقوق، جمہوریت، مساوات اور آزادانہ تجارتی نظام کی بات کرنا بالکل بے مقصد ہے۔''

نفیسہ شاہ کو عملی زندگی میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ ہر جگہ، ہر طرح کا کام کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ جواں نسل کی نمائندہ جو ارادے سے عمل تک جاتے وقت یقین، آغاز سے تکمیل تک بھرپور ذمہ داری اور شخصی اعتبار، ان جزئیات کو ان عناصر کو یکجا کر دیں تو نفیسہ کا سلونا چہرہ بن جاتا ہے۔

نفیسہ نے گریجویشن کیا تو خود مختار اور باعمل زندگی گزارنے کے ارادے سے مختلف سکولوں میں پڑھایا۔ اس کے بعد ایک ماہنامے میں بطور آرٹسٹ ملازمت کر لی۔ نفیسہ شاہ کی مختصر زندگی کے بہت سارے محاسن ہیں۔ بناتی ہیں تو ان کا موضوع عورت ہوتی ہے۔ روایات کی چکی میں گھن کی طرح پسنے والی عورت۔ جس کے چہرے پر کرب ہے، آنکھوں میں وحشت ہے۔ جس کا جسم اس کی شخصیت کی تعمیر نہیں کرتا بلکہ اس کے اعضا ایک مشین کے کل پرزوں کی مانند ہیں۔ سندھ کی عورتیں پرانے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں

MashalBooks.org

کوایک دوسرے کے ساتھ سوئی دھاگے سے جوڑتی ہوئی رلی بنا دیتی ہیں۔نفیسہ کے ہاں وہ رلی علامت ہے عورت کے حقوق کی پامالی کی،عورت کو انسان نہ سمجھنے کی روایت کی۔

بیجنگ کانفرنس کے ورلڈ پویلین کے ایک پاکستانی سٹال پر بہت رش تھا۔نفیسہ شاہ کی تصاویر پرمبنی پوسٹرز دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے۔ ان شائقین میں زیادہ تر یورپی خواتین تھیں۔ دس روزہ کانفرنس کے دوران پاکستان سے مزید پوسٹرز منگوائے گئے اور وہ بھی اسی طرح اڑا لئے گئے۔نفیسہ شاہ بیجنگ نہیں گئیں۔ وہ ان دنوں کسی تربیتی ورکشاپ کے سلسلے میں لاطینی امریکہ میں تھیں۔

نفیسہ شاہ کا تعلق سندھ کے ایک ممتاز سیاسی گھرانے سے ہے۔ انہوں نے پسماندہ سندھی عورت کو دیکھا، برتا، اس کے دکھ کومحسوس کیا۔اس پر ڈھائے جانے والے مظالم پر احتجاج کیا۔سندھ کی تکلیف دہ روایت کاروکاری پر نفیسہ لکھتی ہیں: ’’ہمیشہ کی طرح عورت کی زندگی لینا مرد کا حق ہے جسے وہ اپنی عزت و آبرو کا بہانہ بناتا ہے۔نفیسہ خیر پور میں عورتوں کے عالمی دن پر جب وہاں پہنچیں تو انہیں فضا میں گونجتی ہوئی عورتوں کی احتجاجی آوازیں سنائی دیں:

’’کاوکاری نامنظور، کاروکاری نامنظور‘‘ لیکن سندھیانی تحریک اور دیگر تنظیموں کی وجہ سے جاگنے والے اس شعور کے باوجود کاروکاری کا رواج بدستور ہے۔

’’پدرشاہی معاشرے میں عورت کے جسم، اس کی ذہانت اورنقل وحرکت پر غالب آکر طاقت حاصل کی جاتی ہے۔‘‘

’’کسی ایک طبقے کی عورت کی آزادی ڈرامائی انداز میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی یا وہ ایک کردار سے دوسرا کردار اپناتی ہے۔‘‘

نفیسہ شاہ نے ’’عورت کی آزادی کا دائرہ‘‘ کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا۔

نفیسہ نے ماہنامہ ’’نیوز لائن‘‘ کے ساتھ وابستگی کے دوران بہت سے موضوعات پر تحقیقی مضامین لکھے۔ ایک بار کہا ’’میں جب اپنے کام کے سلسلے میں فیلڈ میں جاتی تو اکثریت یہ سوال کرتی تھی کہ آپ لکھ کر کیا کریں گی۔انگریزی میں چھپا ہوا ہمارے کس کام آئے گا۔ وہیں سے مجھے یہ تحریک ملی کہ ان غریب لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہیۓ۔ کیوں کہ مجھے اس قسم کی باتوں سے بہت فرسٹریشن ہوتی تھی کہ قالین بنانے والے بچوں یا بنگالی

پاڑے کے بارے میں جو کچھ انگریزی میں لکھا اس کا انہیں کیا فائدہ ہو گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ان کے لئے کوئی ٹھوس کام کیا جائے۔''

اپنے کام کے ضمن میں رکاوٹوں اور دشواریوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتی ہیں ''رکاوٹیں تو آتی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بااختیار لوگ اپنے رویے میں لچک پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں عورتوں کے مسائل پر بات کرنا فیشن ہے۔ جن دنوں میں ٹی وی پر پروگرام ''حوا کے نام'' کر رہی تھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے مرد اپنی بیویوں کو وہ پروگرام نہیں دیکھنے دیتے تھے کہ اس سے وہ بغاوت کرنا سیکھیں گی۔''

نفیسہ نے کچھ عرصہ قبل صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ لیکن ان کے رجحان کو دیکھ کر یہ یہ علیحدگی عارضی معلوم ہوتی ہے بہرحال وہ آج کل شرکت گاہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ 1987ء تا 1995ء کے دوران چھ پاکستانیوں کو ماحولیات گلوبل 500 ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان میں نفیسہ شاہ کا نام بھی شامل ہے۔

نفیسہ غیر شادی شدہ ہیں لیکن وہ شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کی طرفدار ہیں۔ وہ خود یہ سب کریں گی؟ یہ معلوم نہیں، کیونکہ سردست ان کا اگلا پروگرام آکسفورڈ یونیورسٹی میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا ہے۔

MashalBooks.org

# نوشین احمد

مذاکرے کا موضوع تھا ''انصاف سب کے لئے۔'' مقررین میں شہر کے ممتاز قانون دانوں کے علاوہ صوبائی محتسب اور سندھ کے چیف جسٹس شامل تھے۔ نوشین نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ موضوع ایک ایسی خواہش کی نمائندگی کرتا ہے کہ ملک کے غریب عوام اور قانونی نظام کے درمیان فاصلہ کم ہو سکے اور یہ اس ضرورت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انصاف کو قابلِ رسائی اور تیز رو ہونا چاہئے۔''

بیرسٹر نوشین احمد نے پاکستان کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے کہ اس کی متعدد شقوں میں شامل ہے کہ شہریوں کے حقوق کو قانون کے مطابق ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ خصوصی طور پر باب 2 شق 37 ڈی میں یہ کہا گیا ہے کہ ''ریاست سستے اور تیز رفتار انصاف کو یقینی بنائے گی۔''

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری عدالتیں اپنا کردار صحیح طور پر ادا کر رہی ہیں؟

نوشین احمد نے اپنا بچپن چٹا گانگ (سابق مشرقی پاکستان) میں گزارا۔ والد کا تعلق میرٹھ سے تھا اور والدہ بنگالی ہیں۔ جب 1971ء کی جنگ ہوئی تو نوشین اور ان کی چھوٹی بہن مری کے ایک سکول میں زیرِ تعلیم تھیں۔ بنگلہ دیش بننے پر نوشین کے والدین اور تین سالہ بھائی جنگی قیدی بن گئے جو 1974ء کے ایک معاہدے کے بعد رہا ہو کر کراچی آئے اور یہیں رہائش پذیر ہو گئے۔

نوشین نے گریجویشن کے بعد کنگز کالج لندن سے ایل ایل بی، پھر بار ایٹ لاء اور ایل ایل ایم یونیورسٹی آف لندن سے پاس کیا۔ سنہ 86 میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئیں تو ملک کا سیاسی اور قانونی منظر نامہ تبدیل ہو چکا تھا۔ بہت سی عورتیں حدود آرڈیننس کا شکار ہو رہی تھیں۔ انہی دنوں خوشی محمد اور شاہدہ پروین کا مقدمہ منظر عام پر آیا تھا۔ نوشین ویمنز ایکشن فورم، شرکت گاہ اور انسانی حقوق کمیشن کے لئے سرگرمِ عمل خواتین کے گروہ میں

شامل ہوگئیں۔

انگلینڈ میں قانون پڑھانے کا بنیادی فلسہ یہ بتایا گیا تھا کہ قانون لوگوں کے لئے ہے۔ ان کی مدد کے لئے ہوتا ہے لیکن جنرل ضیا نے ایسے قوانین بنائے تھے جو عورتوں کو مصائب میں جھونک رہے تھے۔ ہم نے مل کر حدود آرڈیننس کی تنسیخ کے لئے ایک کمیٹی بنائی اور میں نے بطور وکیل اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کیں۔

نوشین ایک کثیر القومی کمپنی میں بطور قانونی مشیر ملازم ہیں، لیکن وہ اس کے علاوہ غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مصروف عمل رہتی ہیں۔ وہ شرکت گاہ کے ایک پراجیکٹ ''عورتیں، قانون اور ریاست'' پر کام کر رہی ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ حکومت کا رویہ ہے۔ کیونکہ جہاں تک عورتوں کے رتبے کا تعلق ہے وہ بد سے بدتر ہوتا جا رہ ہے۔ جو قوانین مارشل لاء کے دور میں بنا دیئے گئے تھے جمہوریت کی بحالی کے بعد بھی ان میں تبدیلی کے کوئی آثار نہیں آ رہے۔ دوسری طرف مالی مشکلات کی وجہ سے عورتیں پہلے سے زیادہ تعداد میں کام کرنے لگی ہیں لیکن انہیں کوئی خصوصی سہولتیں نہیں دی جاتیں۔ قانونی امداد کا کوئی نظام نہیں ہے۔ لیبر قوانین پرانے ہیں مگر ان پر بھی خاطر خواہ طور پر عمل نہیں ہوتا۔

پھر عورتوں کی رہائش اور تحفظ کا مسئلہ ہے۔ فیملی لاز کے تحت جو عورتیں اپنے گھروں سے نکل آتی ہیں ان کی رہائش کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کو اس طرح توجہ دینی چاہئے۔ زیادہ تر عورتیں ایدھی سنٹر اور دارالامان میں جانا نہیں چاہتیں کیونکہ وہاں پابندیاں بہت ہیں۔ وہاں سے باہر نکلنے اور ملازمت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ نہ ہی انہیں وہاں کسی قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کے لئے ورکنگ ویمنز ہوسٹل قائم کرنے چاہئیں۔

نوشین احمد کا خیال ہے کہ عوام میں قانونی شعور پیدا کرنے کے لئے حکومت کو پیرا لیگل ٹریننگ کا بندوبست کرنا چاہئے۔ اس بارے میں انہوں نے جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ ملائیشیا میں بار کونسلیں قانونی امداد کے وسیع پروگرام چلاتی ہیں جس کے لئے ان کو حکومت مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح فلپائن میں پیرا لیگل کارکنوں کی تحریک سرگرم عمل ہے۔ یہ کارکن دیہی علاقوں میں جا کر مقامی لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے مسائل معلوم کرتے ہیں۔

نوشین کا کہنا ہے کہ پاکستان میں بھی کچھ این جی اوز قانونی امداد کی فراہمی کے لئے ان بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔

ماضی میں نوشین نے ''جیل'' کے منصوبے پر تحقیقی کام کیا۔ وہ ان دنوں شرکت گاہ کے جن پراجیکٹس کی نگرانی کر رہی ہیں ان میں سندھ میں کاروکاری، کچی آبادیاں اور ابراہیم حیدری کے مچھیروں پر تحقیق شامل ہے۔

1990ء میں نوشین ''انسانی حققو اور قانون'' پر مختلف مقامات پر لیکچر دینے امریکہ گئیں۔ کچھ اسی نوعیت کے کام کے لئے جرمنی بھی گئیں۔

نوشین کا آئندہ بڑا منصوبہ قانون میں پی ایچ ڈی کرنا ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے ''پاکستان کے عدالتی نظام میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک'' پر بنیادی کام شروع کر دیا ہے لیکن اس کی تکمیل کے لئے لندن جانا ضروری ہوگا۔

ماضی کی سرگرمیوں کا حاصل؟ نوشین اس بارے میں مایوس ہیں کہ ریاستی سطح پر مستقبل قریب میں عورتوں کی بہتری کے لئے کوئی اقدام ہوسکیں گے لیکن ان تمام برسوں میں ایک مثبت تبدیلی البتہ یہ ہے کہ پہلے سی بی اوز میں کے ساتھ کام کرتے تھے تو صرف صحت اور تعلیم تک بات ہوتی تھی۔ انسانی حقوق کا ذکر نہیں تھا۔ اب لوگ خود اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نوشین شادی شدہ ہیں۔ ان کے شوہر کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ سندھی گھرانے سے ہے۔ وہ ملازمت پیشہ ہیں۔ ان کی ایک بچی ہے۔

MashalBooks.org

# دانش زبیری

''معاشرے کا عام رویہ جنسی تشدد یا ریپ کے متاثرین کے بارے میں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس میں عزیز و اقارب کے ردعمل کے علاوہ پولیس، میڈیکل رپورٹ، وکیل اور جج بھی شامل ہیں۔ میڈیکل رپورٹ ریپ کیس میں اولین گواہی کی حیثیت رکھتی ہے جس میں تشدد کے نشانات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ بعض کینسر میں میڈیکل ڈاکٹر جانبدارانہ رائے مظلوم کے ساتھ ناانصافی اور مجرم کی رہائی کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک کیس میں میڈیکل رپورٹ میں درج تھا کہ زیادتی کی شکایت کرنے والی لڑکی اس سے قبل بھی جنسی فعل کر چکی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اچھا کردار نہیں رکھتی۔''

''وار'' (Waq Against Rape) کی سرگرم کارکن دانش زبیری پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر ہیں۔ دانش کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ماما پارسی سکول کراچی سے میٹرک کرنے کے بعد سینٹ جوزف کالج سے انٹر کیا۔ پھر سائپرس سے قانون میں ڈپلومہ لیا۔ بی اے آنرز یونیورسٹی آف ویلز اور گریزان لندن سے بار ایٹ لاء پاس کیا۔

دانش کی ایکٹوزم کا آغاز اسوقت ہوا جب وہ انٹر کے امتحانات کے بعد فارغ تھیں۔ ایک دن انہوں نے ایک فلاحی تنظیم کا اشتہار پڑھا۔ انہیں گمشدہ بچوں کی تلاش کے لئے رضا کاروں کی ضرورت تھی۔ دانش نے فون پر پیشکش کی کہ وہ ان کے لئے کام کرنا چاہتی ہیں۔ یہ سلسلہ چند ماہ تک چلا اس کے بعد وہ تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک چلی گئیں۔ سنہ 95ء میں وطن واپس آئیں تو ''وار'' کی ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ اس وقت سے اب تک وہ اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ ایک لافرم میں کل وقتی ملازم ہیں۔ اس کے بعد انہیں جو وقت ملتا ہے اسے ''وار'' کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔

''وار'' کا سلوگن ہے ''وار میں شرکت کریں اور انسانی وقار کے لئے جدوجہد کریں۔'' سنہ 1989ء میں چند حساس افراد نے مل کر اس چھوٹے سے ادارے کی بنیاد رکھی

جس کا بنیادی مقصد جنسی زیادتی کے بارے میں خاموشی کو توڑنا تھا کہ متاثرین کو انصاف دلایا جا سکے۔ ان کی قانونی اور نفسیاتی امداد کی جا سکے۔ میڈیا کے ذریعے معاشرے کی اس نوعیت کی برائیوں کو افشا کر کے عام رویوں میں مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔

''وار'' میں کام کرنے والی وکیل، ڈاکٹر اور نفسیاتی معالج تمام رضا کارانہ کام کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ''وار'' کو جیسے ہی کسی متاثرہ عورت، لڑکی یا بچے کے بارے میں علم ہوتا ہے تو ادارے کے کارکن ان سے ملاقات کر کے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کے مقدمات کی پیروی کرتے ہیں۔ 1997ء کے اواخر کے ایک تجزیے کے مطابق تین ماہ کے دوران 61 ریپ کیسز ہوئے جن میں نو سے آٹھ سال کے لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں۔ زیادہ تر مجرم گھر میں ہی موجود تھے جن میں بہنوائی اور سسر بھی شامل ہیں۔

دانش کا تجربہ ہے کہ ''ایسے قوانین کے تحت کام کرنا جو امتیازی ہوں اور ایسے قانونی نظام میں مقدمے لڑنا جو کمزور کے لئے غیر ہمدردانہ ہو بہت مشکل ہے۔ ہمارے ملک کا قانونی نظام طاقتوروں اور حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ جہاں بڑے لوگوں کے مقدموں کی مسلسل سماعت کی جاتی ہے اور چند ہفتوں کے اندر فیصلہ دے دیا جاتا ہے جبکہ عام مقدمات کی تاریخوں پر تاریخیں پڑتی رہتی ہیں اور کئی برسوں تک ان کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ ایک مطالعے کے بعد طلاق کے مقدمات کو طے ہونے میں چار سال اور دو ماہ لگتے ہیں۔ بچوں کی تحویل کے لئے ساڑھے چار سال اور فوجداری مقدمات میں تقریباً تین سال لگتے ہیں۔

گزشتہ دنوں جب ایک عدالت نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ پاکستانی عورت ولی کی مرضی یا اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی تو ''وار'' کی پیش قدمی پر انسانی اور نسوانی حقوق کی 20-25 این جی اوز نے مل کر ایک اتحاد بنایا تا کہ حدود آرڈیننس کے خلاف موثر طریقے سے کام کیا جا سکے۔ اس پورے عمل میں دانش زبیری نے مستعدی سے شرکت کی۔

دانش کا کہنا ہے کہ جب وہ ریپ کا کوئی کیس ہاتھ میں لیتی ہیں تو انہیں عام طور پر بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلی رکاوٹ پولیس کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ یا تو ایف آئی آر درج ہی نہیں کرتے یا درست نہیں لکھتے۔ نیز میڈیکل رپورٹ میں

بھی دشواری پیش آتی ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو ریپ کیس میں سرکاری وکیل استغاثہ ہوتا ہے جو زیادہ تعاون نہیں کرتا۔ اس لئے ''وار'' کی طرف سے ایک وکیل مقرر کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں دانش نے پولیس، جج اور دیگر لوگوں کے رویے کی بھی شکایت کی کہ وہ متاثرہ عورت کے بارے میں بھری عدالت میں ایسے ریمارکس دیتے ہیں کہ عورتیں سہم جاتی ہیں اور دوبارہ عدالت میں جانے سے گریز کرتی ہیں۔

دانش کا کہنا ہے کہ وہ اپنا وقت جو سماجی فلاح میں صرف کرتی ہیں اس کے لئے وہ لاشعوری طور پر اپنے نانا سے متاثر ہیں۔ ان کے نانا ملک کے ممتاز مارکسی ادیب تھے۔ دانش کی عمر اس وقت 12-13 برس تھی جب ان کا انتقال ہوا۔ انہیں یاد ہے کہ نانا ابو کے پاس اکثر لوگ اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور وہ ان کی مدد کے لئے ہر ممکن تعاون کرتے تھے۔

دانش کہتی ہیں: فی الحال شادی کا ارادہ نہیں۔ ''لیکن جب کروں گی تو کسی ایسے شخص سے جو بے شک میرے ساتھ کام نہ کرے لیکن میرے کام کو سمجھے اور اس کا شعور رکھتا ہو تا کہ مجھے آئندہ کوئی پریشانی نہ ہو۔''

MashalBooks.org

# عمل آرائی

MashalBooks.org

MashalBooks.org

# سیمیں عالم

1970ء کے عشرے کے اوائل میں پنجاب یونیورسٹی میں یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ ہر ماہ کے پہلے سوموار کو، پہلے پیریڈ میں، طلبا و طالبات کو قرآن پاک پڑھایا جائے گا۔ سیمیں عالم ان دنوں شعبہ نفسیات کی چیئرپرسن تھیں۔ انہوں نے انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق پہلے پیریڈ میں قرآن پاک پڑھانے کی غرض سے طلبا و طالبات سے سورۃ نساء نکالنے کو کہا۔

پنجاب یونیورسٹی جو کبھی اپنی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی وجہ سے ملک بھر میں پہچانی جاتی تھی، اس میں 1970ء کے عشرے کے اوائل میں رجعت پسند عناصر گھس گئے تھے اور وہ دن بدن مضبوط ہو رہے تھے۔ ان کا پہلا شکار کالج ایک لبرل پروفیسر تھا جس پر جھوٹے الزام لگا کر یونیورسٹی سے نکلوا دیا گیا تھا۔ سیمیں عالم اور ان کے ہم خیال لوگوں نے مل کر مذکورہ پروفیسر کو بحال کروانے کے لئے شدید جدوجہد کی لیکن بے سود۔ بلکہ اب وہ خود بھی نشانے پر آ گئی تھیں۔

کلاس میں احتجاج ہوا کہ ''آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ آپ کو کوئی اور صورت نہیں ملی؟ اور پھر آپ سے کس نے کہا کہ قرآنی آیات کو ترجمے کے ساتھ پڑھائیں؟''

پوری صورتِ حال الجھی ہوئی اور پریشان کن تھی۔ سیمیں کلاس روم سے باہر نکلیں تو دوسو افراد نے ان پر حملہ کیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔

سیمیں کے شوہر بھی یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ ان کے بچے ہیں۔ ان پر الزام تھا کہ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ان کے بچے ناجائز ہیں۔ سیاسی الزام یہ تھا کہ وہ روسی ایجنٹ ہیں۔

سیمیں عالم ہی نہیں یونیورسٹی میں ہر اس شخص پر اسی نوعیت کے الزامات لگائے گئے جو بنیاد پرست کا عملی طور پر ساتھ نہیں دیتے تھے۔ وہ تمام کے تمام معتوب ٹھہرائے جاتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت سے لے کر نواز شریف کے دوسرے دور حکومت

MashalBooks.org

تک، سیاسی منظر کئی بار بدلا لیکن پنجاب یونیورسٹی کی روش میں کوئی نمایاں مثبت تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

ضیاء کا مارشل لاء لگ چکا تھا۔ سیمیں عام کو ہدایات ملیں کہ وہ یونیورسٹی میں داخل نہ ہوں، آپ کی بھلائی اسی میں ہے۔ اگر وہ یونیورسٹی جاتی تھیں تو انہیں کلاس لینے کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے کوشش کی کہ انہیں کسی کالج میں ملازمت مل جائے لیکن کوئی کالج انہیں لینے کو تیار نہیں ہوا۔ سیمیں کو او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہ بنایا جا سکا۔

مارشل لا ختم ہوا۔ جونیجو کی حکومت آئی۔ سیمیں یونیورسٹی واپس آ گئیں لیکن گزشتہ برسوں میں کیا بیتی، ان کی سروس بک پر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ معتوب ہونے سے پہلے اپنے شعبے میں سب سے سینئر تھیں۔ ان کے خیالات میں خاطر خواہ تبدیلی نہ پا کر بطور سزا انہیں سب سے جونیئر بنا دیا گیا۔

سیمیں زمانہ طالب علمی اور 1970ء کے اوائل تک عملی طور پر بائیں بازو کی سیاست میں ملوث رہیں۔ روایات کے خلاف ان کی سرکشی کا پہلا مظاہرہ۔

میٹرک کے بعد کالج جانے لگی تھیں۔ سیمیں کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ بیٹی اب جوان ہو گئی ہے۔ اسے برقعہ پہننا چاہئے لیکن سیمیں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا ''تم کالج نہیں جاؤ گی'' سیمیں باپ کا حکم بجا لائیں اور کالج نہیں گئیں۔ شام کو باپ نے پوچھا ''سیمیں تم کالج کیوں نہیں گئیں'' میں برقعہ نہیں پہنوں گی۔ یہ میری بے عزتی ہے۔ میرے جسم پر ایسا کیا چیز لگی ہے جسے میں برقعے میں چھپاؤں؟''

باپ کو طیش آ گیا اور کہا ''تمہاری ماں بھی برقعہ نہیں اوڑھے گی۔''

سیمیں عالم نے پنجاب یونیورسٹی سے نفسیات میں ماسٹرز کرنے کے بعد شماریات (Statistics) میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ڈی فل سسیکس یونیورسٹی انگلینڈ سے حاصل کی۔ ان کے تدریسی کیریئر میں ٹریسٹی یونیورسٹی اٹلی کا وہ ایک سال بھی شامل ہے جہاں پر انہوں نے پڑھانے کے علاوہ تحقیق بھی کی۔

سیمیں نے گزشتہ برسوں میں یونیسیف (UNISEF) کے تعاون سے مختلف مطالعاتی منصوبوں پر بطور کنسلٹنٹ کام کیا جن میں لاہور کی ڈسٹرکٹ اور سنٹرل جیل میں

قیدی بچوں کے حالات پر تحقیق شامل ہے۔''نامساعد حالات میں لڑکیاں'' اس منصوبے کے تحت پنجاب کے 25 شہروں میں 15 سال سے کم عمر کی 10 ہزار لڑکیوں کے انٹرویو لئے گئے۔ اس کے علاوہ بچوں کے حقوق اور پیدائش کے وقت بچوں کی رجسٹریشن پر تحقیقی مطالعہ کیا گیا۔

جیل میں قیدی بچوں کے بارے میں ایک تجزیہ یہ بھی تھا کہ ان میں 40 فیصد بچے سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کا تعلق نچلے متوسط اور نچلے طبقے سے تھا۔ باقی بچے ملازمت کرتے تھے۔ ان کی اکثریت منشیات کی عادی تھی۔

بچوں کی پیدائش پر رجسٹریشن کے ضمن میں تحقیقی مطالعے سے ایک دلچسپ حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ دیہی علاقوں میں 90.06 فیصد بچے رجسٹر کروائے گئے جبکہ بڑے شہروں میں یہ شرح 78.47 فیصد تھی اور قصبات میں 87.74 فیصد۔

''گلیوں کی لڑکیاں'' یہ تحقیقی مطالعے کا ایک حصہ تھا۔ اس کے تحت 2786 لڑکیوں سے بات چیت ہوئی۔ اس سے دیگر معلومات کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لڑکیاں جن کی اوسط عمر گیارہ برس تھی انہوں نے چھ سال کی عمر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان لڑکیوں کا کوئی مستقل گھر نہ تھا۔ ان میں سے کچھ کم سنی میں بیاہ دی گئی تھیں۔

سیمیں عالم کا کہنا ہے کہ انہوں نے ملتان جیل میں قیدی عورتوں کے بارے میں پہلی بار سنہ 82ء میں تحقیق کی جس سے یہ ظاہر ہورا تھا کہ وہ عورتیں زیادہ تر گھریلو جھگڑوں میں ملوث تھیں۔ لیکن جب سنہ 92ء میں اسی نوعیت کا مطالعہ کیا گیا تو صورت حال مختلف تھی۔ اس وقت ملتان جیل کی تمام قیدی عورتوں کی حدود آرڈیننس کے تحت سزا دی گئی تھی جن میں سے اکثر عورتیں مجرم نہ تھیں۔ ان پر شوہر، بھائی اور دیگر رشتے داروں نے بدکاری کا الزام لگا کر جیل بھجوایا تھا۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ جب کسی ملک کے اقتصادی حالات درست ہو جاتے ہیں تو عورتوں کے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ سیمیں عالم کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔

''ہم سوچتے تھے انقلاب آئے گا تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ 70 کے عشرے میں اشتراکی نظام عوام کے مسائل کا بہترین حل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن.........'' سیمیں یاد کر رہی تھیں''ایک بار پولینڈ میں بہت بڑی کانفرنس تھی۔ میں نے دیکھا کہ لیبارٹری میں

کام کرنے والی تمام سائنس دان عورتیں ہیں۔ جی بہت خوش ہوا۔لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ عورتوں کو لیبارٹری میں اس لئے رکھا گیا کہ وہاں کا معاوضہ کم تھا جبکہ فیلڈ کے کام پر مرد سائنس دان متعین کئے جاتے تھے اور ان کا معاوضہ کہیں زیادہ تھا۔

ان تمام برسوں میں عورت کی حالت میں کوئی بہتری نظر آئی ؟

اس پر سیمیں نے ٹالسٹائی کے ناول ''آنینا کارنینا'' کا حوالہ دیا۔ اس وقت کی عورت اور آج کی عورت میں یہ فرق ضرور ہے کہ اب عورت اگر طلاق لینا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔ وہ گھر لے کر اکیلی رہنا چاہے تو وہ رہ سکتی ہے اور عدالت کے ذریعے اپنے بچے بھی حاصل کر سکتی ہے۔

MashalBooks.org

# ابان مارکر اجی

''گزشتہ رُبع صدی کے دوران پاکستان میں نمایاں طور پر مختلف اقسام کی کیمیکل استعمال کی گئیں۔ اس رجحان سے ملکی معیشت کو فوری طور پر فائدہ حاصل ہوا۔ لیکن طویل المدت مضر اثرات اب ظاہر ہونے لگے ہیں۔'' ابان مارکر نے ایک موقع پر یہ پیغام دیا تھا کہ کیمیکلز کے اندھا دھند استعمال سے ماحول کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

''میرا تجربہ ہے کہ پاکستان کی معیشت میں گھریلو سطح پر چھوٹے کاروبار اور خصوصاً زراعت میں عورتوں کا بڑا حصہ ہے لیکن اسے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ جب آپ کسی کام کو نہیں جانیں گے تو پھر یہ اندازہ کیسے لگائیں گے کہ صحت کے مسائل کی وجہ سے معیشت کو کیا نقصان پہنچا۔ عورتیں معاشی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو رہی ہیں اور انہیں بیک وقت تمام شعبوں میں کیمیکلز کے استعمال سے بالواسطہ اور بلاواسطہ مضرِ صحت صورتِ حال کا سامنا ہے، جس سے نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے بچوں کی صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔''

ابان مارکر گزشتہ کئی برسوں سے ماحولیات میں مصروفِ عمل ہیں۔ کراچی میں، جب مارشل لاء دور میں عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین بنائے گئے جس کے نتیجے میں خواتین کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں، احتجاجی جلوس اور جلسے منعقد ہوتے تو ابان بھی اس میں شامل ہوتیں۔

ابان کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اور پرورش بھی وہیں ہوئیں۔ سنہ 75ء میں یونیورسٹی آف لندن سے بیالوجی میں بی۔ایس۔سی آرز کیا۔ بیرون ملک تعلیم کے دوران یہ احساس ہوا کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کے بارے میں عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنیں گی یا ٹیچر لیک ملک سے باہر جا کر آپ کے سامنے ایک وسیع دنیا ہوتی ہے۔ بہت سے راستے کھل جاتے ہیں۔

کوئٹہ میں ابان کے خاندان کا فارماسیوٹیکلز کا کام تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس

ضمن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تا کہ وہ اپنے خاندانی کاروبار میں مدد دے سکیں۔ کوئٹہ کے فطری ماحول نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ ایسا ماحول جس کے پہاڑ، وادیاں، چشمے اور موسم اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ گھریلو ماحول ایسا تھا ایسا جہاں درختوں، جانوروں اور پرندوں کے تحفظ کی باتیں ہوتی تھیں۔

ایک حالیہ کانفرنس میں ابان اپنے مکالمے میں کہہ رہی تھیں کہ ''ایک رپورٹ کے مطابق دنیا گرم ہو رہی ہے۔ اس پر آبادی کا بوجھ بڑھ رہا ہے اور ماحولیاتی طور پر غیر متوازن ہو رہی ہے۔ ماہی گیر ختم ہو رہی ہے، جنگلات سکڑ رہے ہیں اور زیرزمین پانی کی سطح گر رہی ہے۔ شمال میں آبادی گھٹ رہی ہے جبکہ جنوب میں اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں معیشت اور تجار متاثر ہو رہی ہے۔''

ابان کہتی ہے کہ وہ جب تعلیم سے فارغ ہو کر واپس آئیں تو انہیں لاہور میں ایک بڑی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا اور وہاں انہوں نے چند ہم خیال خواتین کے ساتھ مل کر ایک تنظیم شرکت گاہ بنائی۔ اس تنظیم کے تحت خواتین کے حقوق اور امتیازی قوانین کے خلاف جدوجہد سرفہرست تھی۔ یہ ان کے ایکٹوازم کا آغاز تھا۔ شروع شروع میں وہ شرکت گاہ کے ساتھ کل وقتی مصروف عمل رہیں۔ آج بھی وہ اس کے انتظامی بورڈ کی رکن ہیں۔

کوئٹہ کے فطری ماحول اور اپنے گھر کی سماجی سرگرمیاں ان دونوں عناصر نے ابان کی شخصیت کی تعمیر اور طوز زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ والد لڑکیوں کی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ دادی ایک سماجی تنظیم کی سرگرم کارکن تھیں۔ چنانچہ بچپن میں ہی جن اقدار کو پہچانا وہ یہ تھیں: ایسے کام کرنے چاہئیں جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اپنی ذات اور خاندان سے ہٹ کر کمیونٹی کی بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے۔ وقت کے ساتھ شعور بڑھا تو کچھ اس طرح کے سوالات ذہن میں اٹھے کہ معاشرتی ناانصافیاں کیوں ہیں؟ عورت کی حیثیت کم تر کیوں ہے؟ ماحول کی خرابی کے اسباب کیا ہیں؟ ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں قدم اٹھے۔

ابان مارکر تحفظِ ماحول کی عالمی تنظیم آئی۔ یو۔سی۔این کی پاکستان میں ملکی نمائندہ ہیں۔ کہتی ہیں کہ ان کا موجودہ کل وقتی کام ماحول سے متعلق ہے۔ ماحول کی خرابی بھی عورتوں کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ یہ ایک دوسری طرح کا ایکٹوازم ہے کہ جو ماحولیاتی

خرابی پیدا ہو چکی ہے اسے ٹھیک کیا جائے۔ حالانکہ خرابیوں کی روک تھام اور بچاؤ پر زور ہونا چاہئے۔ لیکن صورت حال اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ ان کی درستگی بھی ایک مسئلہ ہے۔

ابان نے پاکستان میں مروجہ رجحانات کے بارے میں کہا کہ ایک طرف پائیدار ترقی کی بات کی جاتی ہے تو دوسری طرف تجارتی فلسفہ اس کی نفی کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پاکستان میں بچوں کی مشقت کے بارے میں غور کریں۔ ہم ان مسائل کو زیر بحث لائیں جو ہمارے چمڑے کی صنعت، کھیلوں کے سامان اور قالین کی صنعت کو درپیش ہیں کیونکہ بہتر ماحول اور بچوں کی مشقت کی حوصلہ شکنی کے لئے عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کی جانب سے تجارتی پابندی اس کا حل نہیں ہے۔ ابان نے شکوہ کیا کہ ماحول، انصاف اور انسانی حقوق کے نام پر ترقی یافتہ دنیا کی طرف سے ترقی پذیر دنیا پر مسلط کئے جانے والے فیصلے ہماری زندگیوں کو متاثر کر رہے ہیں۔

پاکستان میں آئی یو سی این کا ہیڈ آفس کراچی میں ہے۔ آئی یو سی این کا قیام 1948ء میں عمل میں آیا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں مختلف معاشروں پر فطرت کے تحفظ اور قدرتی وسائل کے مناسب استعمال کے لئے دباؤ ڈالنا، ان کی حوصلہ افزائی اور مدد فراہم کرنا ہے۔ آئی یو سی این پاکستان کی جانب سے ملک بھر میں ماحولیاتی مسائل پر کام کرنے والی 22 غیر سرکاری تنظیموں کو متعلقہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ نیز ادارے کا رابطہ سرکاری محکموں اور متعلقہ شعبوں کے ساتھ بھی قائم ہے تاکہ ماحولیاتی مسائل کے حل کے لئے باہم مل کر حکمت عملی، نئی منصوبہ بندی اور عملی اقدامات کئے جائیں۔

ابان کا کہنا ہے کہ ”ہم پالیسیاں وضع کرنے میں کمال رکھتے ہیں لیکن اصل مسئلہ عمل درآمد کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بدعنوانی بہت بڑھ گئی ہے اور ادارے تباہ ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے آئی یو سی این ہو یا حکومت سبھی بے بس ہیں۔

ماحولیات کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک ماحول سے مراد درخت اور جانور ہیں، جبکہ ہم جب ماحول کی بات کرتے ہیں تو صاف پانی، صاف ہوا، صاف مٹی کی بات بھی کرتے ہیں۔

بقول ابان کے ہمارے ہاں تنقید کرنا ایک روش ہے۔ وہ سسٹم کی برائیوں کی شکایت کریں گے لیکن تبدیلی لانے کے لئے اپنے طرز عمل میں تبدیلی نہیں لائیں گے۔ کوئی

ذمہ داری نہیں اٹھائیں گے۔

ماحولیات کے بارے میں ابان مارکر کی کئی تصانیف (انگریزی) شائع ہو چکی ہیں جن میں پاکستان کے فطرت، ہاکس بے اور سینڈز پٹ پر کچھوؤں کا تحفظ، پاکستان میں عورتوں کے رہائشی مسائل قابل ذکر ہیں۔ ماحولیات کے ضمن میں نمایاں کارکردگی پر ابان کو سنہ 94ء میں نیدرلینڈ کی طرف سے ایوارڈ دیا گیا تھا۔

ابان مارکر شادی شدہ ہیں اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ انہیں شوہر کی طرف سے دفتری اور بیرونی سرگرمیوں کے لئے بھرپور تعاون حاصل ہے۔ بلکہ بقول ان کے انہوں نے شادی کا فیصلہ اس وقت کیا تھا جب ایک لبرل شخص سے ملاقات ہوئی۔ انہیں عورت ہونے کے ناطے زیادہ رکاوٹوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن انہیں یہ احساس ضرور ہوا کہ کامیابی کے لئے طاقت ضروری ہے۔ یہ طاقت اقتصادی، علمی اور رابطے کی ہے۔

MashalBooks.org

# سنیعہ حسین

کراچی کے ایک گنجان آباد علاقے کی ایک سڑک کا منظر: ایک بس کا پچھلا حصہ۔ تین موٹر سائیکلیں۔ پس منظر سے نکلتی ہوئی ایک بس۔ اپنا راستہ بناتی ایک کار اور متعدد سوزوکی ویگنیں۔ دکانوں کے اوپر رہائشی فلیٹوں کے خدوخال ایک سرمئی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ تصویر کا کیپشن ہے: ''پاکستان میں عام گاڑی امریکہ کی گاڑی کے مقابلے میں 25 گنا زیادہ دھواں چھوڑتی ہے۔''

ایک اور تصویر: کسی دیہی پہاڑی علاقے کے بچے۔ نیچے لکھا تھا۔ پاکستان کے لوگ............ایک تخلیقی وسیلہ''۔

یہ تصویر: سروں پر دوپٹے اوڑھے۔ چہروں پر صبر بسائے ہمارے نچلے متوسط طبقے کی پسماندہ عورتیں۔ عورتوں کے تحفظ ماحول کے بڑے دھارے میں اس وقت تک شامل کرنا ممکن نہیں جب تک کہ ان کی اپنی ترقی کی سطح میں اضافہ نہ کیا جائے۔

سنیہ حسین آئی یو سی میں میڈیا ڈائریکٹر ہوتے ہوئے ایک رپورٹر اور فوٹوگرافر بھی ہیں۔ اپنے ادارے کی جانب سے صحافیوں کو ماحول پر معلومات فراہم کرنا ان کا فرض منصبی ہے۔ لیکن یہ سب تسکینِ خاطر کے لئے کافی نہیں ہے۔ اصل طمانیت انہیں اپنے لکھے ہوئے مضمون اور اپنی کھینچی ہوئی تصویر سے ملتی ہے۔ وہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی ہیں۔ جہاں حرف مزید وضاحت کا محتاج ہے۔ وہاں تصویر کا عکس وہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔

سنیہ وزیر ماحولیات کا انٹرویو لے رہی ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ افغان مہاجرین کی آمد سے صوبہ سرحد کی چراگاہیں، جنگلات اور ملازمتیں گھٹ گئیں۔ معاشرتی خدمات پر ضرورت سے زیادہ بوجھ پڑا۔ کراچی میں بننے والی بلند عمارتوں کے پیچھے طمع، حرص اور بدعنوانیاں کارفرما ہیں جس کی بنا پر شہر آلودہ ہو رہا ہے۔ کلک کی آواز آئی اور وزیر ماحولیات کی پورٹریٹ سنیعہ کے کیمرے میں محفوظ ہوگئی۔

این سی ایس بلیٹن سرورق کی کہانی کا عنوان ہے ''تباہ کن 36 گھنٹے۔'' یہ داستان ہے اس تباہ کاری کی جب ستمبر 1992ء میں ہزارہ ڈویژن میں 36 گھنٹے مسلسل طوفانی بارش ہوتی رہی جس کے نتیجے میں 263 افراد مارے گئے۔ 825 دکانیں اور کئی ہزار ایکڑ رقبے پر فصلیں تباہ ہوگئیں۔ مجموعی طور پر نوے کروڑ روپے سے زیادہ کا نقصان ہوا۔ بے شک اس علاقے میں بارش معمول سے زیادہ تھی لیکن اس کے ذمہ دار وہ عناصر بھی ہیں جو ٹمبر مافیا کہلاتے ہیں۔ علاقے کے فطری جنگلات کاٹ کر زمین کو کھوکھلی کرنے والے لوگ۔ سبیعہ مری کے قریبی بنگی کے گاؤں میں عورتوں سے بات کر رہی ہیں۔ ایک سکول ٹیچر کا المیہ بیان کرتی ہیں کہ تودے گرنے سے مرنے والوں کے ساتھ ان کا مال اسباب، اہم دستاویزات اور دیگر قیمتی اشیا بھی دفن ہوگئیں۔ وہ جہلم، مظفر آباد کے حوال میں ان دیہاتیوں کی حالت زار کا ذکر کرتی ہیں جنہیں دریا کے پلوں کی بربادی کی وجہ سے کئی دن تک غذا اور دیگر اشیائے ضرورت دستیاب نہ ہوسکیں۔ وہ کاغان وادی میں مہمانداری کے ایک تباہ شدہ سکول کی تصویر بناتی ہیں۔

سنیعہ اپنے ہتھیاروں سے لیس ملک کے بڑے صنعتی شہر فیصل آباد پہنچ جاتی ہیں۔ فیصل آباد کو اکثر پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے۔ فیصل آباد نے ٹیکسٹائل کی صنعت میں بہت نام کمایا ہے لیکن ان صنعتوں نے ماحول کو کس طرح برباد کیا۔

سنیہ نے ان مناظر کو تصاویر میں اس طرح بیان کیا، ایک صابن فیکٹری کا سیال فضلہ رہائشی علاقوں کے تالابوں میں سڑ رہا ہے۔ فیصل آباد میں کوڑے کے ڈھیر، فیکٹریوں کی چمنیوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی وجہ سے آلودہ ہونے والا آسمان، فیکٹریوں کے آلودہ پانی سے زرعی فصلوں کی آبیاری۔

سنیہ نے کراچی یونیورسٹی سے انگلش میں ایم اے کرنے کے بعد ایک اشتہاری کمپنی میں کاپی رائٹر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ پانچ برس تک اس سے منسلک رہنے کے بعد صحافت کے میدان میں آگئیں۔ یہ 83ء کا ذکر ہے۔ ضیاء کا مارشل لا اپنے عروج پر تھا۔ یہ وہ دور تھا جب کچھ خود مختار اخباروں نے آزادی صحافت کا تجربہ کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بعض اوقات حکام کے سامنے مجبور ہو جاتے تھے۔ ان دنوں آئے دن اسلام آباد میں حاکم وقت کے دربار میں حاضری دینے کے لئے اخبارات کے مالکوں اور مدیروں کو بلایا جاتا تھا۔

MashalBooks.org

انہیں وارننگ دی جاتی تھی کہ سنسر شپ کے باوجود جو کچھ چھپ رہا ہے اسے بند کریں۔ سنیعہ حسین ایک اخباری گروپ کے صحافیوں کے ان گوریلوں میں شامل تھیں جن کا کام، ان کا شعار اور شعور انہیں اصل حقائق بیان کرنے اور ایسے موضوعات پر لکھنے پر مجبور کرنا تھا جن سے کوتاہ نظر جابر حکمرانوں کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی تھیں۔ سنیعہ یاد کرتی ہیں: ''مارشل لا کا دور تھا۔ بہت مشکل وقت تھا۔ ہمارے اخبار کا ویک اینڈ میگزین خاصا سیاسی تھا۔ مالکوں کے حکومت کے ساتھ رابطے مضبوط تھے۔ حکومت کی جانب سے ان پر دباؤ تھا کہ بعض لکھنے والوں سے نہ لکھوایا جائے۔

یہ وہ وقت تھا جب ویمنز ایکشن فورم کا قیام عمل میں آیا تھا۔ سنیعہ اس کی بنیادی اور سرگرم رکن تھیں۔ یہی ان کی بیٹ تھی۔ وہ خواتین کو درپیش مسائل، ان کے خلاف وضع کی گئی آئینی ترمیمات کے خلاف آواز اٹھاتی تھیں۔ اس دور میں جن صحافی خواتین نے بے لاگ تبصرے کئے اس فہرست میں سنیعہ کا نام ہمیشہ شامل رہے گا۔ اب ماحولیات کے بارے میں اپنے حصے کا کام سرانجام دیتے ہوئے بھی سنیعہ بار بار ویفکی اولین جدوجہد کی اہمیت اور ضرورت کی طرفدار ہیں۔

وہ ٹائمز آف انڈیا کی سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر کلپنا شرما سے لاہور میں ماحولیات پر ہونے والی ایک کانفرنس کے دوران ملتی ہیں۔ وہ ایک انٹرویو میں ماحولیات کے بارے میں ہندوستان کے صحافیوں کے طرزِ عمل اور دیگر امور پر بات کرتی ہیں۔ ایک سوال ان کے ذہن میں آتا ہے کہ کیا آپ عورتوں کے کسی گروپ کے ساتھ کام کرتی ہیں؟ کلپنا بھی صحافیوں کے اسی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ کلپنا کا یہ جواب سنیعہ نے اپنے مضمون میں جلی حروف کے باکس میں درج کیا ہے ''ہاں ہم صحافی خواتین کا ایک گروپ ہے جو بنیادی طور پر بمبئی یونین آف جرنلسٹس کی رکن ہیں۔ ہمارا بنیادی مقصد میڈیا میں عورت کی شبیہہ سازی، اس کے بارے میں لکھنا اور احتجاج کرنا ہے۔''

بقائے ماحول کی عالمی تنظیم آئی یو سی این میں اپنے کام کے بارے میں سنیعہ کہتی ہیں۔ ''ہم ماحول کو وسعتِ نظر سے دیکھتے ہیں اور ماحول کی ترقی کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ ماحول کا سیاست کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومتی سطح پر ماحول کے بارے میں ایسی ترقیاتی پالیسی بنائی جائے جس میں لوگوں کی دلچسپ اور شرکت کو یقینی بنایا

MashalBooks.org

جائے۔''

''لیکن...........'' سنیعہ کو افسوس ہے ''ہمارے ریاستی ادارے تنزل کا شکار ہیں۔ اس لیے ترقی کا عمل بہت سست رفتار ہے۔ اس کے برعکس ماحولیاتی مسائل صنعتوں کے قیام کی غلط منصوبہ بندی، بدعنوان عناصر اور دیگر متعلقہ عوامل کی بنا پر پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

ماحول کے بارے میں صوبائی حکومتوں کے طرزِ عمل کے بارے میں سنیعہ کی رائے ہے کہ سرحد کی حکومت کا طرزِ عمل سب سے زیادہ مثبت ہے جبکہ پنجاب کی حکومت کا رویہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔

سنیہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے والد فوج میں انجینئر تھے اور ان کی ملازمت کی وجہ سے زندگی کا خاصا حصہ پنجاب میں گزرا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی۔ والدین کا تعلق جنوبی ہندوستان سے ہے۔ سنیعہ کی دو بہنیں ہیں۔ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ سنیعہ نے شادی نہیں کی۔ جزوی طور پر خود مختار ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے اپنا الگ اپارٹمنٹ بسا لیا جہاں وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ رہتی ہیں لیکن زیادہ تر وقت والدین کے ہاں گزرتا ہے۔

# زیبا زبیر

ملکی معیشت، ماحول، قدرتی وسائل، انسانی حقوق، عورتوں کے حقوق، صحت، ملکی ترقی اور آبادی، یہ تمام امور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

''آبادی میں تیز رفتار اضافہ، عورتوں کی تولیدی صحت کی ابتری اور معاشرے میں عورت کا کم درجہ مستقبل میں پاکستان کی اقتصادی ترقی کو متاثر کرسکتا ہے'' زیبا زبیر کا کہنا ہے۔

انہوں نے اپنے مقالے ''پاکستان کی آبادی، غربت اور مستقبل کے تقاضے'' میں اقوام متحدہ کے تحقیقی مطالعے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی موجودہ آبادی 140 ملین ہے۔ اگر اس میں مسلسل اضافے کی روک تھام کے لئے موثر اقدامات نہ کئے گئے تو سنہ 2050ء تک رقبے کے تحفظ سے ایک چھوٹا ملک پاکستان آبادی کے اعتبار سے ہندوستان اور چین کے بعد امریکہ، انڈونیشیا، برازیل اور روس سے بڑا ملک بن جائے گا۔

زیبا زبیر کو پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کی لیڈر کی حیثیت حاصل ہے۔ بیگم رعنا لیاقت کی سربراہی میں صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات کی فراہمی کے لئے 30 تنظیموں کے الحاق سے قائم کئے گئے ادارے پاکستان والنٹری ہیلتھ اینڈ نیوٹریشن ایسوسی ایشن (PAVHNA) کی بانی اور صدر ہیں۔

پاوہنا کا قیام 1979ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بنیادی اغراض و مقاصد ہیں کہ معیشت کے اعتبار سے نچلے اور محروم طبقے، خصوصاً عورتوں اور بچوں تک صحت کی خدمات پہنچائی جائیں۔ کمیونٹی کی سطح پر کام کرنے والی تنظیموں یعنی سی بی اوز اور این جی اوز کے مابین

مقامی اور قومی سطح پر رشتہ کار استوار کیا جا سکے تا کہ باہمی مشورے اور تبادلہ خیال سے ترقیاتی کاموں کی منصوبہ بندی، انتظام اور عمل کو زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جا سکے۔

یہ کام گزشتہ اٹھارہ برسوں کے دوران ہر طرح کے حالات میں، ہر حکومت کے دور میں، کسی نہ کسی طور جاری رہا۔ مگر بقول زیبا زبیر کے ''بے شک 1960ء کے مقابلے میں اب آبادی میں اضافے کو روکنے اور منصوبہ بندی کے ضمن میں سیاسی کمٹ منٹ کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس کی پائیداری اور گہرائی بدستور بے یقینی کا شکار ہے۔ گزشتہ برسوں کے دوران آبادی میں اضافے کو روکنے میں ناکامی کی وجہ سے جنگلات اور پانی کے وسائل سالانہ تین فیصد کی شرح سے کم ہو رہے ہیں اور یہ امر ملکی معیشت کے لئے شدید نقصان دہ ہے۔

ہمارا ملک بنیادی صحت اور تعلیم کے ضمن میں ایشیائی ملکوں سے بھی بہت پیچھے ہے۔ زیبا اس پسماندگی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

پاکستانی عورت کا کم تر معاشی مقام، تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات تک رسائی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ مذہبی رویے پردہ یا علیحدگی اور امتیازی برتاؤ ایسے اسباب ہیں جو عورت کے لئے تعلیم اور ملازمت کو محدود کر دیتے ہیں۔''

زیبا زبیر کے والد ایک ممتاز صحافی اور کراچی کے ایک بڑے اخبار کے بانی تھے۔ زیبا نے سینٹ جوزف سکول کراچی سے میٹرک اور کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد سکول آف جرنلزم لندن سے صحافت میں ڈپلومہ لیا۔ ان کے تربیتی کورسز میں سوشل ورک اور انتظامی امور میں ڈپلومے بھی شامل ہیں۔ عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ فری لانسنگ کے علاوہ مختلف جریدوں میں سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ زیبا زبیر گزشتہ کئی برسوں سے اپوا کے ساتھ منسلک ہیں۔ انہوں نے اس تنظیم کے بہت سے فلاحی منصوبوں سے بھرپور شرکت کی ہے۔ زیبا کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں کامن ویلتھ پریس انسٹی ٹیوٹ اور ماس میڈیا انٹرنیشنل ملائیشیا کی رکنیت بھی شامل ہے۔ انہوں نے 1975ء میں میکسیکو اور 1985ء میں نیروبی میں منعقد ہونے والی عورتوں کی عالمی کانفرنسوں، نیز قاہرہ، میکسیکو، بخارسٹ میں آبادی پر عالمی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

زیبا کا کہنا ہے کہ ہمارے اکثر حکمران عالمی سطح پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں اپنے ملک کے خوابوں کا ذکر کرتے ہیں، جیسے ستمبر 1994ء میں آبادی اور ترقی پر بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر سابق وزیراعظم نے کہا تھا کہ ہم ایسے ملک کی خواہش کرتے ہیں جہاں ہر عمل منصوبہ بند ہو۔ پیدا ہونے والے بچے کو بہترین غذا، محبت، تعلیم اور امداد میسر ہو۔'' لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ مختلف ہے۔ ہمارے ملک میں صرف 18 فیصد شادی شدہ عورتیں مانع حمل کے طریقے استعمال کرتی ہیں۔

زیبا کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں خاندانی منصوبہ بندی اور دیگر ترقیاتی پروگراموں کی ناکامی کی بڑی وجہ حکومتوں کی بکثرت تبدیلی ہے، جس کے ساتھ ہی حکمت عملیاں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ادھورے منصوبے کی تکمیل کے بجائے نئے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں۔

ان کا یقین ہے اور انہوں نے گزشتہ کئی برسوں کے تجربے سے یہ حاصل کیا کہ کمیونٹی کی سطح پر سرکاری اہلکاروں کی بہ نسبت غیر سرکاری تنظیموں کے کارکن اور خاص طور پر خواتین فیلڈ ورکرز زیادہ موثر طریقے سے کام کرسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے پسماندہ علاقوں کی عورتوں سے بات چیت کرنا، ان کے مسائل سننا اور مشورے دینا زیادہ آسان ہے اور ان کی کوششوں سے نچلی سطح پر خاموش ترقیاتی تحریک کی کامیابی کی گواہیاں ملی ہیں۔

گزشتہ اٹھارہ برسوں کے دوران پاوہنا کے زیر اہتمام فیلڈ ورکرز، سپروائزرز اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں سینکڑوں افراد کو تربیت دی گئی۔ ادارے کے اغراض و مقاصد میں انسانی وسائل کا فروغ بھی شامل ہے تاکہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں ہر فرد خصوصاً عورتیں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اپنے مالی وسائل خود پیدا کریں۔

''دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح ہمارے ہاں تحفظاتی جال، یعنی سوشل سکیورٹی سکیمیں اور بوڑھوں کے لئے پنشن وغیرہ نہیں ہے۔ عام لوگ اپنے بچوں کو بڑھاپے کا سہارا خیال کرتے ہیں۔ بچوں کی بکثرت اموات کی بنا پر مزید بچے پیدا کرنے کی خواہش ایک روایتی رجحان ہے جس سے عورت کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ لیکن وہ ممالک جنہوں نے کم سن بچوں کی اموات پر قابو پا لیا وہاں سماجی اور اقتصادی بہتری کے علاوہ ملازمتوں کے بہتر مواقع، بہتر صحت اور بہتر سماجی انصاف میسر ہے۔

زیبا کے بقول بے شک این جی اوز نے آبادی، عمومی صحت اور عورتوں کی معاشی

خودمختاری کے ضمن میں بہت سے اقدام کیے لیکن ان کے منصوبوں کی کامیابی اور پائیداری اسی وقت ممکن ہے جب حکومت اور غیر سرکاری اداروں کے درمیان تعاون ہو۔ اعلیٰ سطحی فیصلے اور پالیسیاں مرتب کرتے وقت این جی اوز کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے۔

MashalBooks.org

# شیریں پاشا

''یہ وہ زمانہ تھا جب مارشل لا حکام کا ملک بھر میں زندگی کے ہر شعبے میں، ہر مکتبِ فکر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ جنرل مجیب الرحمٰن نیوز روم میں بیٹھ کر خبر نامہ لکھا کرتے تھے۔''

شیریں پاشا نے حکومتوں کی طرف سے میڈیا پر کنٹرول کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اسے براہ راست خود بھگتا بھی۔ ان پر وہ دور بھی گزرا جب 1985ء میں ضیاء الحق کے ریفرنڈم پر 10 فیصد لوگ بھی ووٹ دینے نہیں آئے تھے اور ٹیلی ویژن دکھا رہا تھا کہ ملک بھر کے لوگ فوجی آمر کو ووٹ دینے کے لئے اڈے چلے آتے ہیں۔

شیریں پاشا نے نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے فائن آرٹس میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد وہ فنونِ لطیفہ کی تاریخ پڑھنے کی غرض سے امریکہ چلی گئیں۔ اس دوران انہوں نے فلم سازی کا کورس بھی کیا۔ سنہ 75ء میں وہ جب وطن واپس آئیں تو پی ٹی وی کے ساتھ بطور پروگرام پروڈیوسر منسلک ہو گئیں۔ چولستان پر ان کی دستاویزی فلم نے انہیں صفِ اول کے پروڈیوسروں میں لا کھڑا کیا۔ ان کی ایک اور فلم ''پرانے لاہور کی زندگی'' پر انہیں برلن میں ایوارڈ ملا۔ اس سے وہ علمی سطح پر مشہور ہو گئیں۔ اس کے بعد اس دستاویزی فلم کو پاکستان میں بھی دکھایا گیا۔ اس پر انٹلیکچوئل سطح پر خاصی بحث بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ نے پرانے لاہور سے شاہی محلے کو کیوں نکالا۔ وہ ایک حقیقت ہے، آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

یہ شیریں کی مجبوری تھی۔ وہ جب یہ فلم بنا رہی تھی اس وقت سرکاری ادارے میں ملازم تھیں۔

ادیب، شاعر، صحافی، مصور جس طرح زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اور اسے

اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں، بالکل وہی وصف شیریں پاشا کا ہے۔ ان کا سیلولائیڈ، مصور کا کینوس اور ادیب کا صفحہ ہے۔

''میں جب پی ٹی وی میں آئی تو دستاویزی فلمیں بنانے کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا۔ البتہ چند ایک نام اس ضمن میں پہچانے جاتے تھے۔ جبکہ میں دستاویزی فلموں میں بہت دلچسپی رکھتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے چولستان پر فلم بنائی۔ مجھے یہ کام اس لئے سونپا گیا تھا کہ اسے کرنے کا کوئی اور پروڈیوسر تیار نہیں تھا۔ میرے لئے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا بہترین موقع تھا۔ 50 منٹ کی اس فلم میں چولستان کے علاقے کے خانہ بدوشوں اور ان کی ثقافت کو دکھایا گیا تھا۔

1981ء میں شیریں پاشا نے ایک فلم ''صبح لاہور'' بنائی جسے گریجویٹ ایوارڈ دیا گیا، جبکہ پی ٹی وی حکام نے اس پر گندی فلم (Dirty) فلم کا الزام لگایا تھا۔ یقیناً پروڈیوسر نے مورد الزام ٹھہرائے جانے کا سامان پیدا کیا تھا۔ اس زمانے میں زندگی کے تکلیف دہ حقائق کو دکھانا یا سچ بولنا منع تھا۔ شیریں نے جن چیزوں کو فوکس کیا جو واقعی بہت غلیظ تھیں۔ مثلاً جب صبح ہوتی ہے تو پرانے لاہور کے لوگ کس طرح جاگتے ہیں۔ کتے بھونکتے ہیں۔ سڑکوں کا گرد وغبار بھی لوگوں کے ساتھ ہی جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی اقتصادی حالت یہ ہے کہ دس مربع میٹر میں 50-50 لوگ رہتے ہیں۔ لیکن پروڈیوسر نے اس دستاویزی فلم کو صوتی اثرات میں لپیٹ دیا تھا۔ اس میں کمنٹری نہیں تھی۔ اس وقت کا طریقہ و اظہار یہی تھا۔ یا تو منہ بند رکھو یا کچھ نہ دیکھو، کچھ نہ سنو۔ اگر کوئی بات کہنی ہے تو تو اس طرح کہ کند ذہن حکام کے اوپر سے گزرتی ہوئی وہاں تک پہنچ جائے جہاں تک اسے پہنچانا مقصود ہے یعنی اپنے ہم خیال لوگوں تک۔ یعنی جو زیر سطح آپ سے مخاطب ہوتے ہیں، وہ بھی آپ بھی ہم سب اس دن کے انتظار میں تھے کہ کب یہ دور گزرے، کب اظہار کی پابندیاں ختم ہوں، کب جمہوریت بحال ہو لیکن۔

''اتنا دکھ مارشل لا کے دنوں میں نہ ہوا تھا جتنا جمہوریت کی بحالی پر۔ الیکٹرانک میڈیا جوں کا توں رہا۔ وہی کچھ ہوتا رہا جو پچھلے برسوں میں مشاہدے میں آیا تھا۔ ہم سب آزادی کے انتظار میں تھے لیکن جمہوریت کے علم برداروں نے ہمارے خواب چکنا چور کر دیئے۔''

شیریں پاشا نے 1990ء میں پی ٹی وی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ اب خودمختار فلم پروڈیوسر ہیں۔

سرکاری میڈیا سے آزادی کے بعد شیریں پاشا نے ایک ڈاکیو ڈراما ''دیر نہ ہو جائے'' بنایا۔

''یہ ایک مرد کی کہانی تھی جس میں عورت امیرن کو صرف دو جملے بولنے تھے۔ لیکن جب وہ فلم تیار ہوئی تو صرف امیرن کا کہانی تھی۔ فلم کے تمام زاویے امیرن پر جا کر ختم ہوتے تھے کہ وہ عورت ہی ہے جو ماحولیاتی ابتری سے نمٹتی ہے۔ علاقے کا کوڑا کرکٹ اور مچھر مکھیاں اسے ہی ستاتی ہیں۔ وہی پانی خریدنے کے لئے جاتی ہے۔ مرد تو دن بھر اپنے کام پر ہوتا ہے۔''

شیریں نے حال ہی میں لڑکیوں کی خواندگی کے موضوع پر بلوچستان میں ایک دستاویزی فلم بنائی ہے۔ اس دوران انہیں بلوچستان کی دور افتادہ جگہوں پر جانے، وہاں کی عورتوں کی حالت کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔

شیریں عام لوگوں کی کہانیوں پر مبنی ایک ٹیلی ویژن سیریز بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور اگر کبھی موقع ملا اور سرمایہ دستیاب ہوا تو وہ فیچر فلم بھی بنائیں گی۔ شاید اس طرح کبھی ہمارے ہاں متوازی سینما کا آغاز ہو سکے۔

''میں کوئی غیر معمولی طور پر ذہین نہیں تھی۔ لیکن مجھے ہر طرف یہ دکھائی دیتا تھا کہ مجھے کچھ کرنا ہے۔ زندگی ایک جدوجہد ہے، مسلسل تگ و دو ہے۔''

''شوہر بظاہر ایک لبرل انسان ہیں۔ لیکن ایک کارکن عورت تھکی ہاری گھر لوٹتی ہے تو اسے گھریلو کاموں کو بھی نمٹانا ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی ریلیف نہیں مل سکتی۔ چاہے وہ امیرن ہو، شیریں پاشا ہو یا کوئی اور۔''

شیریں پاشا کے تین بچے ہیں۔ بڑی بیٹی کی عمر 23 سال ہے۔

MashalBooks.org

# فریال علی گوہر

فریال سوال کرتی ہیں ''معاشرے کے مرتب کردہ اصولوں سے، بہت سارے مفروضوں سے،خود ساختہ مقولوں سے۔

ایک مکمل عورت............؟!!!

کہیں دور سے آواز سنائی دیتی ہے۔ اولاد والی ایک عمر رسیدہ عورت بے اولاد نو عمر عورت سے کہہ رہی تھی ''عورت جب تک اپنی کوکھ سے بچے نہیں جنتی وہ ادھوری رہتی ہے۔'' وہ چونکی تھی۔ دوسری عورت اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ زہر آلود ہو کر مٹ گئی۔ ایک شوہر نے، بہت سے شوہروں نے، اس کے شوہر کی طرح دوسری شادی کر لی کہ پہلی بیوی بانجھ تھی۔ مرد کی زرخیزی ضائع ہو رہی تھی۔ نسل کو چلانا ضروری تھا۔

فریال نے اپنے کام ''یہ میری زندگی'' میں ایک مکمل عورت کے بارے میں بہت سے سوالات کیئے۔ بہت سی عورتوں کی آواز بن کر، کہ فریال کے کال میں ان کی اپنی زندگی، معروضی کیفیت اور صورت حال، دراصل ایک علامت ہے، معاشرے کے وسیع کینوس کا ایک موتیف۔

فریال کے متذکرہ کالم میں دو اشتہار چھپے ہیں:

1۔ عزت دار گھرانوں کی خوبصورت، سلیقہ مندی، پڑھی لکھی، ملازمت پیشہ، بے ملازمت لڑکیوں کے رشتے درکار ہیں۔

2۔ امریکہ کے بنے ہوئے دو ماؤنٹین بائیسکل حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں............

پہلا اشتہار خوبصورت لڑکیوں کو مکمل عورتیں بنانے کا پروگرام اور دوسرا اشتہار؟

فریال کو شادی میں اپنی ساس کی طرف سے ایک ماؤنٹین بائیسکل تحفے میں ملی تھی۔

''میں کچھ بھی نہیں ہوں تاوقتیکہ کہ میں ''ضرورت رشتہ'' کے کالم کی عورت نہ بن جاؤں، جو نرم خو ہے، نرم گو ہے اور باقاعدگی سے مار کھاتی ہے اور آہستہ آہستہ روتی ہے۔ جو رات بھر اپنے بیمار بچے کی تیمارداری کرتی ہے اور اپنے بچے کی موت کا خوف اکیلی سہتی ہے۔''

فریال ایک بار دو زخمی گدھوں کو لے آئیں۔ مرہم پٹی کی۔ وہ دونوں خوفزدہ تھے کہ انسانوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

فریال رات بھر جاگی تھیں اپنی نئی فلم ''ٹبی گلی'' کی ایڈیٹنگ کرتے ہوئے۔

''میری اولاد۔ ٹبی گلی''۔ فریال نے سوچا تھا۔

کیا میں مکمل عورت نہیں!!!

پیزوان............ فریال کی پہلی فلم۔ ایک کہانی جو صدیوں سے قبائلی نظام کے سرداروں کی جھوٹی انا، کھوکھلی عزت و ناموس کے کھردرے پتھروں کے جلو میں پنپتی رہی تھی، وہ احساس کی بھٹی سے تکلیف دہ سچائی میں ڈھل گئی تھی۔

فریال ''چاند گرہن'' ''اڑان'' اور ''زرگل'' کی اداکارہ، کالم نویس، فلمساز، ہدایت کار، کیمرہ مین (وومن) سکرپٹ رائٹر۔

فریال کا اظہار۔ ابلاغ کے کئی وسیلے۔ جیسے ایک بڑا دھارا کوہساروں سے ٹکراتا ہوا، وادیوں اور میدانوں میں سے گزرتا ہوا، سمندر کے دہانے کے قریب پہنچتا ہے تو اپنے ساتھ بہا کر لانے والے مواد کو چھوڑ دیتا ہے۔ پھر وہ ڈیلٹا کی بہت ساری دھاروں میں تقسیم ہو کر بہت سارے ذریعے نکالتا ہے کہ چکنی سطح سے الجھ کر اپنے بہاؤ کو روکنا اس کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔

فریال علی گوہر نے لاہور امریکن سکول، کنیئرڈ کالج لاہور، سویٹ برائیر کالج فار ویمن ورجینیا (امریکہ) اور میکگل میں پڑھا اور مونٹریال سے پولیٹیکل سائنس میں بی اے آنرز کیا۔ میڈیا ایجوکیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ برٹش فلم انسٹی ٹیوٹ، یونیورسٹی آف لندن سے حاصل کیا۔ ریڈیو نیدر لینڈ ٹریننگ سنٹر ہلورسم سے حالاتِ حاضرہ اور خبر کے شعبے

میں ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی۔

تعلیم کے سلسلے میں بہت سال بیرون ملک گزارنے کے بعد پاکستان لوٹیں تو سنہ 1992ء میں سینما یا انڈی پنڈنٹ فلم کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے تحت انہوں نے ماحول اور دیگر ترقیاتی اور معاشرتی مسائل پر دستاویزی فلمیں تیار کیں۔ ''خدا کی بستی'' 1996ء میں استنبول میں منعقد ہونے والی کانفرنس ''ھیبی ٹاٹ 2'' میں پیش کی گئی۔ اس دستاویزی فلم کے بارے میں تحقیق، پروڈکشن اور ڈائریکشن تمام ذمہ داریاں فریال نے خود نبھائیں۔

پاکستانی سینما میں عورت کے امیج کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فریال کا کہنا تھا 'فلم میں عورت کو یا تو مریم دکھایا جاتا ہے یا ایک بری عورت دکھایا جاتا ہے۔ یہ ایک غلط تاثر ہے۔''

انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے ''پاکستانی سینما میں عورت کا امیج'' میں لکھا ''سینما بہرحال ایک بصری تجربہ ہے جسے آواز کی قوت دی گئی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک ایسا میڈیم ہے جو بصری نشاط انگیزی پر انحصار کرتا ہے اور دراصل مردانہ تاک، کے تسلط کا نظریاتی ڈھانچہ ہے۔ مرد کی نظر میں معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور جنسی طاقت جھلکتی ہے۔ وہ عورت پر اپنی حاکمیت کا یقین اور دعویٰ بھی کرتا ہے۔ اگر ایک نیا وژن تخلیق کرنا مقصود ہے تو اس رجحان کو چیلنج کرنا ضروری ہوگا۔

مرد کی نظر............!!

فریال نے اپنی فلم ''پیزوان'' کو ٹیلی کاسٹنگ کے لئے پی ٹی وی کے متعلقہ حکام سے رابطہ کیا۔ جواب ملا ''چھوڑیں جی فلم کو۔ آپ آئیں۔ آپ ٹیلی ویژن پر آئیں۔''

فریال نے یف ڈیک کے لئے اپنی ماہرانہ خدمات پیش کیں۔ متعلقہ وفاقی وزیر سے رابطہ کیا۔ شرفِ قبولیت کے بعد فرمایا ''آپ آئیں جی ہمیں آپ جیسے لوگ ہی مطلوب ہیں'' اگلے روز قومی اسمبلی کے اجلاس میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ اس خاتون کے فلاں وفاقی وزیر کے ساتھ کس نوعیت کے تعلقات ہیں۔

فریال لاہور کے شاہی محلے کی ''ٹبی گلی'' کا سکرپٹ لکھنے اور اسے فلمانے میں مصروف ہوگئیں۔ وہ فلم جو شاید اندرونِ ملک ریلیز کے لئے ناقابلِ برداشت قرار دی

جائے۔

''آرٹ فلمیں............بنانی مشکل ہیں۔ ان کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ان فلموں کے ناظرین بہت محدود ہیں۔ ایسی فلموں کو دیکھنے والا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ بہت چھوٹا ہے، جبکہ ناخواندہ طبقہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ ہماری ثقافتی اقدار کا تعین اوچھے بورژوا کرتے ہیں جن کی عورتیں اپنے لئے مزید کپڑے اور مزید زیور خریدنے میں مصروف رہتی ہیں۔ جن کی بیٹیاں گلیمر کی دلدادہ ہیں۔ ماڈلنگ کرنے کی آرزومند ہیں یہ لوگ اپنی بیٹیوں کی شادیاں اس شخص کے ساتھ کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں جو سب سے زیادہ بولی لگائے۔ تو پھر ایسی آرٹ فلموں کی کہاں گنجائش ہے جن میں کوئی پیغام ہو، جن میں عام رویوں کو تبدیل کرنے کی سعی ہو۔''

فریال نے ''میڈیا اور ویمن'' کے موضوع پر ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ اس میں شرکت کے لئے انہوں نے پاکستانی فلموں کی ایک مشہور اداکارہ کو جو حال ہی میں سیاست دان بن گئی ہیں، دعوت دی اور انہوں نے رضا مندی ظاہر کر دی لیکن ان کے ایک خیر خواہ کا، جو خود کو مارکسٹ کہتے ہیں، فون آیا اور اطلاع دی کہ ''مدعو اداکارہ کو وہی کچھ کہنا ہو گا جو ہم کہیں گے۔''

عورت کی سوچ پر، عورت کی گفتار پر مرد کا تسلط۔

فریال کا کہنا ہے کہ سوشلسٹ معاشروں میں بھی عورت کے مقام کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔ چین میں آج بھی بچیوں کو مار دیا جاتا ہے۔ روس میں عورت دن بھر فیکٹری میں کام کرتی یا بس کی ڈرائیونگ سے تھک ہار کر گھر لوٹتی ہے تو برتن دھوتی، صفائی کرتی اور کھانا بناتی ہے۔ جب وہ تھک کر بستر میں گھستی ہے تو وہ اس وقت اتنی چور چور ہوتی ہے کہ اپنے شرابی شوہر کے لئے تسکین فراہم نہیں کر سکتی۔ عورت چاہے کیوبا کی ہو یا افریقہ کی، یا وہ امریکی صدر کی بیوی ہی کیوں نہ ہو، اسکے مسائل مختلف نہیں ہیں۔

# نائلہ قادری

مردوں کی آزادی کے لئے ایک دستاویزی فلم بنا رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مردوں پر بھی حد بندی ہے۔ جب تک مرد اور عورت دونوں کو آزادی نہیں ملے گی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔''

بیجنگ ایئرپورٹ............عورتوں کی چوتھی عالمی کانفرنس کے سلسلے میں منعقد کیا گیا، این جی او فورم ختم ہو چکا تھا۔ اس میں شریک دنیا بھر کے مختلف ممالک کی عورتیں واپس لوٹ رہی تھیں۔ بے انتہا ہجوم تھا، عورتوں کا اور ان کے سوٹ کیسوں کا۔ ایک نوعمر لڑکی جو اپنی سپورٹس سائیکل پر سوار تھی ہمارے سامنے آ کر رک گئی۔ یہ نائلہ قادری تھی۔

کوئٹہ، بلوچستان، سپورٹس بائیسکل۔!!

نائلہ قادری کا یہی شعار ہے۔ روایتوں سے بغاوت، چلتن، پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی، سائیں سائیں کرتی ہواؤں کے اندر کی چیخ کو شاید اس سے پہلے کسی نے بغور سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''مقتل میرا گھر'' بلوچستان کی دیرینہ روایت ''سیہ کاری'' پر مبنی نائلہ قادری کی دستاویزی فلم جسے بیجنگ کانفرنس کے دوران نمائش کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ بلوچستان کے خانہ بدوشوں کی سچی کہانی۔ یہ اس علاقے کی ثقافت کا حصہ ہے۔ مرد اپنی عورتوں سے نفرت کرتا ہے، انہیں حقیر جانتا ہے۔ خصوصاً اپنی بیٹیوں سے سیہ کاری یہاں کا رواج ہے۔ مرد شک کی بنیاد پر اپنی بیوی یا گھر کی کسی بھی عورت کو قتل کرنے کا مجاز ہے۔ یہ بھی کہ اگر عورت کسی غیر مرد کی زیادتی پر اپنی حفاظت کرتی ہے اور اس مرد کو مار ڈالتی ہے تو بھی وہ ماردی جاتی ہے۔

MashalBooks.org

''میں نے جب اس موضوع پر فلم بنانے کا ارادہ کیا تو ہمارے بہت سے ترقی پسند دوستوں نے اس کی مخالفت کی کہ یہ تو اس علاقے کا دستور ہے۔'' نائلہ کہتی ہیں:

''اس فلم کو ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا، لیکن جب اس پر ریڈیو رپورٹ بنائی گئی تو اس میں سیہ کاری کے الفاظ نکال دیئے گئے۔''

فرسودہ روایتوں کے خلاف آواز اٹھانا نائلہ کے خون میں رچا بسا ہے۔ جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ دادی کا تعلق مرہٹہ خاندان سے تھا۔ پرنانی نیپالی گورکھوں میں سے تھیں۔ نانی کوئٹہ میں خاکسار تحریک کی خلیفہ تھیں۔ بیلچہ ان کا نشان تھا۔ ماں نے عورتوں کے مساوی حقوق کے معاملے میں کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

''اس وقت میری عمر آٹھ نو برس کی تھی جب میں اپنے گھر میں بلوچستان کے حقوق کی باتیں سنتی تھیں۔''

نائلہ کے والد ممتاز سیاسی کارکن ہیں۔ وہ برسوں سے میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کے ہمراہ بلوچستان کے حقوق کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہے ہیں۔

نائلہ نے بلوچستان یونیورسٹی سے بی فارمیسی، پنجاب یونیورسٹی سے ایم فل کیا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بلوچستان یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں۔ اس کے ساتھ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہی ہیں۔

تدریس میرا وسیلہ روزگار ہے، لیکن اس سے میرا اصل کام بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ کوئی ایسی نوکری کروں جو میرے کام کے نزدیک ہو۔

نائلہ گزشتہ کئی برسوں سے انجمنِ جمہوریت پسند خواتین کے ساتھ منسلک ہیں۔ کہتی ہیں:

''ہمارا کام عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانا ہے۔ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنا ہے تاکہ وہ سیاسی دھارے میں باقاعدہ طور پر شریک ہو کر اپنا کردار ادا کرسکیں۔ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔

نائلہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کی پہلی نظم ''انقلاب'' اس وقت شائع ہوئی تھی جب ان کی عمر آٹھ نو برس تھی۔ زمانہ طالب علمی میں بھی بہت سی ہنگامہ آرائیاں کیں۔ ایک لڑکی کو خاندانی دشمنی کی بنا پر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ نائلہ نے گولیوں کی بارش میں کود کر

MashalBooks.org

اس کی جان بچائی۔ اسے سات گولیاں لگ چکی تھیں۔ لیکن جان بچ گئی۔

یہ اس واقعے سے پہلے کا ذکر ہے جب نائلہ نے ایک غیر انسانی پھانسی کے خلاف احتجاج کیا تا تو انہیں کالج سے نکال دیا گیا تھا۔

جب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم فل کرنے کا ارادہ کیا تو کسی نے کہا یہ ادارہ اب بانجھ ہو چکا ہے۔ یہاں پر کوئی تخلیقی کام نہیں ہو سکتا۔ اس پر رجعت پسندوں کا قبضہ ہے۔

''طلباء کی ایک جماعت نے یونیورسٹی ہوسٹل کو ٹارچر سیل بنایا ہوا تھا۔ صرف اس لڑکی کو کمرہ مل سکتا تھا جو ان کی حمایت کرے۔ ان کے سامنے وارڈن بے بس تھی۔ میں نے ایک ماہ کی بحث و تکرار کے بعد ایک کمرہ حاصل کر لیا اور رجعت پسندوں کے خلاف ایک گروپ تیار کر لیا۔ ہم نے ان کے خلاف کئی جلوس نکالے جن میں سے ایک حقیقی منظر کو ٹیلی ویژن کے ڈرامے ''نیلے ہاتھ'' میں بھی شامل کیا گیا تھا۔''

نائلہ کا کہنا ہے کہ بلوچستان کی دیہی عورت قبائلی رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے تو شہری کارکن عورت بھی محفوظ نہیں ہے۔ سرکاری ہسپتالوں اور اداروں میں کام کرنے والی عورتیں خصوصاً عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ عالم یہ ہے کہ ایک عورت کی پسلیاں اور سر کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی لیکن یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی موت ملیریا اور ہیپاٹائٹس بی کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے باپ کے آنے سے پہلے اسے کہیں دور دراز علاقے میں دفنا دیا گیا تھا۔

''ہم شہری معاشرے کی اس قسم کی برائیوں پر بھی ایک دستاویزی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

بہت سے ایسے معاملات دبے رہتے ہیں۔ انہیں اگر منظر عام پر لایا جائے تو اس کا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً پانچ سال قبل بلوچستان ہائیکورٹ نے سیہ کاری کو قتل قرار دے دیا، جبکہ اس سے پہلے اس پر کوئی سزا نہیں تھی۔ اب بلوچستان کی حکومت عورتوں کی ترقی کی پالیسی بنا رہی ہے۔ سیاست میں عورتوں کی شرکت کی اہمیت محسوس کی جا رہی ہے۔

نائلہ کی آئندہ فلموں میں عورتوں کی روایتی معلومات کے بارے میں ہے۔ مثلاً دواؤں اور صحت کے ٹوٹکے، ستاروں کے بارے میں ان کا علم وغیرہ۔

نائلہ کی شادی طالب علمی کے زمانے میں ہو گئی تھی۔ ان کا شریکِ حیات شریک

MashalBooks.org

کار بھی ہے۔ ان کے تین بچے ہیں۔ نائلہ بیجنگ اور منیلا کی کانفرنسوں میں عورتوں کے معاشرتی مسائل لے کر گئی تھیں۔ اس سے قبل وہ ماسکو اور کوریا کے یوتھ فیسٹیولز میں شریک ہوئیں۔

MashalBooks.org

# عنیزہ نیاز انور

''ضرورت اس بات کی ہے یہ میری خواہش اور ارادہ ہے کہ آج کی عورت کے لیے نیا بہشتی زیور لکھا جائے جس میں عورتوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کی رہنمائی کی جائے کہ خاندان اور باہر کے مرد جب ان کے ساتھ غلط سلوک کریں تو انہیں کیا کرنا چاہئے۔ وقت بدل گیا ہے۔ جو باتیں امی، نانی یا دادی بتایا کرتی تھیں وہ سسٹم ختم ہو چکا ہے۔''

عنیزہ نیاز پیشے کے لحاظ سے سائیکاٹرسٹ ہیں لیکن انہوں نے اپنے علم اور تربیت کو محدود نہیں رکھا۔ نفسیاتی علاج معالجے کے علاوہ ذہنی صحت کا شعور عام کرنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہی ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں مختلف پہلوؤں سے تحقیق کی اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو کتابی صورت اور اخبارات میں مضامین کی صورت میں دوسروں تک پہنچایا۔

نوجوان لڑکیوں کو خصوصاً وہ جو مختلف کاموں اور دیگر بیرونی سرگرمیوں کے لئے گھر سے نکلتی ہیں تو انہیں عوامی جگہوں، بسوں، بازاروں یا دفاتر میں جنسی ہراس کا سامنا کرنا پڑتا ہے، انہیں اس صورت حال سے کس طرح نمٹنا چاہئے۔

عنیزہ کا تجزیہ ہے کہ ''چار دیواری'' میں رہنے سے عورت کو تحفظ نہیں ملتا، بلکہ اس سے وہ مزید کمزور ہوتی ہے۔، اس کے برعکس عملی زندگی میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں عورتوں کی شمولیت سے ہر عورت خود کو مضبوط محسوس کرنے لگے گی۔

''مقامِ کار پر جنسی ہراس کے بارے میں ایک مطالعے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے 20 سے 30 سال کی عمر کی 50 عورتوں پر تحقیق کی جن میں سے 38 غیر شادی شدہ تھیں۔ ان میں سے 88 فیصد نے صورت حال کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا، جبکہ

12 فیصد کے لئے ملازمت پر برقرار رہنا مشکل تھا۔جنسی ہراس میں زیادہ تر عورت کی شکل و صورت اور لباس پر معنی خیز ریمارکس شامل ہوتے ہیں۔ مرد چائے اور کھانے کی دعوت دیتا ہے اور کام کے دوران ہاتھ لگانے یا کمر پر تھپکی دینے کی کوشش کرتا ہے۔

جن عورتوں نے اس صورت حال سے بخوبی نبھاؤ کیا ان کا طرزِعمل کچھ یہ تھا کہ اپنے برتاؤ یا گفتگو سے بلاٹوک ظاہر کریں کہ انہیں ذاتی ریمارکس پسند نہیں۔ دعوت مسترد کی اور انہیں نظر انداز کیا۔

عنیزہ نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ برطانیہ سے سائکاٹری میں ایف آرسی ایس اور پی ڈی ایف امریکہ سے کیا۔عنیزہ ایوی ایشن میڈیسن میں خصوصی تربیت حاصل کرنے والی دوسری فرد ہیں۔

عنیزہ کے والد فوج میں تھے۔ جب وہ میٹرک میں تھیں تو ان کا انتقال ہو گیا۔ عنیزہ کی والدہ نے شوہر کے انتقال کے بعد اپنی تعلیم دوبارہ شروع کی۔کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ نانا بیرسٹر اور قائداعظم کی مسلم لیگ کے فعال کارکن تھے جبکہ والدہ بھٹو کے دور میں خواتین کے حقوق،تعلیم اور شعور کی بیداری کے ضمن سرگرم عمل رہیں۔ عنیزہ اپنی والدہ کی حوصلہ مندی اور فعال شخصیت سے بہت متاثر ہوئیں۔

عنیزہ کی رائے میں نفسیات کی رو سے تمام عورتیں فیمی نسٹ ہوتی ہیں۔ حالیہ برسوں میں ادیب خواتین نے عورت کے بارے میں مرد کا قائم کیا ہوا غلط تاثر ختم کر دیا ہے۔ انہوں نے تحقیق اور مطالعے سے اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ عورت کو روایتوں اور ثقافت نے وہ مقام نہیں دیا جس کی وہ مستحق ہے۔کسی ملک کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی ترقی عورت کے مقام کو بلند بھی کرسکتی ہے اور گرا بھی سکتی ہے۔

وہ کہتی ہیں ''............آج کی عورت متصادم صورت حال میں زندہ ہے۔ بیشتر عورتیں روایتی ثقافت میں پھنس گئی ہیں۔ وہ جب آزادی کی چھوٹی سے کھڑکی سے باہر جھانکتی ہیں تو خود سے سوال کرتی ہیں ''میں کون ہوں؟ ''یہ سوال مذکورہ تصادم کی اصل وجہ ہے۔''

اس کا حل اس سوال کے جواب میں عنیزہ کا کہنا ہے کہ عورت کو پہلے خود ایک فرد کی حیثیت سے اپنی پہچان کرنی ہوگی۔ وہ ایک ایسا سامان نہیں ہے جس پر کسی اور کا لیبل لگا ہوا ہے۔نئی عورت کیا ہے؟ اس تصور کو ابھارنا ہوگا۔

عنیزہ نیاز نے پیشہ وارانہ تحقیق اور مقالات کے علاوہ عام لوگوں کی معلومات اور استفادے کے لئے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال، پاکستانی عورت کی ذہنی صحت کے مسائل اور عورت کے خلاف تشدد قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی حالیہ کتاب ''پاکستانی عورتوں کا ابھرتا ہوا تاثر'' ہے جس میں انہوں نے چند ایسے مصوروں (جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل ہیں) کو منتخب کیا ہے جو عورت کی شبیہہ بناتے ہیں۔ انہوں نے ان پر اپنی رائے بھی دی ہے۔ مثلاً اقبال مہدی کی عورت محض ایک خوبصورت منظر کا حصہ ہے۔ وہ اس میں صرف ظاہری حسن تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس کے کردار اور احساسات اور خواہشات کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ عورتیں کمیونی کیٹ نہیں کرتیں، نہ ہی آپ کی طرف دیکھتی ہیں۔ ناہید رضا کی تصاویر عورت کی تخلیق اور ارتقا کے تمام مراحل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہاجرہ منصور کی عورتیں خواب دیکھتی ہیں، جبکہ اطہر جمال روز مرہ معمولات میں پھنسی ہوئی عورت کی بے رنگ زندگی کو خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مہر افروز کی عورت کمزور نہیں ہے۔ وہ ایک فرد ہے جو جدوجہد اور ارتقائی مراحل کی علامت ہے۔

''شہباز کو پنجرے میں بند کر دیں تو وہ اس کی سلاخوں کو، چاہے وہ لوہے کی ہوں یا سونے کی، کاٹ دے گا۔''

پاکستانی عورت کے امیج پر مبنی اس کتاب کے سرورق پر یہ سطور عورت کی مضبوطی کی گواہی دیتی ہیں۔ بقول عنیزہ کے ان فنکاروں نے عورت کے روایتی کردار کا عکس پیش کیا ہے۔ لیکن یہ امکان ضرور ہے کہ مستقبل میں عورتوں کے مثبت کردار اور صلاحیتوں کو تسلیم کیا جائے گا۔

عنیزہ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ متعدد تنظیموں کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ کراچی کے ویمنز سٹڈیز سنٹر میں لیکچر بھی دیتی ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ بچے نہیں ہیں۔ شوہر کے تعاون کی معترف ہیں۔ البتہ عنیزہ کہتی ہیں:

''مجھے خاندان کی عورتوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہے۔'' وہی ان کی راہ میں رکاوٹ ہیں جو اعتراض اور تنقید کرتی ہیں کہ گھر چھوڑ کر کانفرنسوں میں چلی جاتی ہے۔

# شفا نعیم

''کوئی ایک فرد یا گروپ پورے سسٹم کو تبدیل نہیں کرسکتا۔'' شفا کہتی ہیں ''وہ نی یا ملک بھر کی خرابیوں، کمزوریوں اور برائیوں کو یوٹوپیا میں بدلنا ممکن نہیں ہے لیکن ہم، جو معاشرے میں مثبت تبدیلی کے خواہشمند ہیں، اگر ثابت قدمی، خلوص نیت سے اپنے کام کرتے رہیں تو اور کچھ نہ سہی، سوچنے کے انداز کو تبدیل ضرور کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق اپنے کام کو وہاں سے شروع کریں جہاں سے کر سکتے ہیں۔ مثبت تبدیلی اگر پہلے عملی قدم سے شروع ہو کر قرب و جوار تک پہنچ جائے تو وہ مستقبل کی بڑی اور وسیع تبدیلی کا سبب بن سکتی ہے۔''

گزشتہ دنوں کراچی کے حالات بگڑے۔ تشدد عام شہری کی زندگی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ، دونوں طریقوں سے داخل ہوا تھا۔ اس سے لوگوں کے رویوں، سماجی سرگرمیوں میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ رواداری ختم ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جو سیاسی لسانی اور مذہبی فرقہ واریت کے اثرات پر سائنسی طریقے سے کام کر رہے تھے اور صورت حل کا تجزیہ کر رہے تھے ان میں ایسوسی ایشن فار مینٹل ہیلتھ پیش پیش تھی۔ شفا نعیم اس تنظیم کی سرگرم کارکن ہیں۔

شفا نعیم کا بچپن پشاور مس گزرا۔ ابتدا سے ایم بی بی ایس تک تمام تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ خیبر میڈیکل کالج کے سنہ 74ء کے کامیاب ہونے والے طلبا و طالبات میں سرفہرست رہ کر کامیابی حاصل کرنے کے بعد کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز پاکستان سے سائکاٹری میں خصوصی تربیت حاصل کی۔ شفا آغا خان یونیورسٹی کراچی میں کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ 5 برسوں سے سبزی منڈی کراچی میں واقع ایدھی سنٹر میں مینٹل ہیلتھ کلینک میں اعزازی طور پر کام کرتی ہیں۔

MashalBooks.org

1989ء میں ایک رضا کار تنظیم ''وار'' (WAR AGAINST RAPE) کا آغاز ہوا تو اس میں جو چند افراد شامل تھے ان میں شفا بھی موجود تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ زنا بالجبر اور جنسی تشدد کی دیگر صورتوں کے خلاف خاموشی کو توڑا جائے۔ اس ضمن میں بچوں اور عورتوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس بارے میں عوامی شعور بیدار کیا جائے۔ ''لیکن مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی صورت حال سے دو چار لوگ اسے چھپاتے ہیں۔ وہ اس کا حل تلاش نہیں کرنا چاہتے۔ ہم جس کی مدد کرنا چاہتے ہیں وہ مدد لینے سے انکار کرتا ہے۔'' شفا کہتی ہیں۔

''وار'' کے ساتھ کام کرنے کے دوران عام سماجی رویوں کی تائید ہوئی۔ مثلاً یہ کہ عورت اپنے جسم اور اپنی مرضی کی مالک نہیں۔ اسے کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں۔ گھر اور خاندانی سطح پر فیصلہ ساز باپ ہے، بھائی ہے یا شوہر ہے۔ عورت اگر کسی تشدد کا شکار ہوتی ہے تو وہ اس ارتکاب کی ذمہ دار ٹھہرائی جاتی ہے کہ وہ گھر سے کیوں نکلتی ہے۔ اس نے اس طرف کیوں دیکھا۔ اسے کس چیز کی کمی ہے۔ وہ کیوں ملازمت کرتی ہے۔ مرد کا یہ کنٹرول معاشرے کے تمام طبقات میں یکساں طور پر موجود ہے۔

شفا کا تجربہ ہے کہ وہی عورت قصور وار ٹھہرائی جاتی ہے جو سوچتی اور جو اپنی ذات کی پہچان کروانا چاہتی ہے۔ جو صرف مرد کی بنائی ہوئی دنیا میں سانس نہیں لینا چاہتی۔ یہ عورت دکھ اٹھاتی ہے۔ لیکن جو عورتیں سمجھوتہ کر لیتی ہیں، وہ بیگم بن جاتی ہیں۔ مہنگے زیورات اور ریشمی کپڑے پہنتی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتی ہیں۔ دبئ میں شاپنگ کرتی ہیں لندن اور پیرس میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارتی ہیں۔

''وار کے ساتھ منسلک رہ کر شفا کو جو تجربات ہوئے ان کی روشنی میں شفا کا کہنا ہے کہ جنسی تشدد کا شکار لڑکیاں ہی نہیں کم سن لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے بارے میں مجرم زیادہ تر سوتیلے باپ، سوتیلے بھائی ہوتے ہیں۔ چند ایسے کیس بھی سامنے آئے کہ مجرم، لڑکی کا اپنا باپ تھا۔ جبکہ لڑکے زیادہ تر گھریلو ملازمین اور ڈرائیوروں کی زد میں آتے ہیں۔ وہ لڑکے جو کم عمری میں نوکریاں کرنے لگتے ہیں یا بازار میں چھابڑی لگاتے ہیں، دوکنوں اور ورکشاپوں میں ''چھوٹو'' ہوتے ہیں وہ بازار ہی کے بڑے مردوں کا شکار بنتے ہیں۔

''ہمارا مقصد زندگی سے مایوس افراد کو بحال کرنا ہے۔ ہم انہیں یہ ترغیب دیتے ہیں کہ آپ خود کو تباہ شدہ املاک کی مانند خیال نہ کریں۔ وہ ایک واقعہ تھا جو ہو گیا اور گزر

گیا۔ آپ اس کی ذمہ دار نہ تھیں۔

''وار'' کے تحت متاثرین کو مشاورتی خدمات دینے کے علاوہ میڈیا کے ذریعے شعور پیدا کرنے اور چند کیسز میں پرولیس اور سرکاری حکام سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔

شفا یاد کرتی ہیں کہ ''جب میں میڈیکل کالج میں تھی تو ہمارا گروپ سوچتا تھا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد صرف پیسہ نہیں کمانا، کچھ اور بھی کام کریں گے۔ میں کہتی کہ میں رضا کارانہ کام صرف اپنے ملک میں کرنا چاہوں گی۔ کسی دوسرے ملک میں جا کر فلاحی کام کیوں کریں۔ عام طور پر اسے میری تنگ نظری کہا جاتا لیکن یہی میری سوچ تھی۔

رضا کارانہ فلاحی کام کے بارے میں شفا کا کہنا ہے کہ کچھ لوگ اس سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ مثلاً ''وار'' میں ہمارے پاس ایک ایسا کیس آیا جسے زنا بالجبر کا نام دیا گیا جبکہ اس لڑکی کی ماں خود طوائف تھی اور بیٹی سے یہ کام کرواتی تھی۔

عورت کے بارے میں عام رویوں کا ذکر کرتے ہوئے شفا نے بتایا کہ یہ افسوس کی بات ہے کہ عورت کا نام لے کر فحش مذاق کئے جاتے ہیں اور مرد اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، جبکہ یہ بھی جنسی تشدد کی ہی ایک صورت ہے۔

شفا کے فلاحی کاموں میں سے ان کا نیا پراجیکٹ آئی۔بی۔ایس (INSTITUTE OF BEHAVIORAL SCIENCES) ہے جو ان کی تنظیم ایسوسی ایشن فار مینٹل ہیلتھ کے زیر اہتمام قائم کیا گیا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں ذہنی صحت کی سہولتیں فراہم کرنا اور ذہنی علالتوں کے بارے میں عوامی رویوں کو تبدیل کرنا شامل ہے۔ نیز پاکستان خاص طور پر کراچی میں ذہنی امراض کے اسباب، اقسام اور دیگر متعلقہ امور پر تحقیقی شعبے قائم کئے جائیں گے۔ کچھ عرصہ قبل ایسوسی ایشن کے تحت ایک سروے کیا گیا تھا جس کے نتائج سے ظاہر ہوا کہ بارہ ملین کی آبادی کے شہر میں 1.2 ملین افراد شدید ذہنی امراض میں مبتلا ہیں جبکہ شہری زندگی کے دباؤ، تشدد اور بدامنی سے نفسیاتی طور پر متاثرین کی تعداد تین ملین ہے۔

شفا کا کہنا ہے کہ ان کے آئندہ پروگراموں میں گھریلو تشدد کا شکار عورتوں کے مسائل کے بارے میں تحقیق اور متاثرین کی امداد شامل ہے۔ ''ہمارا خیال ہے کہ ایسے رضا کاروں کو تربیت دی جائے جو شہر کے مختلف علاقوں کی گھریلو خواتین سے رابطہ قائم

کریں۔"

اپنے ان تمام کاموں میں شفا نعیم کو جس بات پر دکھ ہوا اور جسے وہ ایک طرح کی رکاوٹ کہتی ہیں "وہ یہ ہے کہ لوگ منفی تنقید کرتے ہیں کہ عورتیں گھروں سے نکل کر ماری ماری پھر رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں خود تو عیش سے رہتی ہیں، غریبوں کے لئے صرف تقریریں اور سیمینار ہیں۔ اس کے علاوہ جب ہم لوگوں کو مفت مشورے دیتے ہیں اور ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ شک کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے ضرور ان کا کوئی اپنا مفاد ہے۔"

شفا نعیم شادی شدہ ہیں۔ چار بچوں (دو بیٹے، دو بیٹیاں) کی ماں ہیں۔

MashalBooks.org

# عنبرین احمد

بیجنگ میں عورتوں کی چوتھی عالمی کانفرنس کے موقع پر، ہویرو میں، این جی اوفورم کے دوران جنوب ایشیائی ممالک کے خیموں میں ایک اعلان ہوا ''آج آپ ایک حیرت انگیز شخصیت سے ملیں گے۔'' دنیا بھر کی عورتیں وہاں جمع تھیں۔ اندازے لگائے جا رہے تھے کہ ان میں کون ہے جو یہاں چھپا بیٹھا ہے۔ ترغیب تھی کہ اس بڑے سوراخ میں سے جھانکیں۔ اس سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ دلچسپ امر تھا۔ پر اشتیاق بھی۔ جھانکا کون تھا؟! خود اپنا چہرہ۔ اپنا آپ! ایک خوشگوار احساس! ہم عمر بھر لوگوں سے ملتے رہتے ہیں لیکن کبھی ...... اکثر اوقات خود اپنے آپ سے ملاقات نہیں ہوتی، اپنی پہچان نہیں ہوتی۔

یہ دعوت ''بیداری'' نے دی تھی۔ بیداری ایک تنظیم ہے اور عنبرین احمد بیداری کی سرگرم کارکن ہی نہیں، یہ ان کی تخلیق بھی ہے۔

پیشے کے اعتبار سے عنبرین سائیکا ٹرسٹ ہیں جسے انہوں نے عورتوں اور بچوں کی شخصی بالیدگی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ دوسروں کی نفسیات کے بارے میں تجسس کی ابتدا بچپن میں ہوئی جب ماں کہتی تھیں کہ کسی شخص کے ظاہر پر رائے قائم کرنے سے پہلے اس کا اندر ٹٹولو۔ وہ اس ضمن میں غالب کی مثال دیتی تھیں۔ لوگ غالب کو شرابی، اوباش اور نہ جانے کیا کچھ کہتے تھے لیکن وہ دراصل اچھا انسان تھا۔ محبت کرنے والا، دوسروں کے دکھ درد کو اپنے اندر محسوس کرنے والا۔ ماں کی تربیت تھی کہ کسی کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس طرح اور کن حالات میں ایسا بن گیا ہے۔ عنبرین کی والدہ کا تعلق آگرہ سے اور والد کا پشاور سے تھا۔

عنبرین کی زندگی کے پلان میں پڑھ لکھ کر، شادی کر کے، گھریلو زندگی گزارنے

اور اپنے پیشے کے متعلق سرگرمیوں کے علاوہ کوئی اور پروگرام نہ تھا۔ عنبرین نے سینٹ جیمز اینڈ میری کانوونٹ لاہور میں ابتدائی سال فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور میں گزارے لیکن ایم بی بی ایس کی ڈگری ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے حاصل کی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ امریکہ میں قیام کے دوران سائکاٹری اور نیورولوجی میں ڈپلومہ حاصل کرنے کے لئے بچوں کے نفسیاتی علاج کے بارے میں خصوصی تربیت حاصل کی اور سینٹ الزبتھ ہسپتال واشنگٹن ڈی سی میں ریڈیڈنسی کی۔

تقریباً دس سال بعد سنہ 87ء میں پاکستان واپس آئیں تو ملکی سیاسی فضا میں گھٹن پیدا ہو چکی تھی۔ ایک طرف کراچی کی طارق روڈ پر بے پردہ عورتوں کی فحاشی جیسے بورڈ اور دوسری طرف چادر اور چار دیواری کے نعرے تھے۔ مذہب کا شدید اطلاق ہو رہا تھا تو دوسری طرف عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کے واقعات عام تھے۔ آئے دن ڈکیتیاں ہوتیں۔ جس گھر میں ڈاکہ پڑتا، اس گھر کی عورتوں کے ساتھ زیادتی بھی ہوتی۔ اخبارات میں یہ خبر ہوتی کہ فلاں علاقے میں ڈکیتی ہوئی اور ڈاکو لاکھوں روپے کی نقدی اور زیورات لوٹ کر لے گئے۔ لیکن عورت کی بے حرمتی کا ذکر نہ ہوتا۔ مرد کی ہوس کا شکار ہر طبقے کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ان پر کئے گئے تشدد کے کئی روپ ہیں۔ ذہنی تشدد، گھریلو مار پیٹ، زنا اور ناجائز مباشرت۔ فرسودہ معاشرتی رسم و رواج اور امتناعی اقدار۔ زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کے لئے مدد اور جذباتی سہارا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

فیمی نسٹ تنظیموں کے اجلاسوں میں اکثر یہ جملہ کان میں پڑتا ہے کہ عورت کے ساتھ زیادتی کے بارے میں خاموشی ایک سازش ہے۔ عنبرین نے سوچا تھا کہ اکثر عورتیں اپنے دل کی بات اپنے شوہر تک نہیں بتاتیں۔ جب تک ہم اس کا ذکر نہ کریں، ایسے واقعات پر بات چیت نہ کریں ان کے خلاف اقدام کرنا ممکن نہیں ہے۔

پاکستان لوٹنے کے بعد عنبرین کو کچھ عرصے کے لئے آغا خان ہسپتال میں بچوں کے نفسیاتی علاج کا موقع ملا لیکن وہ کمیونٹی کے لئے جو کچھ کرنا چاہتی تھیں اس کیلئے ضروری تھا کہ ایک تنظیم بنائی جائے۔ اس طرح ''بیداری'' کا قیام عمل میں آیا جس کے اغراض و مقاصد ہیں: انسانی حقوق کے بارے میں عورتوں میں شعور پیدا کرنا۔ امداد باہمی کا شعور بیدار کرنا۔ شخصیت کی تعمیر میں مدد کرنا اور نامساعد حالات سے دو چار عورتوں کو فوری مدد

پہنچانا۔

ایک تربیت یافتہ سائیکا ٹرسٹ کی حیثیت سے عنبرین کو ہمیشہ سے گروپ تھراپی میں دلچسپی رہی ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے ایک جگہ بیٹھ کر اپنے مسائل بیان کریں اور دوسروں کی سنیں تو سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ صرف ہم ہی بدنصیب نہیں، ہم جیسے اور بھی ہیں۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ اس طرح کے اجتماعات کے بعد ایک عورت نا ے کہا تھا ''میں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ عورتوں کے بارے میں بے حسی عدم ابلاغ یہاں تک کہ ظلم وستم ایسے حقائق ہیں کہ مجھے بہرصورت برداشت کرنے ہوں گے لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں ہوں۔''

بیداری کے تحت چلائے گئے گروپ تھراپی کے نتائج کچھ اس طرح ظاہر ہونے لگے۔ ایک عورت نے کہا ''میں سوچا کرتی تھی کہ میں دنیا بھر میں اکیلی ہوں۔ کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو مجھے سمجھ سکے۔ تنہائی میرے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہی میرا مقدر ہے لیکن اب میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔''

عنبرین احمد بیداری کے ایک پراجیکٹ ''آنگن'' کی کوآرڈینیٹر ہیں۔ انہوں نے اپنی تنظیم کے تحت جہاں عورتوں کو یہ احساس دلایا اور انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ ایک عورت دوسری عورت سے طاقت حاصل کرتی ہے، وہاں انہوں نے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے خلاف مہم چلائی۔ ایک مطالعے کے مطابق ہمارے 15 فیصد بچے جنسی زیادتی کا شکار ہیں اور اس طرح کے تکلیف دہ واقعات ان کے ذہنوں پر طویل المدت داغ چھوڑ دیتے ہیں۔ ''آنگن'' کا مطمح نظر ان مسائل کا تدارک اور علاج ہے۔ تدارک اسی صورت میں ممکن ہے کہ مختلف معاشرتی اور اقتصادی پس منظر رکھنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں میں شعور پیدا کیا جائے۔ متاثرہ افراد کا بیداری کے تحت تربیت یافتہ عملے کی نگرانی میں علاج کیا جا رہا ہے۔

عنبرین کا کہنا ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے عموماً مردوں کی ہوس کا شکار بنتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مردوں کے خلاف ہو جائیں۔ ان سے نفرت کرنے لگیں۔ بیداری کے فلسفے میں یہ نہیں ہے۔ ہمیں مردوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ یہی ہماری طاقت کا سرچشمہ ہے۔

MashalBooks.org

عنبرین نے ''پاکستانی بچوں کی صحت میں جنسی تفریق'' پر تحقیق کی۔ نیز ملک کے پسماندہ شمالی علاقوں میں جنسی تفریق اور تقریر کے بارے میں شعور پیدا کرنے کے لئے منعقد کی گئی ورکشاپس میں حصہ لیا۔

میڈیا کے ذریعے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے بارے میں شعور پیدا کرنے کے لئے ''ہمارا جسم اور ہم'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ چلایا۔ بچوں کو اس موضوع پر سمجھانے کے لئے حقائق اور دلائل پیش کئے کہ اس قسم کے واقعات صرف ان پڑھ اور نچلے طبقے میں ہی نہیں ہوتے، اس کا ارتکاب اونچے طبقے کے پڑھے لکھے لوگ بھی کرتے ہیں یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف اجنبی افراد ایسا ہی کرتے ہیں، بلکہ وہ ان میں سے بھی ہو سکتے ہیں جن پر ہمارے والدین بھروسہ رکھتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے افراد ذہنی مریض ہی نہیں ہوتے، بلکہ یہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہی جو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے واقعات لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ''آنگن'' کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب بیداری کے ارکان نے ایک دوسرے کو اپنے تجربات بتائے۔ ایک دوسرے سے طاقت حاصل کی تو یہ مفروضہ ٹوٹا کہ ناخوشگوار واقعات کے بارے میں خاموشی بہتر ہے۔

# ذکیہ سرور

''جہاں تک ممکن ہو سکا مجھے محبت اور علم بلندی کی جانب لے گئے لیکن ہمدردی مجھے ہمیشہ واپس زمین پر لے آئی۔ میرے دل میں درد کی آہ و زاری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ قحط زدہ بچے، ظالموں کے تشدد کا نشانہ بننے والے۔ بیٹوں کے لئے قابلِ نفرت بوجھ بننے والے ضعیف لوگ۔ انسانی زندگی کو دراصل جیسا ہونا چاہئے غربت، تنہائی اور دکھوں کی دنیا اس کا مذاق اڑاتی ہے۔''

برٹرینڈرسل کی تحریر کا ایک اقتباس۔ یہ سطور سپیلٹ (Spelt) کے نیوز لیٹر میں شائع ہوئیں جس کی ایڈیٹر ذکیہ سرور ہیں۔ ذکیہ سرور ماہر تعلیم اور انگریزی کی زبان داں ہیں۔ ہمارے ملک میں انگریزی پر آباد کاروں کی زبان ہونے کا الزام ہے۔ لیکن کمیونی کیشن کی اس دنیا میں انگریزی زبان رابطے کی مقبول ترین زبان ہے۔ سوسائٹی فار پاکستان انگلش لینگوئج ٹیچرز، (سپلیٹ) جو ایک غیر سرکاری تنظیم ہے، ذکیہ سرور اس کی بنیادی رکن ہی نہیں بلکہ وہ اس کی سربراہ اور سرگرم کارکن بھی ہیں۔ سپلیٹ کا بنیادی مقصد انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کو تعلیمی استعداد بڑھانے کے لئے تربیت دینا ہے۔

سپلیٹ کا قیام 1984ء میں عمل میں آیا۔ کراچی کے علاوہ اس کی شاخیں لاہور، اسلام آباد، ملتان، پشاور، ایبٹ آباد اور حیدر آباد میں قائم ہیں۔ اس تنظیم کا نیٹ ورک کچھ اس طرح ہے کہ ہفتے کے ایک مخصوص دن اور مخصوص وقت پر مذکورہ بالا تمام شہروں میں بیک وقت میٹنگز ہوتی ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران انگلش کے بے شمار اساتذہ اس ادارے کے وسیلے سے زبان پڑھانے کے جدید رجحانات، نئی تکنیکس کے ضمن میں تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

ذکیہ سرور کا تعلق الہ آباد کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ ذکیہ نے میٹرک وہیں کیا۔ سنہ 54ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا تو لاہور میں قیام کیا۔ ذکیہ نے لاہور کالج فار ویمن سے گریجویشن اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔

وہ اپنے طالب علمی کے زمانے کو یاد کرتی ہیں ''جب میں گورنمنٹ کالج میں تھی تو ایک تنظیم چلڈرن ایڈ سوسائٹی کے ارکان کے ساتھ مل کر فلاحی کاموں کے لئے کچی آبادیوں میں جاتی تھی۔ میری کلاس فیلولڑکیاں جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں میرا مذاق اڑاتی تھیں۔''

ذکیہ کئی برس تک سرسید گرلز کالج کراچی کے ساتھ منسلک رہیں۔ اس کالج میں سوشل ورک کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذکیہ پڑھانے سے فارغ ہو کر اپنی طالبات کو ایسے کاموں میں مشغول کرتیں کہ وہ کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ کار آمد چیزیں تیار کر سکیں جنہیں کالج کے میلے میں فروخت کیا جاتا۔ اس طرح طالبات کو اپنی محنت کا صلہ مل جاتا۔ اس کے ساتھ انہیں اپنے وقت اور اپنے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے ہنر کی تربیت بھی مل جاتی۔

اس وقت جب ملک کے عام حالات تعلیمی اداروں کو بھی متاثر کر رہے تھے تو ذکیہ نے تدریسی پیشے کو ترک کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایک پرخلوص مشورے نے انہیں روکا اور وہ کالج سے ایک سال کی چھٹی لے کر انگریزی زبان کی تدریس کے ضمن میں تربیت کے لئے سڈنی چلی گئیں۔ سنہ 83ء میں واپس آئیں تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے پہلی بار انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں 30 اساتذہ نے شرکت کی۔

شرکا کی نصف تعداد کا تعلق سندھ سے تھا۔ جب یہ سب ایک سال بعد دوسری کانفرنس کے سلسلے میں ملے تو ''سپلیٹ'' بن گئی۔

ذکیہ کہتی ہیں ''عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر گرائمر آ جائے تو زبان آ جاتی ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ زبان دانی طرز زندگی سے متاثر ہوتی ہے۔''

اس کی ایک مثال برٹرینڈ رسل کی تحریر کا حوالہ ہے۔ زبان سیکھنے میں عالمی مسائل

MashalBooks.org

میں دلچسپی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ذکیہ سرور نے گزشتہ دنوں ہیوسٹن (امریکہ) میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ انہوں نے بتایا کہ نوعمر طلبا اور طالبات مستقبل کے ادیب اور کہانی کار بن سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اس کی ترغیب دی جائے۔ مثلاً طلبا کو کوئی پینٹنگ یا مجسمہ سامنے رکھ کر کہانی لکھنے کو کہا جائے تو وہ اس تصویر یا مجسمے کو اپنی راہ کے نقشے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔''

اسی طرح طلبا انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے سکول سے میلوں دور کسی سکول میں بیٹھے ہوئے طلبا سے گفتگو کرتے ہیں۔

ذکیہ سرور اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ پاکستان کے اساتذہ کو دنیا بھر میں زبان سیکھنے کے جدید طریقوں سے آگاہ ہونا چاہئے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ملک میں موجودہ محدود ذرائع کی بنا پر جدید طریقوں کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھالا جائے۔

سپلیٹ کے ٹیم ورک اور ارکان کے باہمی رابطے کی بنا پر ملک کے کئی سکولوں میں انگریزی زبان سکھانے کا طریقہ یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ کریڈٹ بھی سپلیٹ کو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے کام کو کسی مخصوص طبقے تک محدود نہیں رکھا۔ اس طرح جدید طریقہ تعلیم سے ملک کے مختلف شہروں کے سرکاری اور غیر سرکاری طلبا و طالبات مستفید ہو رہے ہیں۔

ذکیہ کہتی ہیں ''استاد خواتین کے لئے سپلیٹ ایک ایسا پلیٹ فارم بن گیا ہے جو انہیں مضبوط کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس فورم سے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پروفیشنل سطح پر بات کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے بعض گھروں میں مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ عورت کی بہتر تربیت، اس کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رابطہ، تبادلہ خیال اور سب سے بڑی بات یہ کہ عورت کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے جسے اپنی بالادستی کے زعم میں جینے والا مرد اپنے لئے خطرہ خیال کرتا ہے۔

ذکیہ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات اور گھر داری وغیرہ کے باوجود جب کبھی موقع ملتا ہے اعلیٰ تعلیم کے لئے چلی جاتی ہیں۔ چند برس پہلے انہوں نے لیڈز (برطانیہ) سے ایم ایڈ کیا۔

ذکیہ کے تین بچے ہیں شوہر ڈاکٹر ہیں۔ انہیں اپنی تمام تر سرگرمیوں کے لئے اپنے شوہر کا بھرپور تعاون حاصل کر رہا ہے۔

MashalBooks.org

# سیما ملک

لیاری کے ایک سٹریٹ سکول کی ٹیچر کو ٹی۔ آر۔ سی میں ایک ورکشاپ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس نے اسے غیر ضروری خیال کیا۔ سوچا جو کچھ مجھے آتا ہے وہ گلی کے بچوں کو پڑھانے کے لئے کافی ہے۔ میں بھلا ورکشاپ میں جا کر کیا کروں گی۔ پھر خدا جانے وہ مجھ سے کیا پوچھیں۔ شاید ٹیسٹ ہو۔ اگر میں فیل ہو گئی تو بہت بے عزت ہو گی۔ شاگرد میرے بارے میں کیا سوچیں گے لیکن خیر سوچتی ہوں شاید چلی جاؤں۔

ورکشاپ کے بعد

وہ کہہ رہی تھی ''بڑا مزہ آیا۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ بچوں کو اس طرح بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ کھیل ہی کھیل میں اتنا کچھ جان لیا۔''

سیما ملک ٹیچرز ریورس سینٹر (TRC) کی ڈائریکٹر ہیں۔ شعبہ تعلیم سیما کے خون میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان کی نانی ایک ممتاز ماہر تعلیم تھیں۔ انہوں نے اس وقت سکول کھولا جب عورتوں کے لئے گھروں سے باہر نکل کر کام کرنا مشکل تھا۔ سیما ملک نے کنیئرڈ کالج لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد بی۔ایڈ کیا اور اپنے کیریئر کے پہلے دس برس پڑھانے میں صرف کئے۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک کمپیوٹر ٹریننگ منیجر کی حیثیت سے کام کیا لیکن اس شعبے کو اپنے لئے محدود پایا۔ جب کہ ٹی۔ آر۔ سی سے وابستگی کو بہت بار آور اور تعلیمی شعبے کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے ایک مفید وسیلہ خیال کرتی ہیں۔

یہ محض اتفاق ہے کہ ٹی۔آر۔سی کا جب 1986ء میں قیام عمل میں آیا، اس وقت تک ہمارے ہاں کے غیر جمہوری سیاسی حالات نقطہ عروج کو پہنچ چکے تھے۔ اس سے پہلے برسوں میں جہاں آزادی اظہار سلب ہو چکی تھی وہاں نصابی کتابوں میں بھی غیر ترقی پسندانہ

تبدیلیاں کی جا چکی تھیں جس کی وجہ سے بچوں خصوصاً عام سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی معلومات محدود ہوتی گئیں۔ بھٹو کے دور حکومت میں تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کر دیا گیا۔ لیکن اس اقدام سے ملک کی شرح خواندگی میں اضافے کی بجائے دیگر بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں اور معیار تعلیم گرنے لگا۔ پھر یہ طے کیا گیا کہ ملک میں تعلیم عام کرنے کے لئے پرائیویٹ اور غیر رسمی سکول کھولے جائیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جہاں کسی ٹیچر پر یہ پابندی نہیں کہ اس کے پاس ٹیچنگ کی باقاعدہ ڈگری یا کم از کم ڈپلومہ ہو۔ ٹی۔ آر۔ سی اس کمی کو کسی نہ کسی طور پر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ایک تنظیم کے تحت ملک کے تعلیمی ڈھانچے میں اگر انقلاب لانا ممکن نہیں تو کم از کم اس میں مثبت تبدیلی کا امکان ضرور ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اپوا نے صحت اور تعلیم کے شعبے میں بے شمار خدمات سرانجام دیں۔ بے شک ٹی۔ آر۔ سی کے ساتھ اپوا کا براہ راست تعلق نہیں ہے لیکن ان کی طرف سے اپوا ہیڈ کوارٹرز کی عمارت کا ایک حصہ ٹی۔ آر۔ سی کے قیام کے لئے مفت عطا کر دیا گیا ہے۔

سیما ملک کہتی ہیں ''یہ ادارہ اساتذہ کی تربیت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد معیار تعلیم کو بہتر بنانا ہے۔ ہمارا حلقہ کار پورا ملک ہے لیکن زیادہ تر کام کراچی اور اندرون سندھ میں ہی ہو رہا ہے۔''

اس ادارے کو چلانے کے بارے میں سیما کا کہنا ہے کہ ''ہمیں حکومت کی جانب سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ صحت کے شعبے میں تعلیم کی بہ نسبت زیادہ فنڈنگ ہو جاتی ہے۔ اگر ہم باثروت طبقے کے افراد سے فنڈنگ کے لئے کہتے ہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کسی بچے کا وظیفہ لگا دیں گے حالانکہ اگر اساتذہ کو تربیت دی جائے تو سینکڑوں بچے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

سیما ملک کا کہنا ہے کہ انہوں نے طویل جدوجہد کے بعد بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے معقول رقم حاصل کر لی ہے جسے بینک میں ڈال دیا گیا ہے اور اس کے منافع سے ادارے کو چلاتے ہیں۔

ادارے کے اغراض و مقاصد کے بارے میں سیما کا کہنا ہے کہ ہمارا اولین مقصد نچلے درجے کے سکولوں اور مہنگے معیاری سکولوں کے درمیانی فرق کو کم کرنا ہے۔ اس کے

MashalBooks.org

علاوہ سکولوں اور مہنگے معیاری سکولوں کے درمیانی فرق کو کم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ عام سکولوں اور ان کے اساتذہ کی ضروریات کے بارے میں جاننا اور ممکن امداد فراہم کرنا ہے۔ ہمارے ادارے کے تحت سال بھر میں 60-70 ورکشاپس منعقد کی جاتی ہیں۔ اس کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ ٹیچرز میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ پڑھانے کے لئے خود سیکھنا بھی ضروری ہے۔

ایک سوال کے جواب میں سیما ملک نے کہا کہ یہ قطعی طور پر ایک سیاسی ادارہ ہے۔ لیکن ملکی سیاست کی بہتری کے لئے تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے۔ معاشرے میں تعلیم یافتہ لوگ ہوں گے تو سیاست کا انداز خود بخود بدلے گا۔ ہم اس لحاظ سے بھی اساتذہ کی تربیت کرتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی سوچ تبدیل کر سکیں۔

''ہم دوسری غیر سرکاری تنظیموں کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے عورت فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک ورکشاپ ہوئی کہ نصابی کتابوں میں عورت اور مرد کے کردار کے بارے میں جو تعصب اور فرق پایا جاتا ہے اسے ختم ہونا چاہئے۔ یا یہ کہ ماحول کے بارے میں بچوں میں شعور پیدا کیا جائے۔ ایسے تمام امور کے لئے ہم دیگر اداروں کا ساتھ دیتے ہیں اور جو ہمارے اختیار میں ہو وہ اقدامات کرتے ہیں۔ ٹی۔ آر۔ سی کی طرف سے اساتذہ کی معلومات کے لئے ''رہنمائے اساتذہ'' اور ماحول کے بارے میں ''گلستان'' نکالا جاتا ہے۔ یہ دونوں سہ ماہی رسالے مختلف سکولوں کو فراہم کئے جاتے ہیں۔

سیما ملک کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں جب کبھی فروغ تعلیم کا جوش بڑھتا ہے تو حکومت بیک وقت 20 سے 30 ہزار اساتذہ کی تربیت کی بات کرتی ہے جو کہ ممکن ہے۔ ہر کام کے لئے کچھ وقت اور وسائل درکار ہیں۔ البتہ ٹی۔آر۔سی آغا خان فاؤنڈیشن کے تعاون سے ایک منصوبے پر کام کر رہا ہے جس کے تحت آئندہ پانچ سال کے دوران ابتدائے بچپن کی تعلیم پر گورنمنٹ سکولوں میں تربیتی کام کریں گے۔ نیز یونیسیف کے ساتھ ایک پراجیکٹ تیار کیا ہے جس کے تحت ہم 40 ماسٹر ٹرینرز تیار کریں گے جو پورے سندھ میں 3600 اساتذہ کو تربیت دیں گے۔

سیما ملک غیر شادی شدہ ہیں اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں۔ نانی کے ساتھ

رہتی ہیں۔ وہ ان کی آئیڈیل ہیں۔لیکن نانی اور سیما دو مختلف زمانے ہیں۔ نانی کی طرف سے پابندی ہوتی ہے کہ وہ مغرب کے بعد گھر سے باہر نہ نکلیں۔ سیما نانی کے ساتھ اس پر بحث کرتی ہیں۔ وہ عورتوں کے حقوق اور عورتوں کی آزادی کی بات کرتی ہیں تو نانی کہتی ہیں ''میری جان۔ یہ عورتوں کی آزادی ہی تو ہے جو تم ہمارے ساتھ اسی طرح بحث کرتی ہو۔''

MashalBooks.org

# سفینہ صدیقی

1991ء میں اقوام متحدہ کے پروگرام برائے ماحولیات (UNEP) میں جس کی داغ بیل 1972ء میں سٹاک ہوم میں انسانی ماحول پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں ڈالی گئی، شامل ہونے والی دنیا بھر کی 218 کہانیوں میں سے ایک پاکستان کی سفینہ صدیقی کی روداد بھی تھیں۔ ان پر ہر سال گلوبل 500 ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔ سنہ 91ء میں 21 ممالک کے 27 افراد اور تنظیموں کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا۔

مختلف ممالک کے انعام پانے والوں میں سینیگال کے کاشتکار بھی تھے جنہوں نے زراعت اور کاشتکاری میں کامیاب تجربات کئے تھے جنہیں دیگر کاشتکاروں نے بھی اپنایا۔ نیوزی لینڈ کے ایک میاں بیوی جوڑے نے حیاتیاتی تنوع برقرار رکھنے کے لئے چڑیوں کا ہسپتال قائم کیا۔ اردن کی ملکہ نور نے اپنے ملک میں ماحول کے بارے میں شعور پیدا کرنے اور ماحولیاتی تحفظ کے لئے عملی اقدامات کئے۔

پاکستان کی سفینہ صدیقی نے اپنے محلے میں بنیادی شہری سہولتوں کے حصول اور ان کی بہتری کے لئے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو متحرک کیا۔ محلے کے مردوں اور عورتوں کو خود مدد کے لئے آمادہ کیا۔ انہیں یہ احساس دلایا کہ جب تک کمیونٹی کے افراد باعمل نہ ہوں گے علاقے کے مسائل کا حل ممکن نہیں۔ پھر ان کی سربراہی کی۔ ان کا تعاون حاصل کیا۔ جس علاقے میں ہر طرف غلاظت پھیلی ہوئی تھی اور گٹر ابل رہے تھے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے، اب وہ صاف ستھرا اور سرسبز رہائشی کا علاقہ بن چکا ہے۔

یہ بھی ہوا کہ گھریلو استعمال کے پانی میں انسانی فضلے کی آلودگی کے خلاف عدالت عظمیٰ سے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بنیاد پر انصاف حاصل کیا۔

سفینہ صدیقی کا تعلق پنجاب کے زراعت پیشہ گھرانے سے ہے۔ شوہر صحافی تھے

MashalBooks.org

جن کا 1979ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے تین بچے ہیں۔ شوہر کی زندگی میں وہ پی ای سی ایچ ایس میں رہائش پذیر تھیں۔ جب بوجوہ انہیں کراچی ایڈمنسٹریٹو سوسائٹی میں منتقل ہونا پڑا تو ملحقہ کچی بستیوں میں رہنے والوں کی بنیادی سہولتوں سے محرومیوں نے انہیں متحرک کیا کہ ایسا علاقہ جس میں مزدور پیشہ اور دیگر چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگ رہتے ہیں ان کا بھی حق ہے کہ شہری سہولتوں سے مستفید ہوں لیکن وہ جب گندے نالوں اور اس نوعیت کے مسائل سے لے کر متعلقہ اداروں کے پاس گئیں تو انہوں نے حسب معمول یہ کہہ ٹال دیا کہ آپ کے علاقے کا کوئی مسئلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ سفینہ اس پر بد دل نہیں ہوئیں، بلکہ انہوں نے اپنے مسائل کا ثبوت تصاویر کی صورت میں پیش کیا۔

سفینہ کہتی ہیں ''اس سے قبل یہ تک معلوم نہ تھا کہ شہری سہولتیں دینے کا ذمہ دار کون ہے۔ دفتری معاملات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ درخواستیں تک لکھنی نہیں آتی تھیں۔''
لیکن ارادہ مضبوط تھا۔ مستقل مزاجی اور مسلسل جدوجہد نے سفینہ کو گلوبل 500 ایوارڈ کا مستحق ٹھہرایا۔

وہ اپنے علاقے میں ترقیاتی کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ''1988ء کے بعد ساڑھے تین سال میں علاقے کی 80 فیصد سڑکیں بنوائیں۔ برساتی نالے کی پختہ دیواریں بنوائیں۔ پانچ پارک قائم کیے۔ سیوریج لائن تبدیل کروائی۔ سڑکوں اور گلیوں میں روشنی اور صفائی کے لئے کچرا گاڑی اور جمعدار کا بندوبست کروایا۔

ہمارے ہاں گھریلو عورتوں کا عام رویہ ہوتا ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ بلدیہ کا صفائی کا انتظام ناقص ہے۔ اگر ہم پرائیویٹ جمعدار کا انتظام کر لیں اور سب محلے والے چندہ جمع کر کے اسے تنخواہ دے دیا کریں تو وہ سمجھتی ہیں کہ ایسی تجویز پیش کرنے والا ہم سے پیسے لے کر اپنے گھر کی صفائی کرانا چاہتا ہے۔ لیکن سفینہ صدیقی نے تعلقات عامہ کو خوش اسلوبی سے استوار کیا اور اپنے علاقے کی عورتوں کو آمادہ کیا کہ وہ گھر سے باہر کا خیال کریں اور اسے صاف ستھرا رکھیں۔ مئی 1979ء میں سڑک کی درمیانی کچی پٹی پر 1600 پودے اور ان کے اردگرد لوہے کے جنگلے خواتین کے عطیات کی بدولت لگائے گئے۔ علاقے کے ایک شخص نے کھاد اور مٹی کا عطیہ دیا۔ 1996ء تک شجر کاری 4 ہزار فٹ سے زائد لمبائی تک پھیل گئی۔ درختوں کی تمام تر نگہداشت خواتین کے ماہانہ عطیات سے ہوتی ہے۔ صاف

ستھرے اس علاقے کی ایک سڑک پر ویمن ویلفیئر سوسائٹی کا بورڈ نظر آتا ہے جو دراصل سفینہ صدیقی کی تنظیم کراچی ایڈمنسٹریٹو ویمن ویلفیئر سوسائٹی (KAWWS) کا ایک حصہ ہے۔ اس کا مقصد خانہ دار خواتین کو کمیونٹی کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے اکٹھا اور متحرک کرنا ہے تاکہ ''کوز'' (KAWWS) کی مرکزیت ختم کر کے اس میں زیادہ سے زیادہ عام عورتوں کو شامل کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے چھ بلاک ہیں۔ ویمن ویلفیئر سوسائٹی کے تحت دو بلاکوں کی ذیلی انجمن بنائی گئی ہے تاکہ عورتیں اپنے محلے کی صفائی باہمی دلچسپی اوراجتماعی کوشش سے کریں۔

جب اس علاقے میں شجر کاری کی گئی تو سب سے مشکل کام ان پودوں کی آبیاری تھی۔ ٹینکر سے پانی خریدنا تنظیم کی استعداد سے بالاتر تھا۔ اس پر برساتی پانی سے سڑکوں پر لگائے گئے درختوں کی آبیاری کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے پائپ لائن بچھائی گئی۔ برساتی نالے کے پانی میں شامل کچرے کو چھاننے کے لئے لوہے کا جنگلا نالے میں ڈالا گیا اور مشین سے پانی کھینچنے کا انتظام کیا۔ جہاں لوہے کی پائپ لائن بچھانا ممکن نہ تھا وہاں سخت پلاسٹک کی پائپ استعمال کی گئی۔ ان تمام اخراجات کو خواتین کے عطیات سے پورا کیا گیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے کام میں بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں۔

سفینہ صدیقی کی سربراہی میں علاقے کے لوگوں میں جو شعور پیدا ہوا اس کی ایک مثال زری کے دھاگے کی مصنوعات تیار کرنے والی فیکٹری سے چھٹکارا ہے۔ سنہ 96ء کے آغاز میں ایک پلاٹ کے مالک نے زری کی فیکٹری قائم کر دی۔ آس پاس کے مکینوں نے تنظیم کی وساطت سے کمشنر کو تحریری شکایت کی۔ نتیجہ یہ نکلا کے چھ ماہ کے اندر زری بنانے والی کمپیوٹرائزڈ مشین کو کرین کے ذریعے ٹرک پر لاد کر علاقے سے باہر لے جایا گیا اور فیکٹری کی عمارت کو سیل کر دیا گیا۔

تنظیم کی ایک اور بڑی کامیابی کچی آبادیوں بلوچ کالونی اور دیگر بستیوں کو مالکانہ حقوق دلانا بھی ہے۔ سفینہ صدیقی کے ادارے کے تحت کراچی کی سوک ایجنسیوں کی ڈائریکٹری کی اشاعت ہے جس میں شہری سہولتوں کے بارے میں بجلی پانی کی فراہمی اور دیگر اداروں کے فون نمبر وغیرہ شامل ہیں۔ نیز ایڈمنسٹریٹو سوسائٹی کی گائیڈ بھی شائع کی گئی ہے۔ جس میں علاقے کے بارے میں نقشے اورضروری معلومات شامل ہیں۔

# امبر علی بھائی

تعمیراتی قوانین کی خلاف ورزیوں کے معاملات کی تعداد خطرناک حد تک بڑھنے لگی ہے۔ رہائشی علاقوں پر کثیرالمنزلہ تجارتی منصوبوں کی منظوری دی جا رہی ہے۔ شہر میں جہاں پہلے ہی پارکوں اور کھیل کے میدانوں کی کمی ہے کھلی جگہیں تیزی سے معدوم ہو رہی ہیں۔

''شہری برائے بہتر ماحول'' ایک غیر سرکاری ادارہ ہے۔ امبر علی بھائی گزشتہ چند برسوں سے اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ بنیادی طور پر امبر ایک قانون دان ہیں۔ اسی بنا پر ''شہری'' کا شعبہ قانون ان کے سپرد کیا گیا ہے۔ کراچی کے تعمیراتی منصوبوں میں بلڈرز مافیا اور متعلقہ اداروں کے گٹھ جوڑ سے شہری ڈھانچے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور عمارتوں کی اندھا دھند تعمیر سے شہری سہولتیں روز بروز قلیل اور ابتر ہو رہی ہیں، ان تمام امور کی نشاندہی امبر علی کا فرض منصبی ہے۔

امبر کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ شادی شدہ ہیں۔ شوہر نجی کاروبار کرتے ہیں۔ امبر کے تین بچے ہیں۔ انہوں نے کراچی میں ابتدائی اور گریجویشن تک تعلیم حاصل کی جبکہ برطانیہ سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ایک باشعور شہری کی طرح وہ ہمیشہ سے خواہش مند تھیں کہ ان کا شہر صاف ستھرا ہو۔ اس کا ماحول خوشگوار ہو لیکن جب وہ برطانیہ سے واپس آئیں تو ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ماحول کا فرق واضح طور پر نظر آیا اور اسے محسوس بھی کیا۔

''ہمارے گھر کے قریب کاروں کا ایک شوروم تعمیر ہو رہا تھا۔ رہائشی علاقے میں تجارتی مرکز کی تعمیر ناقابل قبول تھی۔ سوچا اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ میں نے اس

بارے میں کچھ اداروں کو خطوط لکھے۔ یہ سنہ 93ء کا ذکر ہے۔ انہی دنوں میں نے ''شہری'' کے بارے میں اخبار میں پڑھا کہ یہ تنظیم اس نوعیت کے امور کے لئے سرگرم عمل ہے۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا کہ وہ شوروم کی تعمیر رکوانے کے لئے میری مدد کریں۔ چنانچہ ہم نے شوروم کی غیر قانونی تعمیر کے خلاف عدالت سے حکم امتناعی لے لیا۔''

امبر نے جب اس ادارے کی کارکردگی اور افادیت دیکھی تو پھر وہ بھی اس گروپ میں شامل ہو گئیں۔

امبر کا کہنا ہے کہ ان کا بنیادی کام ایڈووکیسی ہے۔ وہ دعوے سے کہتی ہیں کہ غیر قانونی تجاوزات اور تعمیرات میں شہری اداروں کا ہاتھ ہوتا ہے، بلکہ یہ سب ان کی سرپرستی میں ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ''غیر قانونی'' کام کو روکنے یا اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے متعلقہ حکام سے رابطہ کے دیگر وسائل کی مدد سے خرابیوں اور تدارک کی اقدامات کے بارے میں متعلقہ اداروں، ضلعی انتظامیہ، سیاستدانوں، عام شہریوں اور عدلیہ کو باخبر کیا گیا تو اس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں غیر قانونی عمارتیں سر بمہر کر دی گئیں اور کئی ایسی عمارتیں منہدم کر دی گئیں۔ امبر نے اس تمام عمل میں بہت فعال کردار ادا کیا۔

لیکن بقول امبر کے یہ بھی ہوتا ہے کہ بلڈنگ اتھارٹیز اس نوعیت کی شکایات پر کوئی کارروائی نہیں کرتیں۔ اس صورت میں مجبوراً عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ شہریوں کی شکایات پر عدالتی کارروائی رضاکارانہ طور پر کی جاتی ہے۔

گزشتہ دنوں ''شہری برائے بہتر ماحول'' کے ایک ممتاز رکن پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ عام خیال یہی تھا کہ یہ ''شہری'' کے ارکان کے سچ بولنے کی سزا ہے۔ ایک ایسا شہر جہاں لینڈ مافیا اور بلڈرز مافیا زمینوں کی تجارت اور عمارتوں کی تعمیر کی سوداگری میں ملوث ہو وہاں مٹھی بھر شہریوں کے احتجاجی اقدامات کو روکنے کے لئے ان کے پاس طاقت بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک جدوجہد ہے اور ہر ایسے کام میں خدشات بھی مول لینے پڑتے ہیں۔ لیکن امبر کو اس بات پر بھی فخر ہے کہ ان کی محنت کے صلے میں تعمیراتی ادارے کے کنٹرولر اور دیگر 35 افسران کو معطل کیا گیا تھا۔

اس ضمن میں ان کی ایک اور نمایاں کامیابی بلڈنگ کنٹرول کی کارکردگی کو جانچنے کے لئے کمیٹی کی تشکیل ہے۔ اس کمیٹی میں ''شہری'' کے تین نمائندے بھی شامل ہیں۔ اب

کسی بھی شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ مقرر کردہ فیس ادا کر کے ضروری معلومات حاصل کرے۔ اگر اس پر کسی شخص کی تسلی نہ ہو تو وہ ''شہری'' کے قانونی امداد کے شعبے سے رابطہ کر سکتا ہے۔

امبر کا کہنا ہے کہ کراچی میں ماحولیاتی مسائل بہت شدت اختیار کر گئے ہیں۔ اس بارے میں شہری کے علاوہ اور بھی ادارے اور غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ان تمام کاموں میں کمیونٹی یعنی مقامی آبادی کے افراد شریک نہ ہو کامیابی مشکل ہے۔

امبر کہتی ہیں'' ہم ماحولیاتی مسائل کے حل کے لئے قانون کی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگوں کو احساس دلانا چاہتے ہیں کہ اپنے شہر کی آلودگی سے بچائیں۔ اگر وہ ایک صاف ستھرا ماحول چاہتے ہیں تو اس کے لئے خود پیش قدمی کرنی ہو گی لیکن وہ خاموش رہتے ہیں، اس لئے رہائشی علاقے میں تجارتی مراکز تعمیر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک پلاٹ پر دو منزلہ عمارت کی اجازت ہوتی ہے لیکن اس کی بجائے وہاں کثیر المنزلہ فلیٹ بن جاتے ہیں جس کے نتیجے میں اس پلاٹ کے قرب و جوار میں رہنے والوں کو بجلی پانی اور سیوریج کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر شہری ایسی خلاف ورزیوں کے خلاف آواز اٹھائیں تو بلڈرز کتنے ہی طاقور کیوں نہ ہوں، عوامی دباؤ کے آگے انہیں جھکنا پڑے گا۔ اسی طرح شہری کچرے اور ٹھوس اخراج کا مسئلہ ہے۔ کچرے کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری خود شہری نہیں اٹھانا چاہتے۔ وہ اپنے گھر کا کچرا چار دیواری سے باہر پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ خودغرضی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ ہمارے شہر اسی طرح آلودہ ہو رہے ہیں۔ صنعت کار اپنے کارخانے کا سیال مادہ ندی نالوں اور سمندر میں پھینک دیتے ہیں، انہیں اپنے مفاد سے مطلب ہے۔ اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کے اس اقدام سے کتنی جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔''

# شمیم ہلالی

''وہ ایک کھلنڈری لڑکی تھی۔ دن بھر شرارتیں کرتی۔ پیڑوں پر چڑھتی، ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔ دادی اس کی حرکتوں سے بہت نالاں تھی۔ ماں اسے روکتی ٹوکتی مگر وہ باز نہ آتی۔ البتہ باپ کو اپنی لاڈلی بیٹی کے چلبلے پن پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک روز باپ نے بیٹی سے کہا کہ چلو میں تمہیں سائیکل چلانا سکھاؤں۔ اس پر گھر کی دونوں عورتوں نے شدید مخالفت کی ''اب یہ لڑکوں کی طرح سائیکل چلائے گی؟'' ان کے نزدیک لڑکی کا سائیکل چلانا بہت ہی نامناسب تھا۔ لیکن لڑکی نے باپ کی طرف سے حوصلہ افزائی کی بنا پر سائیکل چلانا سیکھ لی۔ ایک روز ماں گر گئی۔ انہیں شدید چوٹ آئی تو لڑکی نے ماں کو سائیکل پر بٹھایا اور ہسپتال لے گئی جس سے بروقت طبی امداد میسر آ گئی اور ماں کی جان بچ گئی۔ پھر دادی کو احساس ہوا کہ لڑکی کا سائیکل چلانا کس قدر مفید ثابت ہوا۔''

بظاہر یہ ایک سیدھی سادھی کہانی، لیکن تین نسلوں پر محیط ہے۔ یہ وقت کے ساتھ خیالات کی فرسودگی کو توڑنے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کہانی ہے۔

یہ کہانی شمیم ہلالی نے لکھی تھی۔ ان چار کہانیوں میں سے ایک جنہیں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ تعلیمِ بالغاں کے پروگرام کے تحت۔

ضلع اوکاڑہ کے گاؤں 31-2۔ایل سے ایک عورت نے لکھا کہ اس نے سیما ور تھور سے بچاؤ کے طریقے سیکھ لئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ بھیڑوں اور بکریوں کو کون سی غذا دیں کہ ان کی اون عمدہ ہو جاتی ہے۔

راجی والا ارائیں ضلع قصور کی ایک عورت کو مرغیوں کی دیکھ بھال اور چوہوں سے نجات کا طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔

چک رسالہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک عورت کو نیم کے پتوں کو بطور کیڑے مار دوا استعمال کرنے کا طریقہ آ گیا ہے۔

شمیم ہلالی کی زیرِ نگرانی ریڈیو پروگرام ''مشعل'' سے مستفید ہونے والا دیہی عورتوں کی باتیں۔

شمیم ہلالی کو اگر کسی ٹیلی ویژن سیریل میں اونچے طبقے کی فیشن ایبل عورت کا کردار ادا کرتے دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ انہیں اس کی کردار نگاری کے لئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی ہوگی۔ ان کا انداز، گیٹ اپ، بودو باش بتاتی ہے کہ ان کا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جس کے بچے شعور سنبھالتے ہیں تو وسائل ان کی ضروریات سے اور آسائشیں خواہشات سے زیادہ ہوتی ہیں۔

شمیم ہلالی بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ والدہ کا تعلق مہاراشٹر سے تھا جب کہ والد جنوبی ہندوستان کے شہر مدارس (چینائی) کے تھے جو تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے۔ شمیم نے کنیئرڈ کالج لاہور سے بی۔اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ لاہور کے ایک ترقی پسند ڈرامہ گروپ کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو سائیکل پر کالج جاتی تھی اور کبھی کبھار دکان سے اپنی سائیکل خود مرمت کرواتی تھی۔ یہ شمیم تھیں۔ جب وہ ڈراموں میں آنے لگیں تو ہمدردوں نے اعتراض کیا کہ لڑکی سٹیج پر آتی ہے۔ لیکن روشن خیال والدین نے اس پر توجہ نہیں دی۔ شادی کے بعد شوہر کے ہمراہ جو ایک سفارت کار تھے، سویڈن چلی گئیں۔ 91ء میں واپس آئیں تو ہمارے ہاں کا سماجی اور سیاسی منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ شمیم ہلالی کو اپنی زندگی میں عورت کی کمتری کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن پاکستان کی عام عورت غیر منصفانہ سلوک کی شکار ہو چکی تھی۔ اسی دوران وہ عورت فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔

شمیم ہلالی کا آلہ کار کمیونی کیشن ہے۔ انہوں نے اس کی ترسیل کے کئی وسیلے اور ذرائع اختیار کئے۔ سٹیج، ٹیلی ویژن، طالبات کی تدریس اور پھر عام عورت کے ساتھ براہِ راست رابطہ۔ نوے کی دہائی کے آغاز سے وہ عورت کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والی تنظیموں کی سرگرم کارکن ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر شخص کی زندگی کے کئی رنگ، کئی روپ ہوتے ہیں۔ شمیم نے بہت سے اور مختلف نوعیت کے کام کرنے کے بعد اپنے ادارے کی

جانب سے عام دیہی عورتوں کے شعور کو بڑھانے کے لئے جو اقدامات کئے وہ ان کے لئے بہت تسکین بخش ہیں۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً کورسز بھی کئے۔ وہ جب ایم اے کی طالبہ تھیں اور لاہور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شریک ہوتی تھیں تو اس دوران ٹیلی ویژن پروڈکشن کی تربیت لی اور کوپن ہیگن میں آبادی اور تعلیم کی ورکشاپ میں شریک ہوئیں۔ ریڈیو پر ہفتہ وار پروگرام، جس میں دیہی عورتوں کو زرعی ٹیکنالوجی کے بارے میں معلومات کے علاوہ خواتین کی خودمختاری، آبادی، تعلیم، صحت اور ماحول جیسے معاملات پر بھی گفتگو ہوئی، شمیم ہلالی اس کی پروڈیوسر ڈائریکٹر تھیں۔ عورتوں کے ایشوز پر کہانیوں اور گیتوں کے آڈیو کیسٹ بھی تیار کئے۔

ایک طرف وہ لاہور کے مضافات میں مناواں کے مقام پر کسان عورتوں کی کانفرنس میں شریک ہوئیں اور دوسری طرف انہوں نے نصابی کتابوں میں پیش کئے جانے والے غلط تاثر کے خلاف اقدامات بھی کئے۔ انہوں نے اس ضمن میں تحقیق کی اور رپورٹ اور سفارشات کیں جنہیں متعلقہ حکام تک پہنچایا گیا۔

شمیم ہلالی کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ عورت کے کام کی پہچان کی جائے۔ دیہی علاقوں میں کام کے دوران یہ ظاہر ہوا کہ مرغ بانی اور مویشیوں کی دیکھ بھال کا 89 فیصد کام عورتوں کی ذمہ داری ہے۔ ملک کی کل آبادی میں سے 40 ملین عورتیں دیہاتوں میں رہتی ہیں جن میں سے 25 ملین زراعت کے مختلف شعبوں میں مصروف عمل ہیں۔ لیکن قومی سطح پر ان کی کارکردگی کو قابل ذکر خیال نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ پالیسی سازوں تک یہ حقائق پہنچائے جائیں۔

شمیم ہلالی کے سماجی کاموں میں دیہاتوں میں قائم کئے گئے سماعی مرکزوں نے دیہی عورتوں میں مثبت تبدیلی لانے میں اہم کام کیا۔ ان مراکز میں عورتیں اپنے گھریلو کام کاج نمٹا کر ریڈیو پروگرام سننے آتی تھیں۔ وہ پروگرام سننے کے بعد ایک دوسری سے تبادلہ خیالات کرتیں۔ اس طرح ایک سوشل گروپ بن گیا اور وہ اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتیں۔ یہاں تک کہ ان میں 8 مارچ خواتین کے عالمی دن پر ثقافتی پروگرام منعقد کرنے کا شعور بھی آ گیا۔

گجرات کے گاؤں لاسوری کلاں میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں نصف

معاوضہ ملتا تھا لیکن عورت فاؤنڈیشن کی جانب سے جب شعور کی بیداری کا منصوبہ چلایا گیا تو عورتوں کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ اپنی خاموشی توڑیں۔ شکایت کریں اور مزاحمت کریں۔ چنانچہ ان میں اتنا حوصلہ پیدا ہوا کہ انہوں نے آجر سے مردوں کے برابر معاوضے کا مطالبہ کیا اور اسے تسلیم کرا لیا گیا۔

عورت کا کردار تبدیل ہوگا۔

شمیم ہلالی ٹیلی ویژن پروڈیوسر کے سامنے بیٹھی تھیں۔ انہیں ایک کردار سونپا جانے والا تھا۔ شمیم ہلالی کا مطالبہ تھا کہ کہانی تبدیل کرو۔ اس میں عورت کا کردار تبدیل کرو، کہانی کا انجام تبدیل کرو۔

دیہی عورتوں کی زندگی کی کہانی کو تبدیل کرنے کی ترغیب دینے والی شمیم ہلالی نے عورتوں کے بارے میں میڈیا کے رجحان کو للکارا تھا۔

MashalBooks.org

# جویریہ خالد

''اپنی نگاہ'' عصرِ حاضر میں پاکستانی خواتین کی شعری اور نثری تخلیقات پر مشتمل ایک کتاب کا نام ہے جس کی تالیف کے بعد جویریہ نے لکھا کہ یہ نا آسودہ عورت کی آوازیں ہیں جو گھٹن اور جبر کی فضا سے باہر نکل کر اپنی ذات کے بھرپور اظہار کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آج کل کی عورت کو عورتوں کی صدیوں پرانی تحریک کو اب آگے بڑھانا ہے۔

''اثر'' کے زیر اہتمام مارچ 1994ء میں ویمنز سٹڈیز کانفرنس میں بہت سے ملکی اور عالمی موضوعات پر ورکشاپس منعقد کی گئیں تو ان میں ایک ورکشاپ میں لکھنے والی خواتین کا اجتماع تھا جنہوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں اور پھر ان کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا گیا۔ اس کا حاصل بقول جویریہ کے یہ تھا کہ:

'' لکھنے والی عورتوں کو بھی معاشرے کی دیگر عورتوں کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ مرد نقاد عورت کی تحریر کے بجائے ان کی ذات کو نشانہ بنتا ہے۔ عورت جب مرد کی طرف سے عائد کی گئی حدود سے تجاوز کر کے کچھ لکھتی ہے تو اسے ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔

جویریہ خالد نے ہوش سنبھالا تو ایک روشن خیال اور ترقی پسند صحافی والد کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ ابا کی دنیا ایک وسیع دنیا تھی۔ وہاں مذہبی عصبیت، تنگ نظری اور تنگ دلی نہیں تھی لیکن سکول کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں زبردستی نمازیں پڑھائی جاتی تھیں کہ یہ وہ دور تھا جب مارشل لاء کے حکمران نفاذِ اسلام کے بہانے اپنی سیاسی دکان چمکا رہے تھے۔

جب ادیب خواتین عورتوں کی تنہائی کے المیہ، اکیلی عورت، بے نام عورت، مذہبی جنون، امتیازی قوانین، مردوں کی جاگیردارانہ ذہنیت اور منافقانہ رویے، روایت شکن

عورت، ناتمام ذمہ داریاں، عورت اور مرد کے رشتے کی بے اساسی کیفیات جیسے موضوعات پر لکھ رہی تھیں تو وہ عملی طور پر مارشل لا کے دوران ہونے والی زیادتیوں کے خلاف عورتوں کی تحریک میں بھی شامل تھیں۔

انہی دنوں جویریہ کے سکول کا سپورٹس روم بند کر دیا گیا۔ حکام کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو کھیلنا کودنا نہیں چاہئے۔ یہ غیر شرعی حرکت ہے۔ جویریہ چھٹی کلاس میں پڑھنے والی ایک نوعمر لڑکی تھی۔ سکول کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ چادر اوڑھا کرو۔

جویریہ نے سنہ 82ء میں میٹرک پاس کیا۔ بی۔اے کرنے کے بعد جب ایم۔اے کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں طلبا کی رجعت پسند یونین کا دور دورہ تھا۔ جویریہ نے ان کے مخالف ترقی پسند گروپ کا ساتھ دیا۔ اس دوران انہیں مختلف افراد اور اجتماعی طور پر دباؤ کا سامنا رہا لیکن انہوں نے اپنی روش قائم رکھی۔ پاکستان کی سب سے پرانی پنجاب یونیورسٹی مخلوط تعلیم کے لحاظ سے ایک آزاد اور کشادہ ماحول کے لئے پہچانی جاتی تھی جہاں لڑکے لڑکیاں علیم اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ایک دوسرے کے مدمقابل آتے تھے۔ یونیورسٹی کا یہ ماحول مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے اور پرکھنے کا ایک خوبصورت موقع فراہم کرتا یہ وسیع النظری کے لئے ایک مکتب کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جویریہ کی نسل کی طالبات جب یونیورسٹی گئیں تو وہاں لڑکوں سے بات کرنا ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔

جویریہ کی عملی زندگی اور فکر کا خمیر اسی قسم کے حالات سے اٹھا اور وہ ''ویف'' میں شرکت کے بعد سنہ 91ء میں ''اثر'' کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔

جویریہ کو ادب سے خصوصی شغف ہے۔ اس لئے گزشتہ برسوں کے دوران انہوں نے جہاں ''اپنی نگاہ'' کی تالیف میں معاونت کی تھی وہاں عورتوں کے بارے میں مردوں کی تحریروں کا تحقیقی مطالعہ بھی کیا جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ مرد ناول نگار کی ہیروئن کبھی بڑی نہیں ہوتی۔ اس کی کرداری کیفیت میں وہی کتابی اخلاقیات اور المیہ نظر آتا ہے۔ جس نے راشد الخیری کے ہاں جنم لیا تھا۔

ایک اور رائے یہ بھی سامنے آئے کہ ہمارا آج کا ادیب عورت کے ساتھ ہمدردی دکھاتا ہے۔ اسے مجبور قرار دے کر اس پر رحم کھاتا ہے لیکن اس تمام عمل کے دوران اپنی

MashalBooks.org

نظروں سے لفظوں سے برہنہ کر کے لذت بھی اٹھاتا ہے۔ اسے دھتکار کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے التفات سے خود کو بڑا درجہ دیتا ہے۔

جویریہ کا سب سے بڑا کام ''اثر'' کی انگریزی کی تحریروں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا ہے۔ وہ اپنے ادارے کی جانب سے ''جدوجہد جاری ہے'' یعنی بیجنگ کانفرنس سے پہلے عورتوں کی ورکشاپس اور دیگر سرگرمیوں کے لئے بھرپورطور پر سرگرم عمل رہیں۔ ''اثر'' میں شرکت سے پہلے انہوں نے بطور صحافی بھی کچھ عرصے کے لئے کام کیا۔ عورتوں سے متعلق مختلف موضوعات پر ان کے مضامین ملکی اور غیر ملکی جریدوں اوراخبارات میں شائع رہتے ہیں۔

جویریہ اپنی عائلی زندگی میں توازن اور افہام وتفہیم پر یقین رکھتی ہیں۔ ان کی چند سال قبل شادی ہوئی۔ شوہران دنوں ایک وسط ایشیائی ملک میں ملازم تھے۔ لاہور میں اپنے کام کی وجہ سے مصروف تھیں۔ شوہر نے ان کے کام کی اہمیت کو سمجھا اور وہ مخل نہیں ہوئے۔ اب وہ آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ جویریہ امید سے تھیں تو وہ بھی آسٹریلیا چلی گئیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد انہیں پھر کام کی یاد ستانے لگی تو پاکستان لوٹ آئیں۔ بچہ دو محبت کرنے والے میاں بیوی کے درمیان بٹ گیا۔ جویریہ کو احساس ہوا کہ بچے کی پرورش کے لئے باپ کی موجودگی بھی اہم ہے لہٰذا وہ آسٹریلیا لوٹ گئیں۔ پھر بیاہتا بیٹی ماں باپ کے گھر آ کر رہنے لگی۔ جویریہ نے شکایت کی ''چاہے کتنے بڑے ہو جائیں والدین کے گھر بچوں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔'' جویریہ اپنی اتنی ساری سرگرمیوں کے بغیر کیسے گزر اوقات کرے گی؟ اس سوال کا جواب وقت دے گا۔

# نور ناز آغا

حیدرآباد پریس کلب میں ''پابستہ زرعی مزدوروں کی حالت او نجی جیلیں'' کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا جا رہا تھا۔ کلب کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین کی زیادہ تر تعداد وڈیروں کی جیلوں سے رہا ہونے والے ہاریوں کی تھی، جن میں بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے۔

یہ سیمینار پاکستان انسانی حقوق کمیشن کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ رہا ہونے والی عورتیں کہہ رہی تھیں کہ وڈیروں کے موالی رات کے وقت مرد کسانوں کو زبردستی کام پر لگا دیتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں عورتوں پر جنسی تشدد کرتے تھے۔ بھری محفل میں عورتوں نے اقرار کیا کہ ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں کہ ان کا باپ کون ہے۔

ایک بوڑھے ناتواں شخص کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے اس اجلاس کا علم ہوا تو وہ کسی طرح کھیتوں سے بھاگ نکلا۔ اس کے پاس کرائے کے پیسے نہ تھے۔ وہ پیدل چلتا، گرتا پڑتا کسی ٹرک کے پیچھے سوار ہو کر کسی طور وہاں پہنچ گیا۔

صوبہ سندھ کے مختلف علاقوں میں واقع وڈیروں اور جاگیرداروں کی نجی جیلوں سے ہاریوں کو رہائی دلانے میں، اپنے ادارے کے دیگر ارکان کے ساتھ، نور ناز آغا کی کوششیں بھی شامل تھیں۔

اس اجلاس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد پاس کی گئی تھی کہ رہا ہونے والے ہاریوں کی بحالی کے لئے مثبت اقدامات کئے جائیں اور بونڈڈ لیبر (ختم کرنے کے لئے) ایکٹ 1992ء پر فوری عمل درآمد کیا جائے۔

MashalBooks.org

وقت گزرتا رہا۔ نور ناز آغا اور ان کے ساتھیوں کو ہاریوں کے لئے کارِ خیر سر انجام دینے کے نتیجے میں دھمکیاں موصول ہوتی رہیں مگر نور نے ہمت نہیں ہاری۔

کچھ عرصہ بعد جب ہاریوں کے ساتھ کئے گئے وعدے وفا نہ ہو سکے اور سرکاری طور پر ان کی بحالی اور آبادکاری کے لئے خاطر خواہ اقدامات نہ کئے گئے تو نور کے ہاتھ میں ایک بار پھر مائیک تھا۔ وہ کراچی پریس کلب کے سامنے جمع ہونے والے ہاری مرد اور عورتوں سے مخاطب تھیں۔ انہیں دلاسا دے رہی تھیں کہ ان کی امداد کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

نور ناز آغا حیدر آباد (سندھ) میں پیدا ہوئیں۔ بچپن وہیں گزرا اور سکول سے لے کر کالج تک کی تمام تعلیم بھی حیدر آباد میں حاصل کی۔

والد کا نجی کاروبار اور والدہ حکیم تھیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے کہ نور ناز نے وکیل بننے کا ارادہ کیا اور سنہ 83ء میں سندھ لا کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اسکے بعد سنہ 85ء میں ایم اے اکنامکس کیا۔

نور ناز کے وکیل بننے کی ان کے کچھ رشتے داروں نے شدید مخالفت کی۔ شاید اس لئے کہ اگر اس میں قانونی شعور پیدا ہو گیا تو اپنے حقوق کے بارے میں بھی جان لے گی۔ نور کو کچھ دھمکیاں بھی دی گئیں۔

وکالت اب نور ناز آغا کا وسیلہ روزگار ہے۔ وہ 1990ء تک حیدر آباد میں پریکٹس کرنے کے بعد کراچی شفٹ ہو گئیں۔ انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ منسلک ہونے سے قبل نور ناز ایک سرگرم سیاسی کارکن رہیں اور ملک میں مارشل لا ختم کروانے اور جمہوریت کی بحالی کے لئے انہوں نے سیاسی تحریکوں کا ساتھ دیا اور اس ضمن میں مذاکروں اور جلسوں کا اہتمام کیا۔ بعض دیگر غیر سرکاری تنظیموں کی رکنیت کے علاوہ نور ناز انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ اس کے قیام کی ابتدا سے ہی منسلک ہیں اور گزشتہ کچھ عرصے سے سندھ کی وائس چیئر پرسن ہیں۔

نور ناز کا کہنا ہے کہ ہم جب انسانی حقوق کے حوالے سے کوئی اقدام کرتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی حد تک سیاسی جنگ بن جاتی ہے۔ درحقیقت ایسے کام سیاسی پارٹیوں کو کرنے چاہئیں کیونکہ وہ لوگ عوام کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اقتدار میں آ کر ہر سیاست

دان کی ترجیحات مختلف ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے منشور سے انحراف کو مجبوری کا نام دے کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ ہر بڑی سیاسی پارٹی نے چاہے وہ مسلم لیگ ہو یا پیپلز پارٹی، اسمبلیوں میں خواتین کی نشستوں کی بحالی کے دعوے بھی کئے اور وعدے بھی، لیکن یہ کام ابھی تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

نور ناز آغا کے مضامین جو زیادہ تر انسانی حقوق اور عورتوں کے خلاف وضع کئے گئے امتیازی قوانین سے متعلق ہوتے ہیں، سندھی اور اردو اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے بعض مضامین غیر ملکی اخبارات میں بھی چھپ چکے ہیں۔ وہ قانون اور انسانی حقوق کے ضمن میں ملکی اور غیر ملکی کانفرنسوں میں شرکت کر چکی ہیں۔

نورناز نے شادی نہیں کی۔ کہتی ہیں کہ ''میں گریجویشن تک لڑکوں جیسے کپڑے پہنتی تھی۔ جب کوئی کہتا کہ شادی کب کرو گی تو میں کہتی کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ شاید یہ بچپن کی کوئی گروہ ہو۔ ابھی تک اسی فیصلے پر قائم ہوں لیکن مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتیں۔''

MashalBooks.org

# پامیلا روڈرکس

پاکستان کی کل آبادی کا 50 فیصد عورتوں پر مشتمل ہے۔ شہری عورتوں کی کثیر تعداد بیکار بیٹھی ہے۔ ان عورتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے تو وہ ملکی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں احساس دلایا جائے، ترغیب دی جائے اور ان کی تربیت کی جائے کہ اگر وہ اپنی تعلیم، سوجھ بوجھ اور پسند کے مطابق کوئی نجی کاروبار کرنا چاہتی ہیں تو انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا ہوگا اور انہیں اپنے کام میں کامیابی کے لئے کون سے اقدام کرنے ہوں گے۔

یہ خیال پامیلا روڈرکس کے ذہن میں آیا تھا جس نے ''نیو'' (NEW) کی عملی صورت اختیار کرلی۔ ''نیٹ ورک فار انٹرپرائزنگ ویمن'' ایک غیر سرکاری تنظیم ہے جو گزشتہ 16-17 سال سے سرگرم عمل ہے۔

پامیلا پیشے کے اعتبار سے آرکیٹیکٹ ہیں۔ سنہ 86ء میں منیلا (فلپائن) سے آرکیٹیکچر میں ڈگری لی اور پاکستان واپس آکر دیگر آرکیٹیکٹس کے ساتھ کام کیا۔ پامیلا نے آرکیٹکچر کے علاوہ انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس بھی کیا ہوا ہے۔ اس طرح وہ اپنی تخلیق کردہ عمارتوں کی اندرونی آرائش بھی کرتی ہیں۔ یہ سب ان کا وسیلہ روزگار ہے۔ پامیلا ایک سرگرمِ عمل اور فعال شخصیت کی مالک ہیں۔ شہر میں کوئی انسانی حقوق کا مسئلہ ہو، خواتین کے حقوق کے بارے میں کوئی مذاکرہ منعقد ہو رہا ہو، کوئی سیاسی سرگرمی ہو، امن پسندوں کا اجتماع ہو، پامیلا ہمیشہ کسی نہ کسی صف میں بیٹھی نظر آئیں گی۔ بلکہ لوگ انہیں آرکیٹیکٹ حیثیت سے تو کم ہی جانتے ہوں گے۔ البتہ وہ ایک ایکٹوسٹ کے طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں۔

پامیلا کے والد مکینیکل انجینئر تھے۔ ان کی اپنی فیکٹری تھی۔ پامیلا کو یاد ہے کہ وہ چھٹیوں کے دوران ابا کی فیکٹری جاتیں۔ وہاں ان کی ڈیوٹی فیکٹری میں تیار کئے گئے اوزاروں اور پرزوں وغیرہ کی گنتی تھی جس کے معاوضے میں روزانہ انہیں ایک روپیہ ملتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو ابا مسقط چلے گئے۔ وہاں ان کا اپنا کاروبار تھا۔ چھٹیوں میں ابا کے پاس جاتے تو ابا کا ہاتھ بٹانے کے لئے دفتر کی صفائی سے لے کر ڈرائیور تک سب کچھ کرتے۔ پامیلا کی تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ والدین کی طرف سے نہ صرف عمل پسندی کی تربیت ملی بلکہ شخصی آزادی کا احساس بھی ملا کہ انسان اپنے کام ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اعتبار بھی ملا جو خوداعتمادی پیدا کرے، جو نامساعد حالت کو سازگار بنانے کی صلاحیت عطا کرے۔

تعلیم حاصل کر کے وطن واپسی پر پامیلا نے ایسوسی ایشن آف بزنس پروفیشنل اینڈ ایگری کلچر ویمن میں شمولیت اختیار کی۔ انہی دنوں ''نیو'' کی بنیاد رکھی۔ پامیلا اور ان کی ساتھیوں نے ''نیو'' کی تشکیل کے لئے احمد آباد (ہندوستان) کے ایک ادرے ICECD کو بطور ماڈل سامنے رکھا اور ان کے طریقہ کار سے استفادہ کیا۔ اس میں کاروبار میں دلچسپی لینے والی اور ایسا ارادہ رکھنے والی خواتین کی رہنمائی اور مشاورت میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ جس نوعیت کا کاروبار کرنا چاہتی ہیں یا جس پراڈکٹ کو مارکیٹ میں لے جانا چاہتی ہیں، ایسا کرنے سے پہلے یہ سروے کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کی مانگ کتنی ہے اور وہ شہر یا ملک کے کس حصے میں بہتر طور پر مارکیٹ کی جا سکتی ہے۔ یعنی ''چھوٹے کاروبار کو کیسے چلایا جائے'' بعد ازاں 1989ء سے 94ء تک اس تنظیم کے تحت کاروبار کے انتظام، منصوبہ بندی، نچلی سطح اور درمیانی آمدنی سے تعلق رکھنے والی خواتین کی تربیت، اپنی مصنوعات کو ملکی منڈی میں فروخت کرنے کی تکنیک، برآمدات کے بارے میں تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں شہر کی پسماندہ بستیوں اور متوسط طبقے کی عورتوں نے آمدنی پیدا کرنے کے لئے چھوٹے پیمانے کے کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور عملی قدم اٹھائے۔ اس ضمن میں ''نیو'' کی وساطت سے ان عورتوں کی رسائی ویمنز بنک اور دیگر مالیاتی اداروں تک ہوئی جہاں سے انہیں حسب ضرورت قرضے فراہم کئے گئے۔ یہ بھی ہوا کہ کچھ عرصہ بعد مذکورہ خواتین کی کارکردگی کی جانچ اور مستقبل میں ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کی تیار کی ہوئی گھریلو مصنوعات کی نمائشوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔

MashalBooks.org

پامیلا نے سینٹ جوزف سکول سے میٹرک اور سینٹ پیٹرکس کالج سے انٹر کیا۔ وہ اسے اپنی خوش بختی خیال کرتی ہیں کہ انہیں لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے خیال میں عملی زندگی میں قدم قدم پر مردوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مخلوط تعلیم کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے خود اعتمادی آ جاتی ہے۔

پامیلا غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کے نزدیک شادی ایک ثانوی معاملہ ہے۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ بقول ان کے اس بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ بہرحال یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ جب کبھی انہیں کوئی مناسب شخص مل گیا، شادی کر لیں گی۔

پامیلا کا کہنا ہے کہ ''نیو'' کی سرگرمیوں کے دوران بہت سی خصوصاً نچلے اور متوسط طبقے کی خواتین سے ان کا واسطہ پڑا۔ انہیں تربیت دی اور انہیں یہ اعتماد دیا کہ وہ زندگی میں خود فیصلہ کرنا سیکھیں۔ ایک طرح سے یہ پہلا سیاسی سبق ہے۔ جمہوری انداز کی سوچ میں اپنانے کی تلقین ہے۔

پامیلا نے نجی کاروبار کے بارے میں مختلف موضوعات پر مقالے لکھے جنہیں کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بیرون ملک بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ وہ بہرحال ایک مصروف آرکیٹیکٹ ہیں۔ مختلف اداروں کی عمارتوں کو ڈیزائن کیا جن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا سکول، کراچی سٹاک ایکس چینج بلڈنگ، نواب شاہ میں طلبا کے لئے بورڈنگ ہاؤس اور دیگر بہت سی عمارتیں شامل ہیں۔ 1988ء اور 1990ء میں آرکیٹیکچر پر انعامات حاصل کیے جب کہ 1991ء میں ترقیاتی میدان میں بہترین کارکردگی پر یو ایس ایڈ کا انعام حاصل کیا۔

پامیلا چند نجی مجبوریوں کی وجہ سے پچھلے دنوں ''نیو'' پر زیادہ توجہ نہیں دے سکیں۔ وہ موقع ملتے ہی اسے دوبارہ فعال بنانا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ''نیو'' کے زیر اہتمام ایک مشاورتی دفتر قائم کیا جو خواتین کی رہنمائی اور مدد کر سکے۔

# رفیہ خانم ملک

یہ خاتون کوئٹہ میں منعقد ہونے والی چودھویں نیشنل ڈینٹل کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں: ''بنیادی صحت کی سہولتوں کی فراہمی تمام لوگوں کو، چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، صحت مند ہوں یا نہ ہوں، ہوش مند ہوں یا نہ، سب تک پہنچنی چاہئے۔ اگر کوئی شخص صحت کی خدمات تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تو یہ خدمات اس تک پہنچائی جائیں۔'' وہ جب ساڑھے دس سال کی تھیں اور قصور کے ایک سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھیں تو دادا کے حکم کے مطابق انہیں شٹل کا برقعہ پہنا دیا گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر اس نے پڑھائی جاری رکھی تو میں اسے مار کر خود جیل چلا جاؤں گا۔ مگر ان کی والدہ، جو خود ان پڑھ تھیں، انہوں نے ایک نہ سنی اور کہا کہ کچھ بھی ہو اپنی بیٹی کو ضرور پڑھاؤں گی۔ اس لڑکی کا نام رفیعہ خانم تھا۔

رفیعہ جب سکول جاتی تھیں تو ایک برقعہ پوش نوکرانی ان کے ہمراہ ہوتی تھی۔ نیز دو دکاندار اس ڈیوٹی پر مامور تھے کہ وہ نگرانی کریں کہ رفیعہ وہاں سے کب گزرتی ہے۔ سسرالیوں نے رفیعہ کی ماں سے اس جرم کی پاداش میں تعلقات ختم کر لئے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو پڑھاتی ہیں۔ رفیعہ کا تعلق شیخ خاندان سے ہے۔ ان کے دادا کاروبار کرتے تھے جبکہ نانا مستند حکیم تھے۔

رفیعہ ملک نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی اور ڈی مونٹ مورینسی کالج آف ڈینٹسٹری لاہور سے بی ڈی ایس پاس کیا۔ سنہ 66ء میں انگلینڈ چلی گئیں اور 19 سال تک وہیں مقیم رہیں۔ انگلینڈ میں اپنے قیام کے آغاز میں ہیومو ہسپتال لنکاسٹر، رائل ڈینٹل ہاسپٹل آف سینٹ جارج لندن اور ایڈن بروکس ہوسٹل کیمبرج میں کام کیا۔ اسی

دوران ان کا رجحان کمیونٹی ڈینٹسٹری کی طرف ہوا تو رفیعہ نے اس ضمن میں مطالعہ اور تحقیق کے بعد کچھ منصوبوں پر کام کیا۔ رائل کالج آف سرجنز لندن کے زیر اہتمام پاکستان میں ''دانتوں کی صحت کے بارے میں ماؤں کا رویہ'' کے پراجیکٹ پر تحقیق کی۔ اسی دوران انہیں لیور ڈینٹل ہائیجین سروس کے لئے پاکستان آنے کی دعوت دی گئی۔

ہمارے ہاں بنیادی صحت کی خدمات کا ذکر تو ہوتا رہتا تھا اور اس پر کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے لیکن دانتوں کی صحت پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ رفیعہ ملک کا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ پہلی ڈینٹل سرجن ہیں جنہوں نے عوامی سطح پر دانتوں کی صحت کے بارے میں وسیع شعور پیدا کرنے کے لئے انتھک محنت کی۔

اس کام کے آغاز میں یونی لیور کے تعاون سے پانچ سو نجی اور سرکاری سکولوں کے بچوں کے دانتوں کا مفت معائنہ کیا گیا۔ بچوں کو دانتوں کی صحت کے بارے میں اور دانتوں کی بیماریوں سے محفوظ رہنے کے بارے میں تعلیم دی گئی۔ اس پراجیکٹ سے تقریباً پانچ لاکھ طلباء و طالبات مستفید ہوئے۔

عوامی صحت کے فلاحی کاموں میں ضلع ملیر کے کاٹھور کے علاقے میں آٹھ گوٹھوں کے چالیس ہزار باشندوں کو موبائل میڈیکل اور ڈینٹل یونٹ کے ذریعے صحت کی خدمات فراہم کی گئیں۔

رفیعہ ملک انگلینڈ میں ڈینٹل پریکٹیشنر کے طور پر رجسٹر ہیں۔ وہ جب چاہیں وہاں جا کر اپنا کام شروع کر سکتی ہیں۔ لیکن ان کے خیال میں ان کا کام اپنے ملک میں ہے۔ یہاں انکی زیادہ ضرورت ہے۔ رفیعہ نے بچپن میں اپنے ددھیال کے خلاف جنگ جیت لی تھی لیکن اپنے شوہر کو قائل نہ کر سکیں۔ ان کے شوہر کا تعلق ہزارہ کے پٹھان خاندان سے ہے۔ ان کی شادی لندن میں ہوئی تھی۔ ایک بیٹی ہے جو لندن یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ رفیعہ کے شوہر کا کہنا ہے کہ ان کی یہ تمام سماجی سرگرمیاں فضول ہیں۔ رفیعہ ملک نے بہت تحمل کے ساتھ اپنے رفیق حیات کی مخالفت برداشت کی۔ نہ ہمت ہاری اور نہ اپنا کام چھوڑا۔ ان کے شوہر گزشتہ دو سال سے بیٹی کی تعلیم کے بہانے لندن میں ہیں۔ رفیعہ دو تین ماہ بعد لندن چلی جاتی ہیں۔ چند دن قیام کرتی ہیں، پھر اپنے مدار میں لوٹ آتی ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ ان کے شوہر ان سے محبت کرتے ہیں لیکن اپنی خو نہیں بدلیں گے۔

MashalBooks.org

رفیعہ ملک کو اپنے سماجی کاموں میں اور بھی بہت سی رکاوٹوں اور عدم تعاون کا ناخوشگوار تجربہ ہوا۔ بہت سے ڈینٹل ڈاکٹر ان کے مفت علاج کو اپنے کاروبار کے لئے نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ اسی طرح سرکاری حکام اور دانتوں کی مصنوعات تیار کرنے والوں کی طرف سے بھی تعاون نہ ملنے کی شکایت رہی۔

رفیعہ کی عملی سرگرمیوں میں امین وادی سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن کا قیام بھی شامل ہے۔ اس کے زیر اہتمام نہ صرف صحت کی خدمات مفت فراہم کی جاتی ہیں بلکہ انہیں اس ضمن میں تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ رفیعہ ملک عوام تک رسائی کے لئے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو بروئے کار لاتی ہیں۔ انہوں نے بہت سے کتابچے تحریر کئے۔ اخبارات میں مقالے لکھے۔ ریڈیو پروگرام کئے۔ انہوں نے کولمبو کے عوام کے لئے ایک وڈیو تیار کی جو انہیں بطورِ تحفہ دے دی گئی۔

رفیعہ ملک نے ایک پیشہ ور ڈینٹل سرجن کی حیثیت سے خاطر خواہ عہدے حاصل کئے۔ بقائی میڈیکل کالج کی پرنسپل متعین ہوئیں۔ بلکہ بقائی کالج کے قیام میں رفیعہ ملک کی محنت بھی شامل تھی لیکن ان کی پیشہ وارانہ تسکین نہیں ہوئی۔ ان کا عزم ہے اور مستقبل کا منصوبہ ہے کہ جھونپڑیوں میں کلینک کھولے جائیں جن میں بنیادی ڈینٹل اور میڈیکل سہولتیں ہوں۔ دیہی اور ایسے شہری علاقوں میں جہاں غیر تربیت یافتہ دندان ساز کام کرتے ہیں وہاں موبائل سروس کے ذریعے خدمات پہنچائی جائیں اور عوام میں دانتوں کی صحت کا شعور پیدا کیا جائے۔

MashalBooks.org

# جہاں آراحئی

اپوا کی بیٹی.......... جہاں آراء۔

ان کے نزدیک سماجی سرگرمیوں اور دوسروں کی بھلائی کے لئے بلامعاوضہ خدمات کو اپنی نظر میں اچھا بنانے کا عمل ہے۔ اس سے ذہنی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دل کو اطمینان ملتا ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہے۔

جہاں آراء اپنے ماضی پر نظر ڈالتی ہیں تو زندگی میں بہت کم مشکلات اور رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین، مالی آسائشیں، ذمہ داریاں کم، وقت زیادہ۔ جہاں آرا کو یاد ہے کہ شادی کے بعد وہ سلہٹ میں رہیں جہاں ان کے شوہر چائے کے باغات کے منیجر تھے۔ نو آبادیات کے اثرات ابھی باقی تھے۔ شوہر سے جب یہ خواہش کی کہ یہاں کارکنوں اور مزدوروں کے بچے بے مقصد گھومتے رہتے ہیں۔ ''میں کیوں نہ انہیں گھر پر پڑھا دیا کروں تو انہوں نے انکار کر دیا، کیوں کہ یہ بھی انگریز کا بنایا ہوا قانون تھا کہ منیجر کی بیوی ملازموں اور کارکنوں کے ساتھ رابطہ نہیں رکھے گی۔

بچوں کو پڑھانے کا خیال ان کی تربیت کا حصہ تھا۔

جہاں آرا نے ہوش سنبھالا تو اپنی ماں کو سماجی سرگرمیوں میں مصروف پایا۔ ان کی والدہ اپوا کے بانیوں میں سے ہیں۔ جہاں آرا کو یاد ہے ان کی والدہ جب کبھی اپوا کی میٹنگ میں جاتیں تو وہ بھی ساتھ چلی جاتیں اور اس دوران باہر لان میں کھیلتی رہتی تھیں اور اب اپوا کے ساتھ 20-25 برس کی عملی وابستگی کے بعد وہ ریڈیو پاکستان سے اپوا میگزین کرتی ہیں۔ اپوا میں شرکت کے بعد شروع میں اپوا یوتھ کلب کی سرگرم رکن رہیں۔ تنظیم کے تحت قائم کئے گئے انڈسٹریل ہومز کی انچارج رہیں۔ اپوا نیشنل ہیڈ کوارٹرز میں اہم ذمہ

MashalBooks.org

داریاں سنبھالنے کے بعد اب چیئر پرسن برائے بین الاقوامی امور ہیں۔

جہاں آرا کی والدہ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی،اے بی ٹی کیا تھا اور والد ڈاکٹر تھے۔ والدہ نے باقاعدہ طور پر پڑھانے کا پیشہ اختیار نہیں کیا البتہ اپنی تنظیم کے تحت تعلیمی اور سماجی منصوبوں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اسی طرح والد نے اپنے پیشے کو معاشرتی بھلائی کے لئے وقف کرتے ہوئے ٹی بی ایسوسی ایشن بنائی جس کے تحت قائم کئے جانے والے چھ مراکز میں مفت علاج ہوتا ہے۔ جہاں آرا کے والد کی خدمات کے اعتراف میں پرانے حاجی کیمپ میں قائم کیا جانے والا ڈاکٹر رفیق الدین ہسپتال روزانہ تقریباً ڈیڑھ سو مریضوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس طرح گزشتہ کئی برسوں کے دوران اس سے لاتعداد ٹی بی کے مریض شفا پا چکے ہیں۔

اپنے والدین کی فلاحی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر جہاں آرا اپوا اور ٹی بی ایسوسی ایشن میں مکمل طور پر مصروف ہیں۔ انہیں یاد ہے کہ ایسوسی ایشن قائم کرنے کے بعد شہر بھر کی فیکٹریوں اور کارخانوں سے رابطہ قائم کیا گیا تاکہ ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی سکریننگ کر سکیں۔ اس وقت یہ پیکج دیا گیا تھا کہ وہ کارکنوں کے تمام ٹیسٹ سو روپے سے کم خرچ میں کروا دیں گے۔ گو کہ اس وقت صنعت کاروں نے کوئی حوصلہ افزاء ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا، لیکن ایسوسی ایشن کی ثابت قدمی اور دباؤ کے تحت مضر صحت ماحول میں کام کرنے والے بے شمار مزدوروں کا علاج کیا گیا۔ اس ادارے کا نصب العین یہ ہے کہ وہ کراچی کو سنہ 2000ء تک ٹی بی سے آزاد علاقہ بنا دیں گے۔

ادارے کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے جہاں آرا کہتی ہیں کہ عام طور پر اگر مرض کی تشخیص اوائل میں ہو جائے تو آٹھ نو ماہ میں مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس کے تحت دواؤں کا ایک بینک کھولا گیا ہے جس میں عطیے میں حاصل کی گئی دوائیں جمع کی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں مریضوں کو مفت دی جاتی ہیں۔ اسی طرح مچھیروں کی بستی ''ریڑھی ولیج'' میں بھی ایک ٹی بی کلینک کھولا گیا ہے۔

جہاں آرا اپوا کے بارے میں دفاعی رویہ اپناتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ غلط ہے کہ اپوا صرف بیگمات کی تنظیم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ خواتین جنہیں ذاتی زندگی میں مالی مشکلات درپیش نہ ہوں تو وہ دوسروں کی بھلائی کے کاموں کے لئے وقت نکال سکتی ہیں۔

MashalBooks.org

جہاں آرا حیئ کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو تعلیم انٹر تک تھی۔ بی اے بعد میں پاس کیا۔ جہاں آرا کی شخصیت کا ایک پہلو بزنس بھی ہے۔ انہوں نے کئی کمرشلز میں ماڈلنگ کی۔ پھر وہ ایک معروف ٹیلی ویژن اداکارہ ہیں۔ کئی ڈراموں اور سیریز میں کام کر چکی ہیں۔ انہیں اپنی ان تمام بیرونی مصروفیات کے لئے شوہر کا تعاون حاصل ہے۔ البتہ وہ ایک روایتی شوہر ہیں، ان مردوں کی طرح جو چاہتے ہیں کہ جب وہ شام کو گھر لوٹیں تو بیوی گھر پر ہو۔ اس طرح گھریلو زندگی میں توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آج کی عورت دوگنا کام کرتی ہے لیکن اگر وہ یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ یہ سب کر لے تو پھر دوسرے کے رویے میں ازخود لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ مضبوط ہوں تو دوسرا بھی سمجھ جاتا ہے۔ کہ یہ کام ضرور ہو گا اس لئے اعتراض کرنا بے سود ہے۔

جہاں آرا کو اپوا کی جانب سے بے شمار قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور ورکشاپس میں شرکت کا موقع ملا۔ وہ بیجنگ فالو اپ میں اپوا کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بیرون ملک سفر کے دوران انہیں اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے ہاں کی عورت کے بارے میں بیرون ملک بہت سے غلط تاثرات ہیں۔ لوگ ہمیں بہت تنگ نظر، جاہل، بنیاد پرست اور پسماندہ خیال کرتے ہیں۔ جہاں آرا کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنے ملک اور ہم وطنوں کی مثبت تصویر پیش کریں۔

# سیمیں کمال

کراچی میں انسانی حقوق کمیشن کے دفتر میں ایک اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اس میں یہ طے کیا جانا تھا کہ صوبہ سندھ میں عورتوں کے مسائل کے بارے میں تحقیقی منصوبے کا آغاز کیا جائے جس کا مقصد یہ معلومات حاصل کرنا تھا کہ عورتیں کن حالات میں رہتی ہیں۔ ان کا تہذیبی پس منظر کیا ہے۔ انہیں کس نوعیت کی مشکلات درپیش ہیں اور وہ اپنی ذمہ داریاں کس طرح نبھاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے لائبریریوں اور تحقیقی اداروں کی مدد حقائق حاصل کرنا تھے۔ طے یہ ہوا کہ ''راستہ'' سے رابطہ کیا جائے۔

یہیں سیمیں کمال کا کام ہے............ ترقیاتی کاموں اور تحقیق کے لئے ''راستہ دکھانا۔ کسی بھی معاشرتی، معاشی، انسانی حقوق، عورتوں کے حقوق، صحت تعلیم، آبادی اور دیگر ایسے مسائل کے حل کے لئے اقدامات مقصود ہوں تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ مسائل کیا ہیں۔ ان کے پس پشت کیا عوامل ہیں۔ مسائل کی شدت کا کیا درجہ ہے۔ ان تمام اعداد و شمار کو یکجا کرنا ایک سائنسی عمل ہے۔ سیمیں کمال کی سربراہی میں ''راستہ'' ایک نجی ترقیاتی مشاورت کا ادارہ ہے۔ اس کے بنیادی اغراض و مقاصد میں ترقیاتی کاموں کے لئے تحقیق، تربیت، کمیونٹی کی ترقی اور اداروں کے قیام کے لئے پروگرام اور سرگرمیوں کی مشاورت شامل ہے۔ عورتوں کی ترقی اور ان کی عملی شعبے میں شرکت کی حوصلہ افزائی ''راستہ'' کی ترجیحات میں شامل ہے۔

سیمیں کمال کے والد کا تعلق جبل پور ہندوستان سے تھا۔ نانا طویل عرصہ قبل برما میں آباد ہو گئے تھے۔ والدہ کی پرورش کلکتہ میں ہوئی۔ سیمیں کراچی سے اے لیول کرنے کے بعد 19 سال کی عمر میں کیمبرج چلی گئیں۔ انہوں نے 1981ء میں جغرافیہ، معاشرتی

علوم، معاشیات کے مضامین کے ساتھ کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) سے بی اے کیا اور وہیں سے 1983ء میں جغرافیہ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔

سیمیں شادی شدہ ہیں ان کے شوہر سائنس دان ہیں۔ ان کے تین بچے ہیں۔ سیمیں ایک باعمل خاتون ہیں۔ وہ اپنے کام، گھریلو ذمہ داریاں، ماں کے کردار اور معاشرتی تقاضوں کے مابین توازن رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔ وہ اس کا اطلاق اپنے پیشے میں اس طرح کرتی ہیں کہ کارکن عورتوں کے اگر بچے چھوٹے ہیں، ان پر کچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں، مثلاً بوڑھے والدین کی دیکھ بھال وغیرہ تو وہ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں یہ ترغیب دیتی ہیں کہ دفتر کا کام گھر پر لے جائیں۔

پائیدار ملکی ترقی، پس ماندہ علاقوں میں معاشی ترقی اور عورتوں کی ترقی سے سیمیں کو خصوصی دلچسپی ہے۔ وہ اس ضمن میں ملک اور بیرون ملک کی بے شمار ورکشاپس اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکی ہیں۔ بیجنگ کانفرنس کے موقع پر وزارت خواتین برائے ترقی حکومت پاکستان کی طرف سے تیار کی گئی قومی رپورٹ میں عورتیں اور اقتصادی ڈھانچے اور پالیسی کے باب میں سیمیں کمال کی اہم کارکردگی شامل تھی۔

ترقیاتی کاموں میں دلچسپی ایک فطری رجحان ہوسکتا ہے۔ لیکن سیمیں کو جغرافیہ میں ایم اے کرنے کے بعد اور بی اے تک معاشرتی علوم میں عبور حاصل کرنے کے بعد کچھ ایسے مواقع میسر آئے جن سے ان کی فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثلاً فارغ التحصیل ہونے کے بعد امریکہ میں عورتوں کے قانونی حقوق کے سلسلے میں مطالعاتی سفر سالز برگ میں این جی اوز اور جمہوریت پر سیمینار میں شرکت۔ اس دوران تحریک ہوئی اور وہ ترغیبی لمحہ میسر آیا کہ اپنے ملک کے حوالے سے ترقیاتی کاموں کے فروغ کے لئے تحقیقی اور عملی اقدامات کا راستہ اختیار کیا جائے اور ان کاموں میں وسعت پیدا کرنے کے لئے لڑکے لڑکیوں کو تربیت دی جائے۔ جس سے انہیں روزگار ملے گا اور ترقیاتی منصوبے ہنر مند افراد کے تعاون سے اپنے مراحل طے کرتے رہیں گے۔

اس کام کے لئے ہر طرح کی معلومات جمع کرنے کے علاوہ ایسے مواد کی ضرورت پیش آئی جس کی مدد سے ترقیاتی کاموں میں دلچسپی لینے والوں کو باقاعدہ تربیت دی جا سکے۔ اس مقصد کے لئے سیمیں کمال نے پراجیکٹ کی تشکیل، انتظام اور اطلاق کی تیاری کے

MashalBooks.org

بارے میں انگلش اور اردو میں کتابیں لکھیں۔ وہ تقریباً 80 تحقیقی، تربیتی اور تجزیاتی رپورٹس کی اور 400 مقالات کی مصنفہ ہیں۔سیمیں بہت سی قومی اور بین الاقوامی تنظیموں کی رکن ہیں۔ ان کے ادارے کی ملک بھر میں پانچ شاخیں ہیں جو دفتری اور بیرونی فرائض سرانجام دیتے ہوئے بنیادی سطح پر کمیونٹی کے ارکان، غیر سرکاری تنظیموں اور سرکاری محکموں کے درمیان رابطہ قائم کرتے ہیں۔

سیمیں کمال نے گزشتہ ڈیڑھ عشرے کے دوران بہت سارے ترقیاتی منصوبوں پر کام کیا جن میں سے چند قابل ذکر یہ منصوبے ہیں: عالمی بنک کے تعاون سے سندھ کے دیہی علاقے میں پانی کی فراہمی، صفائی اور صحت کا منصوبہ اوورسیز ڈیویلپمنٹ ایڈمنسٹریشن (ODA) برٹش کونسل کے تعاون سے سندھ میں لڑکوں کی تعلیم، لیاری میں کم تنخواہ والے ایسے گھروں کا سروے جن کی سربراہ عورتیں ہیں۔ بلوچستان اور سرحد میں روایتی اور مروجہ قوانین کے عورتوں پر اثرات وغیرہ۔

سیمیں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے کام کے آغاز میں پانچ سال کے عرصے کے لئے جو ہدف رکھا تھا وہ دو سال میں وہاں تک پہنچ گئیں۔سیمیں مزاجاً حقیقت پسند اور عملی طرز فکر رکھتی ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

MashalBooks.org

# مہر مارکر

شرکت گاہ نے سنہ 75ء میں قیام کے بعد سے اب تک خواتین کے حقوق اور ترقی کے ضمن میں کئی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس ادارے کی ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے منسلک خواتین، ویمنز ایکشن فورم کے بانی ارکان میں سے ہیں۔

یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کو ایک نیا موڑ دیا جن کے ساتھ 80 کے عشرے میں نمو پانے والی تنظیمیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ کڑی سے کڑی ملتی رہی اور یہ زنجیر ملک بھر میں پھیل گئی۔

مہر مارکر کا نام بھی اسی فہرست میں آتا ہے۔

خواتین کے اس نئے گروہ پر رجعت پسندوں نے مغرب زدہ اور اونچے طبقے کی فیشن ایبل ؔخواتین کا لیبل لگایا لیکن یہی وہ خواتین ہیں جو ابراہیم حیدری کی مچھیرنوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے مسائل سنتی ہیں جو دلدلی جنگلات کی بحالی کے لئے فکرمند ہوئیں کہ اگر انہیں تحفظ نہ دیا گا تو ماہی گیری کو نقصان پہنچے گا۔ مچھلی پکڑنے اور فروخت کرنے والوں کے روزگار پر زد پڑے گی۔

مہر مارکر کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔ سکول کا زمانہ بھی وہیں گزرا۔ اس کے بعد کراچی گرائمر سکول سے اے لیول کرنے کے بعد انگلینڈ چلی گئیں۔ جب مہر کی بڑی بہن کی سربراہی میں غیر سرکاری تنظیم شرکت گاہ کا قیام عمل میں آیا تو مہر سکول میں پڑھتی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان میں پہلی جمہوری حکومت قائم ہوئی تھی۔ صدیوں سے دبی ہوئی عورت کو کچھ روشنی دکھائی دی تھی لیکن جب مہر حصول تعلیم کے بعد وطن واپس لوٹیں تو سیاسی حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ عورت کو چادر اوڑھا کر چار دیواری کے پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔

MashalBooks.org

مہر کا اپنے بچپن میں دادی کی وساطت سے اپوا کوئٹہ سے تعارف ہوا لیکن دادی کے زمانے اور مہر کے شعور بڑھنے تک کے زمانے میں بہت فرق آ گیا تھا۔ مہر نے اپنی نصابی کتابوں میں تیسری دنیا کی عورتوں کے مصائب کو پڑھا تھا لیکن ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عورتوں کی قانونی حیثیت متاثر ہوئی تھی اور اس کے خلاف عورتوں کی سرگرم تحریک نے جنم لیا تھا۔ مہر کو جونئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ان میں احتجاج تھا، غصہ تھا، جوش و جذبہ کا ریلا بڑھتا جا رہا تھا۔ مہر مارکر ان سب کے ساتھ چل رہی تھیں۔

''ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام لوگ خصوصاً عورتوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے۔ انہیں یہ معلوم ہوا کہ بطور انسان ان کے کیا حقوق ہیں۔ ان کی آئینی حیثیت کیا ہے۔ نیز یہ کہ خواتین کی اقتصادی ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی لاسکتی ہے۔''

مہر مارکر گزشتہ 6-7 برس سے شرکت گاہ کراچی کی کوآرڈینیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ مذکورہ ادارے کے مختلف پراجیکٹس پر کام کرتی تھیں۔

''میں واپس پاکستانی آئی تو'' مہر کہتی ہیں ''میرے ذہن میں پڑھانے کا خیال تھا۔ لیکن جب ادارے کی سینئر اراکین کے ساتھ مل کر مختلف ترقیاتی منصوبوں پر کام کیا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ یہ کام نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اس کے ذریعے عام لوگوں سے رابطہ ہوتا ہے۔ ان کی بہتری کے لئے اقدامات کئے جاتے ہیں جو کہ بہت طمانیت بخش امر ہے۔

شرکت گاہ کی جانب سے ایک دیواری اخبار ''ہمارا ماحول'' کے نام سے نکالا جاتا ہے جس میں حفظان صحت کے بارے میں معلومات کے علاوہ ماحول سے آگاہی رکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مہر آج کل ''عورتیں اور پائیدار ماحول'' کے پراجیکٹ پر کام کر رہی ہیں۔

مہر مارکر کے شوہر ڈاکٹر ہیں اور ان کے تین بیٹے ہیں۔

''شوہر میرے کام میں تعاون کرتے ہیں۔ پھر بھی ایک احساس جرم رہتا ہے کہ اس قدر مصروفیت ہے کہ بچوں پر پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ بعض اوقات اخبار پڑھنے کے لئے بھی وقت نہیں ہوتا۔ کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی۔ شاید یہ تمام کارکن عورتوں کی کہانی ہے'' مہر کہتی ہیں۔

MashalBooks.org

# بیگم جان

قبائلی لباس پہنے ایک لڑکی افغانستان کی سرحد پار کر رہی تھی۔ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا۔ وہ غیر قانونی طور پر پڑوسی ملک میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے ایک لمبا راستہ پیدل چلتے چلتے طے کیا تھا۔ اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے مگر وہ کشاں کشاں چلتی جاتی تھی۔ جوتوں میں ریت گھسنے کی وجہ سے پاؤں کے چھالے پھٹ کر زخم بن گئے تھے مگر وہ کہیں رک نہیں سکتی تھی۔ اسے بہر حال اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔

وہ جلال آباد کے ہسپتال میں زیر علاج تھی۔ جب منزل قریب آئی تو تھکن سے چور جسم نے جواب دیدیا۔

بیگم جان نے جنوبی وزیرستان ایجنسی کے گاؤں وچھا کھوڑا میں آنکھ کھولی۔ والد فوج میں ملازم تھے۔ انکی خواہش تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ بیگم جان نے ڈیرہ اسماعیل خان کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔

بیگم جان کو یاد ہے ”ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا سکول صرف پانچویں جماعت تک تھا۔ اس کے بعد والد نے مجھے لڑکوں کے سکول میں داخل کروایا تو گاؤں بھر ہمارا دشمن ہو گیا۔ سب ابا کو برا بھلا کہتے کہ بیٹی کو لڑکوں میں سکول میں کیوں پڑھاتے ہو۔ مگر وہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ کلاس میں لڑکوں کا یہ عالم تھا کہ ماسٹر کے ادھر ادھر ہوتے ہی وہ میرے بال کھینچنے لگتے اور طرح طرح سے تنگ کرتے۔ سکول گھر سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے والدین کو یہ ڈر بھی رہتا تھا کہ کوئی لڑکا مجھے پہاڑ پر سے دھکا نہ دے دے۔ بہر حال دو سال تک میں نے اسی سکول میں پڑھا۔

بیگم جان کو فاٹا کے کوٹے میں پشاور کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا، لیکن

MashalBooks.org

وہ سیٹ ایک سیاستدان کی بیٹی کو دے دی گئی۔ حصول انصاف کے لئے مقدمہ کیا مگر ہارنا پڑا کہ اس سیاستدان کو صوبے کے گورنر کی حمایت حاصل تھی۔ اسی صوبائی حکمران کی وجہ سے پاسپورٹ نہیں مل سکا۔

بیگم جان جلال آباد سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شیر پاؤ ہسپتال میں کام کر رہی تھیں کہ وہی گورنر علاج کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہوا۔ بیگم جان نے بتایا کہ میں ہی ہوں جسے میڈیکل کالج میں داخلے سے محروم کیا گیا تھا اور جسے پاسپورٹ نہیں دیا گیا تھا۔

بیگم جان قبائلی علاقوں میں عورتوں کی تولیدی صحت کے بارے میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے شہر کی آرام دہ زندگی پر گاؤں میں فلاحی کام کرنے کو ترجیح دی ہے اس لئے کہ ''گاؤں میں جب کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو اسے کمرے میں لے جاتے ہیں جہاں جانور بندھے ہوتے ہیں۔ وہ اس غلیظ ماحول میں بچے کو جنم دیتی ہے تو درانتی سے اس کی نال کاٹی جاتی ہے۔''

''میری تمام توجہ اس پر ہے کہ قبائلی علاقوں میں دائیوں کو تربیت دوں۔ عورتوں کی صحت و صفائی کی جانب راغب کروں اور علاقے کے مکینوں کو اس پر آمادہ کروں کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سکول قائم کریں۔ تعلیم عام ہو گی تو انہیں اپنے حقوق کے بارے میں بات کرنا آئے گی۔''

معاشرے میں قبائلی عورت کے مقام کے بارے میں بیگم جان کہتی ہیں ''عورتیں صبح سویرے اٹھ کر جانوروں کے لئے گھاس اور جلانے کی لکڑی چن کر لاتی ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال کرتی ہیں مگر انہیں اپنی صفائی کا کوئی خیال نہیں۔ وہ اپنے مرد کے ساتھ پلنگ پر نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔ اس کے نصیب میں زمین پر بیٹھنا اور بچا کھچا کھانا ہے اور شوہر کی جھڑکیاں اور مار ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ ان عورتوں کو بنیادی طبی و تعلیمی سہولتیں ملیں۔ انہیں ایسا ہنر دیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی خود پیدا کر سکیں۔ صرف اسی صورت میں ان کی قدر ہو سکتی ہے۔

بیگم جان کو یہ احساس ہے کہ عورتوں کو کام پر آمادہ کرنا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے بہرحال جمرود کے علاقے میں دس عورتوں کو دائی کی تربیت حاصل کرنے پر آمادہ کیا اور

انہیں تربیت دلائی۔

بیگم جان کا کہنا ہے کہ یہاں رسم و رواج اس قدر ٹھوس اور سخت گیر ہیں کہ انہیں توڑنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ یہاں لڑکی کی شادی کرتے ہیں تو لڑکے والوں سے پیسے لیتے ہیں۔ خود ہم نے اپنی دو بھابیوں کو خریدا۔ میرے لئے بھی میرے شوہر نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار ادا کئے۔ یہ ایک رسم ہے۔ اگر والدین لڑکی کی قیمت لگائیں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکی میں کوئی خامی یا نقص ہے۔

بیگم جان فاٹا سے سینیٹ کا الیکشن لڑنا چاہتی تھیں لیکن اس کے لئے جو کثیر رقم درکار تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی۔ کہتی ہیں ''اس طرح میں علاقے کی فلاح و بہبود کے لئے بہتر طور پر کام کر سکتی تھی لیکن مجھے جواب میں دھمکیاں ملتی ہیں۔ جان سے مار دینے کے پیغامات ملتے ہیں۔''

بیگم جان جب جلال آباد میں زیر تعلیم تھیں تو افغان جنگ شروع گئی۔ میزائلوں کے تیزابی مادے کے اثرات ان کے خون میں شامل ہو گئے جس سے انہیں ایک موذی مرض لاحق ہو گیا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور بدستور سرگرم عمل رہیں۔ انہوں نے افغان مہاجرین کے کیمپوں میں بھی بطور میڈیکل افسر کام کیا۔ وہ دیگر غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ کام کرنے کے علاوہ ریڈیو سے خبریں بھی پڑھتی رہی ہیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر بھی ہیں جنہوں نے تعلیم روس سے حاصل کی۔ ان کا تعلق ریاست دیر سے ہے۔ ان کا ایک بیٹا ہے۔

MashalBooks.org

# مریم بی بی

ملک کے شمال میں واقع وزیرستان کے قبائلی علاقے میں تعلیم کے فروغ کے لئے سکالرشپ دیئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہاں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ مریم بی بی کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے بچوں کو سکالرشپ ملیں۔ خوش قسمتی سے ایسا ہوا اور مریم بی بی، ان کی پانچ بہنوں اور دو بھائیوں نے وظائف حاصل کر کے تعلیم حاصل کی۔

مریم نے بی اے کا امتحان دیا۔ ابھی رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا کہ شادی ہوگئی۔ مریم گھرداری اور بال بچوں میں مصروف ہوگئیں۔ یہ سلسلہ 17-18 برس تک چلتا رہا۔ مریم کی خواہش تھی کہ وہ کوئی کام کریں لیکن میکے اور سسرال والوں کی طرف سے انکار ہو جاتا۔ یہ جواز پیش کیا جاتا کہ عورتوں کو ملازمت نہیں کرنی چاہئے۔ مریم مخالفت پر پسپا نہیں ہوئی۔ ایک بار، دو بار چار بار لیکن وہ اپنی ثابت قدمی کے طفیل پانچویں بار کامیاب ہوگئیں۔

یہ سنہ 87ء کا ذکر ہے۔ مریم نے پشاور میں اپوا کی شاخ میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بعض غیرملکی اداروں کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں حصہ لیا اور 93ء میں ایک تنظیم خوئندوکور (KHWENDO KOR) یعنی ''بہنوں کا گھر'' کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل افغان مہاجرین کی امداد اور آبادکاری کے سلسلے میں مختلف منصوبوں پر کام کیا۔ لیکن اپنی تنظیم کے تحت جو کام کئے ان میں سرفہرست صوبے میں 60 سکولوں کا قیام ہے۔ دیہی عورتوں کو جانوروں کی افزائش، منیاری کی اشیاء اور تیل نکالنے کے گھان کے لئے 12 لاکھ کے قرضے بھی فراہم کئے۔

''ہماری منزل'' مریم کہتی ہیں ''غیر مراعات یافتہ طبقے کی عورتیں ہیں جنہیں حفظان صحت کے بارے میں معلومات نہیں۔ ہمارا مقصد انہیں غیر رسمی تعلیم، صحت اور آمدنی

بڑھانے کے لئے خدمات فراہم کرنا ہے۔

تجربے سے یہ بات سامنے آئی کہ عورتوں میں کچھ کرنے، تعلیم حاصل کرنے کا بہت جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے لیکن مرد راہ میں آ جاتے ہیں تو ان کا جوش جھاگ کی مانند بیٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ طے کیا کہ مردوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے۔ اس سے عورتوں تک رسائی نسبتاً آسان ہو گئی۔ اس ضمن میں کامیابی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی منصوبے پر کام کرنے کا ارادہ ہو تو اسکا خلاصہ اگر چھپا ہوا ہو تو لوگوں کو اغراض و مقاصد سمجھ میں آ جاتے ہیں اور وہ تعاون کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ترقیاتی کاموں کے لئے دیہی علاقوں میں کام کرنا بہت دشوار ہے۔ عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس غرض سے آتے ہیں۔ وہ اسے ان سے طرز زندگی میں بے جا مداخلت خیال کرتے ہیں۔ ہم اکثر اوقات اپنی بات انہیں سمجھانے میں کامیاب ضرور ہوئے لیکن جہاں جہاں رویوں میں لچک پیدا کرنا ممکن نہ تھا ہم نے وہاں سے کوچ کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

مریم کی تنظیم خویئدو کور صوبہ سرحد میں اپنی پہلی نوعیت کی پہلی این جی او تھی جس کے تحت عورتوں کو ماحول اور پائیدار ترقی کے عمل میں شامل کیا گیا۔ ہمارے علاقے میں جنگلات کی کٹائی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہم نے ''اپنے درختوں کو بچاؤ'' کے منصوبے پر کام کیا۔ اس میں ایک کتابچے کی اشاعت بھی شامل تھی جس میں سہل زبان، خاکوں اور تصاویر کی مدد سے عورتوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ماحول کی بقا کے لئے درختوں کی دیکھ بھال اور افزائش کس قدر ضروری ہے۔

مریم بی بی کے چار بچے ہیں۔ دس گیارہ سال پہلے جب انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا تو ان کے شوہر علیل تھے۔ مریم نے چاہا تھا کہ وہ سکول ٹیچر بن جائیں تاکہ شوہر اور بچوں کی کفالت کر سکیں اور اقتصادی خودمختاری حاصل کریں لیکن تعلیم دینا ان کے گھر والوں کے نزدیک پسندیدہ کام نہیں تھا۔ ان کی ایک بہن ڈاکٹر بن گئیں۔ سب اس سے بہت خوش تھے۔ مریم نے قضیہ کھڑا کر دیا اگر مجھے کام کرنے کی اجازت نہیں ملے گی تو پھر ڈاکٹر بہن بھی کام نہیں کرے گی۔

اب مریم بات کرتی ہیں کمیونٹی کی سطح پر کیئے گئے اپنے کاموں کی۔ وہ کئی ترقیاتی

منصوبوں میں کوآرڈینیٹر اور دیگر ذمہ دار عہدوں پر رہی ہیں۔ وہ ویمن ان ڈیویلپمنٹ (WID) کی رکن اور 93ء میں اس کی چیئر پرسن منتخب ہوئیں۔ وہ فرنٹیئر این جی او ریسورس سینٹر (FRC) کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی رکن ہیں۔ اس دوران وہ مختلف کانفرنسوں اور ورکشاپس کے سلسلے میں برطانیہ، امریکہ، بنگلہ دیش، فلپائن اور سری لنکا جا چکی ہیں۔

MashalBooks.org

# سلمیٰ علی خان

ماں کہتی تھی کہ ''عورت کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کی عزت ہوتی ہے۔'' بچپن کا پہلا سبق۔

15 سال کی عمر میں ایک رول ماڈل مل گیا۔ وہ ایک طالب علم تھا۔ ان دنوں سلمیٰ کالج آف ہوم اکنامکس ڈھاکہ کی طالبہ تھیں۔ یہ ساٹھویں دہائی کے اواخر کا ذکر ہے۔ ان دنوں مغربی پاکستان کے 25-30 طالب علم ہر سال سابق مشرقی پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ سلمیٰ کو بھی اس کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا۔

سلمیٰ کہتی ہیں ''خود انحصاری حاصل کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ وہاں ہماری ایک انجمن بنی۔ زندگی میں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ انجمن کیسے بنتی ہے اور تنظیم کا نظم و نسق کس طرح کیا جاتا ہے۔ ہماری انجمن کا جنرل سیکرٹری ایک انقلابی طالب علم تھا۔ اس کی بدولت یہ سیکھا کہ ٹیم ورک کیسے کیا جاتا ہے۔ اجتماعی کاموں کی افادیت کیا ہے۔

سلمیٰ علی خان کی جب شادی ہوئی تو ان کی تعلیم صرف انٹر تھی۔ گھر کا سارا انتظام ساس کے ہاتھ میں تھا۔ سلمیٰ کے لئے یہ ایک اچھا سیٹ اپ تھا۔ پھر انہوں نے اپنی والدہ سے یہی جانا تھا کہ شادی کے بعد پڑھائی جاری رکھنا ممکن ہے۔ خود ان کی والدہ نے اپنی شادی کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔اے اور پھر ایم ایڈ کیا۔

سلمیٰ علی خان نے سینٹ میری ہائی سکول گوجرانوالہ سے میٹرک، پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز اور پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔

''یہ 20 برس پہلے کی بات ہے۔ میں جب پشاور آئی تو کرنے کو زیادہ کچھ نہیں تھا۔ شوہر نے تحریک دی کہ اس علاقے کی پسماندہ عورتوں کا شعور بڑھانے کے لئے کچھ کرنا

چاہیئے۔ اس پر میں نے ایک ویمنز کلب بنایا کہ عورتیں مل بیٹھیں گی تو آپس میں جان پہچان ہو گی۔ وہ ایک دوسرے کے مسائل سنیں گی اور ان کے حل کے لئے باہمی طور پر کچھ سوچیں گی۔ کچھ قدم اٹھائیں گی۔''

انہی دنوں پاکستان چلڈرن اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ میں نے اس میں شرکت کر لی۔ پاکستان کے آئین کے مطابق 15 سال سے کم عمر کے بچوں سے محنت کروانے پر پابندی ہے۔لیکن ہمارے ملک میں اور خصوصی طور پر سرحد جیسے پسماندہ صوبے میں اقتصادی حالات اتنے خراب ہیں کہ بچے اپنے گھرانے کے لئے روزگار کا وسیلہ بنتے ہیں۔ دنیا بھر میں بچوں کی محنت کے بارے میں احتجاج کیا جا رہا ہے۔لیکن عملی طور پر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چلڈرن اکیڈمی کا مقصد بچوں کی تعلیم اور صحت کے بارے میں اقدامات کرنا ہے۔

صوبہ سرحد میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق سکول جانے والے بچوں میں سے 35 فیصد لڑکے اور 55.5 فیصد لڑکیاں دو سے تین سال بعد سکول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غربت ہے۔لڑکیاں گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹانے اور لڑکے مزدوری کرنے کے لئے سکول چھوڑتے ہیں۔''

چلڈرنز اکیڈمی کے زیر اہتمام پشاور اور ملحقہ علاقوں مثلاً چارسدہ، مردان کے سکولوں میں بچوں کے لئے یونیفارم اور نصابی کتابیں فراہم کی گئیں۔ اسی طرح حسن گڑھی اور شاہ ڈنڈ کے دیہاتوں کے سکولوں میں چٹائیاں اور سٹیشنری فراہم کی گئی۔

''ہماری اس اکادمی میں تمام تر عورتیں کام کرتی ہیں۔ ہماری اس چھوٹی سی کوشش کا ایک مقصد پدری نظام میں دراڑیں ڈالنا ہے۔عورتیں عملی طور پر مصروف ہوں گی تو ان میں لیڈرشپ کا جذبہ پیدا ہو گا۔

سلمیٰ علی خان ایسوسی ایشن آف بزنس پروفیشنل اور ایگری کلچرل ویمن کی چمکنی برانچ کی صدر ہیں۔ وہ خود ملبوسات اور جیولری کی برآمد کا کاروبار کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ادارے کے تحت عورتوں کو کاروبار کی ترغیب و تربیت اور قرضے فراہم کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔

''اس عمل سے انہیں اپنی قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان میں اعتماد پیدا

ہوتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت اور وقعت کی پہچان کرنے لگتی ہیں۔ جب ادراک بڑھتا ہے تو ان میں سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے ووٹ کی اہمیت کو سمجھنے لگتی ہیں۔

سلمیٰ علی خاں نیٹ ورک فار انٹر پرائزنگ ویمن (NEW) کی بنیادی رکن ہیں جس کے تحت ''عورتیں اور برآمدات کا کاروبار'' کے موضوع پر ایک ورکشاپ منعقد کی۔ سلمیٰ کی زیادہ سرگرمیاں عورتوں میں عملی زندگی میں کارآمد کردار ادا کرنے کی تربیت سے متعلق رہی ہیں۔ مثلاً اگر عورتیں گھریلو سطح پر کچھ مصنوعات تیار کرتی ہیں تو ان کی مارکیٹنگ کا کیا طریقہ ہے۔ وہ اپنے کاروبار کا بندوبست کس طرح کریں۔ اپنے روابط کس طرح بڑھائیں۔

عورت جب عملی زندگی میں قدم رکھتی ہے تو اس کی راہ میں بہت ساری رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔عورت ہونے کے ناطے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کچھ گھریلو تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ عورت اگر معاشی ذمہ داریوں میں مرد کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے تو ابتدا میں اس کی اس پیشکش کو مرد کی توہین قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے یا تو وہ قدم روک لے یا آگے بڑھ جائیں۔ اگر وہ خلوص نیت سے اپنے ارادے پر ڈٹی رہتی ہے اور اس کی کارکردگی کے مثبت نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر اسے بتدریج تسلیم کر لیا جاتا ہے لیکن اس دوران ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہے۔ دوسری طرف اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے تعاون کے لئے بھی مخصوص حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انہی امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سلمیٰ علی خان نے ''نیو'' کے زیر اہتمام سٹریس مینجمنٹ (Stress Menagment) کے موضوع پر ایک تربیتی ورکشاپ منعقد کی۔

سلمیٰ علی خان امریکہ، ہندوستان، نیپال اور پاکستان میں آمدنی بڑھانے کے ذرائع اور کاروبار کے فروغ کے ضمن میں منعقد ہونے والی ورکشاپس میں شریک ہوتی رہی ہیں۔

چھوٹے کاروبار کو جمانے کے طریقوں وغیرہ کے بارے میں انہوں نے ''آدھی دنیا'' کے نام سے ٹیلی ویژن پر پروگرام بھی کئے۔ سلمیٰ کا کہنا ہے کہ میڈیا ان کاموں کے پرچار کے لئے بہترین وسیلہ ہے اور لوگ ان باتوں کو ماننے لگتے ہیں۔

MashalBooks.org

''ہماری عورتیں جن مسائل سے دو چار ہیں، انہیں جس قدر رہنمائی کی ضرورت ہے اس کے مقابلے میں ہمارا یہ کام سمندر میں قطرے کی مانند ہے۔ بہرحال کام کو جاری رکھنا ضروری ہے۔

سلمیٰ علی خان کے تین بچے ہیں۔

MashalBooks.org

# غزالہ نگار اورکزئی

''اگر افغان جنگ نہ ہوتی تو پشاور کا ماحول مختلف ہوتا۔ اس صورت میں یہاں کی لڑکیاں ہر شعبے میں سرگرم عمل دکھائی دیتیں۔''

''پشاور کے قبائلی معاشرے کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ کوئی بھی ایسا معاشرہ اپنی روایتی اقدار سے دستبردار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حققت ہے کہ اس علاقے کی پٹھان عورت ضرورت سے زیادہ دباؤ برداشت نہیں کرتی۔ وہ مزاحمت کرتی ہے، جواب دیتی ہے لیکن اس دور میں بھی عورتوں کا گھر سے باہر نکل کر اپنے حقوق کی بات کرنا مشکل ہے۔ اسے ناپسندیدہ فعل خیال کیا جاتا ہے۔ اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

غزالہ نگار کا تعلق چترال کے ایک راویت پسند گھرانے سے ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات کو زبان دینے کے لئے ادب کو وسیلہ بنایا۔ وہ جب نویں جماعت میں پڑھتی تھیں تو ان کے مضامین مختلف جریدوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ والدین نے ان کی لکھنے پڑھنے کی بہت سخت مخالفت کی۔ والد کو اب بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ شاعری کرتی ہیں۔ والدہ کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کے گھر کے کام چھوڑ کر بے کار باتوں میں وقت ضائع کرتی ہے۔

غزالہ نگار اپنے بچپن کو یاد کرتی ہیں ''گھر میں کہانیاں سننے اور سنانے کا رواج تھا۔ ابا کی ایک خالہ کو بہت کہانیاں یاد تھیں۔''

غزالہ کو جب لکھنا پڑھنا آ گیا تو خود کہانیاں لکھنے لگیں مگر وہ کہانیاں ابا کی خالہ کی کہانیوں سے مختلف تھیں۔ ان میں عورت کی آواز سنائی دیتی تھی۔ زندگی کے حقائق کی آئینہ دار کہانیاں تھیں وہ۔

غزالہ نگار نے پشاور یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے اور ایم فل کیا۔

MashalBooks.org

وہ اب اسی یونیورٹی کے انگریزی اور یورپی زبانوں کے شعبے کے ساتھ منسلک ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ پشاور یونیورسٹی میں قائم کئے گئے ویمنز اسٹڈیز کے ساتھ بھی وابستہ ہیں۔

غزالہ نگار نے ویمنز اسٹڈیز سینٹر کے زیر اہتمام مختلف منصوبوں پر تحقیقی کام کئے ہیں جن میں چائلڈ لیبر اور عورتوں کے حوالے سے مختلف امور کا مطالعہ کیا لیکن انہیں ویمنز سٹڈیز کے بارے میں یہ شکایت ہے کہ اس شعبے کے ساتھ کام کرنے والے محض جز وقتی ہیں جس سے بھرپور طریقے پر کام نہیں ہوسکتا۔

لیکن گزشتہ برسوں کے دوران اپنے صوبے کی عورتوں کے ساتھ روابط اور مشاہدات سے انہوں نے یہ اخذ کیا کہ ''یہاں کی عورتوں میں سیاسی شعور خاصا ہے۔ان میں سے بعض نے عملی سیاست میں حصہ بھی لیا ہے، اسمبلیوں تک پہنچتی ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا جمع خرچ محض زبانی کلامی ہے۔حقیقتاً انہوں نے عملی طور پر علاقے کی عورتوں کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کیا۔

ہم نے مختلف تنظیموں اور اداروں کے ساتھ مل کر عام عورتوں میں خوراک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب تک عورتوں میں تعلیم عام نہ ہو۔ ان کے پاس اقتصادی طاقت اور خودمختاری نہ ہو وہ سیاسی سطح پر موثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران ایک مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ صوبے میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ عورت اب سمجھوتے نہیں کرتی۔ وہ خود کو انسان کی حیثیت سے منوانا چاہتی ہے۔یہ بات ایک روایتی اور قدامت پسند مرد کو پسند نہیں آتی۔

غزالہ نگار نے شادی نہیں کی کہ غلط انتخاب سے زندگی دوبھر ہو جاتی۔غزالہ نے اپنے طالب علمی کے دور میں ڈی ایچ اے لارنس کی تحریروں میں عورتوں کے حوالے سے ''علامات'' پر تحقیق کی۔انہوں نے ورجینا وولف کے ناولوں میں شعور کے دھارے کا مطالعہ کیا۔

ورجینا وولف ایک فیمی نسٹ ناول نگار تھیں۔انہوں نے اپنے پہلے ناول ''دی وائج آوٹ'' کے مرد کردار کی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ہو

سکتی ہیں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ عائلی زندگی میں بیوفائی اور سمجھوتے شامل ہوں۔ کیا یکسوئی ختم ہونے سے تخلیقی کام کرنا ممکن ہے؟

غزالہ نگار کے ذہن میں ابھی تک یہ سوال کسمسا رہا ہے کہ سارا شگفتہ کون تھی؟ وہ ایسی کیوں تھی؟

MashalBooks.org

# زبیدہ جلال

یہ مکران کے علاقے مند کی روایت تھی کہ لڑکیوں کی شادی گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہو جاتی تھی۔ اگر کسی لڑکی کی شادی اس عمر میں نہیں ہو پاتی تو وہ اپنے ہی گھر میں شادی شدہ عورتوں کے سامنے بھی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ ایک کمرے میں بند کر دی جاتی جہاں اسے دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھنا ہوتا تھا۔ عام طور پر لڑکیاں گہرا نیلا لباس اور کالی چادر اوڑھتی تھیں۔ ناک اور کان میں بہت سے سوراخ کر کے زیورات پہنتی تھیں۔

زبیدہ جلال کا تعلق مند کے ایک سیاسی گھرانے سے ہے۔ انہوں نے اپنا بچپن کویت میں گزارا جہاں ان کے والدین سنہ 45 سے 78 تک آباد رہے۔

جب وہ کویت سے واپس آ کر مند میں رہنے لگے تو زبیدہ اور ان کی بہنوں کا لباس نہ گہرا نیلا تھا اور نہ سر پر سیاہ چادر تھی اور نہ ہی ناک اور کان میں اتنے زیادہ سوراخ تھے۔ مقامی لوگوں کا اس پر بہت اعتراض ہوا کہ یہ لڑکیاں نہیں لگتیں، مرد ہیں۔

زبیدہ جلال یاد کرتی ہیں ''میرے والد نے لڑکیوں کا سکول کھولنے کا سوچا کہ ان دنوں (سنہ 82ء میں) علاقے میں لڑکیوں کا ایک بھی سکول نہیں تھا۔ ہم نے اپنے گھر کی بیٹھک میں اپنی مدد آپ کے تحت سکول کھولا تو گویا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ہمارے علاقے میں چار ذاتوں کے لوگ رہتے تھے۔ رند، لوڈی اور دراز تک (کسان) انہیں رئیس کہتے تھے۔ چوتھی ذات غلاموں کی تھی۔ سکول میں 3 ذاتوں کی لڑکیاں تو آ گئیں مگر رند خاندان کے لوگوں نے سخت مزاحمت کی۔ وہ لوگ کہتے کیا میرے والد کے پاس کھانے کو نہیں رہ گیا جو سکول کھولا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ (بقول ان کے) لڑکیوں پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ پہلے باپ پالتا ہے پھر شوہر لہٰذا انہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

وقت گزرا۔ علاقے کی لڑکیاں پڑھنے لگیں تو رند قبیلے کو پچھتاوا ہوا کہ دوسرے قبیلے کی لڑکیاں ان سے کہیں آگے نکل گئی ہیں۔ اب مند میں ہائر سیکنڈری سکول بن چکا ہے۔ کئی لڑکیوں نے ایف۔ ایس سی کیا اور میڈیکل کی تعلیم کے لئے آگے بڑھیں۔ اب لڑکیوں کی شادی کے بارے میں بھی رجحانات تبدیل ہو رہے ہیں۔

علاقے میں جب کبھی سیاسی کشمکش ہوتی ہے تو سکول کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایک بار اسے جلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ سکول کا نام خراب کرنے کے لئے چند سال قبل آٹھویں جماعت کی ایک طالبہ کو مار دیا گیا۔ اس لڑکی کا تعلق غلام قبیلے سے تھا۔

زبیدہ جلال فخر سے کہتی ہیں ''ہمارے سکول سے غلام قبیلے کی بہت سی لڑکیاں پڑھ کر نکلی ہیں۔ ان میں سے بعض ملازمت کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی کمائی سے زمین خریدی اور اپنے مکانات تعمیر کئے۔ وہ اپنے فیصلے خود کر رہی ہیں۔

زبیدہ جلال کویت میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے سنہ 92ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ وہ اپنے قائم کئے ہوئے سکول کو چلانے کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی ترقیاتی اداروں کے تحت چلائے گئے منصوبوں میں رضا کارانہ کام کرتی ہیں۔ سنہ 84ء میں یونیسیف کی طرف سے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں ایک تحقیقی مطالعہ کیا گیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ کالاگ کے گاؤں نے مند کی مثال پر عمل کرتے ہوئے انہی خطوط پر ایک سکول کھولا۔

گھر کی بیٹھک میں قائم کئے گئے سکول کا درجہ کالج تک پہنچ گیا ہے۔ یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا پہلا بیچ سنہ 84ء میں نکلا تھا۔ عنقریب یہاں ڈگری کالج قائم ہو جائے گا۔ اس کالج کی عمارت تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔

زبیدہ جلال کا کہنا ہے کہ ہمارے منصوبے میں غیر ملکی مالیاتی اداروں کے تعاون سے پرائمری سکول کھولے جا رہے ہیں لیکن بھلا ہم یہ کام خود کیوں نہیں کر سکتے۔

زبیدہ جلال نے تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم پھیلانے کے عزم کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنی کامیابی کا ایک طریقہ یہ بھی استعمال کیا کہ انہوں نے اپنے علاقے کی ثقافت اور اقدار کو برقرار رکھا۔

انہوں نے پرائمری طریقہ تعلیم کی تربیت نیپال، کوریا اور فلپائن سے حاصل کی۔

MashalBooks.org

وہ برطانیہ میں خاندانی منصوبے بندی کے لئے انٹرنیشنل یوتھ ٹاسک فورس اور چین میں منعقد ہونے والی عورتوں کی چوتھی عالمی کانفرنس کے وفد میں شامل تھیں۔

اپنے علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے صلے میں انہیں 93ء اور 97ء میں حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔

زبیدہ جلال نے شادی نہیں کی۔ کہتی ہیں ''ہمارے ہاں ذات کا مسئلہ بہت اہم ہے، لہٰذا ہماری ذات میں کوئی میرے لئے مناسب رشتہ نہیں ملا۔ پھر کاموں میں اتنی مصروف رہی کہ شادی کا خیال ہی نہیں آتا تھا لیکن اب دو تین سال سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے شادی کر لینی چاہئے کیونکہ سب بہن بھائی اپنے گھروں میں مصروف ہیں۔ والدین نہیں رہیں گے تو میرا گھر کہاں ہوگا؟

MashalBooks.org

# ثریا امیر الدین

''بلوچستان کی عام عورتیں احتجاجی جلوس تو کیا اپنے نجی کاموں کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہوئے بھی ہچکچاتی ہیں۔ لیکن ہم نے مارشل لاء کے دور میں عورتوں کے مخالف کالے قوانین کے خلاف عورتوں کے جلوس نکالنے کی روایت ڈالی۔ اس سے پہلے صرف ایک بار ایسا ہوا تھا جب سنہ 74ء میں بھٹو کے دور میں صوبے میں فوج کشی کے موقع پر عورتیں سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔''

ثریا امیر الدین نے تدریسی پیشے کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ جب باقاعدہ طور پر سیاسی یہ فلاحی تنظیموں کے ساتھ کام نہیں کرتی تھیں اس وقت بھی وہ نجی طور پر غریب طلبا کے لئے امدادی کاموں میں حصہ لیتی رہیں۔ اس دوران انہوں نے جیل میں قیدیوں کی فلاح و بہبود کے لئے اقدامات کئے۔

ثریا امیر الدین نے بلوچستان یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے، ایم ایڈ اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ دیگر تنظیموں کے علاوہ پاکستانی انسانی حقوق کمیشن، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور عورت فاؤنڈیشن کی سرگرم رکن ہیں لیکن ان کی زیادہ تر سرگرمیاں انرویل کلب سے متعلق ہیں اور وہ اس ادارے کی عہدے دار بھی رہی ہیں۔

ثریا نے مختلف اوقات میں بیش بہا فلاحی کام کئے ہیں۔ کہتی ہیں ''عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یتیم خانوں میں بچوں کو اچھی غذا نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے مخیّر حضرات خیرات کے طور پر یتیم خانوں کو بھی کھانا فراہم کرتے ہیں تو بعض اوقات وہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار ہم نے یتیم خانے کے بچوں کا طبی معائنہ کروایا تو پتہ چلا کہ مسلسل گوشت کھانے سے ان کے جسم میں چکنائی بہت بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا

کہ انہیں سبزیاں کھلائی جائیں ورنہ یہ بیمار پڑ جائیں گے۔

دو سال قبل چولہا پھٹنے کے واقعات پر تحقیقی مطالعہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ بلوچستان میں ہمیں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملا جبکہ ملک کے دیگر صوبوں میں چولہا پھٹنے کے بہانے عورتوں کو جلانے کا رواج عام ہے۔

ثریا کا دعویٰ ہے کہ اب ہمارے ہاں کی عورتوں میں شعور بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئٹہ میں خاص طور پر عورتوں کے کام کرنے کے بارے میں روایتی رویوں میں خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ یہ بتاتی ہیں کہ فلاحی اور ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنے والوں کی ساکھ بن جائے تو عام لوگ اعتبار کرنے لگتے ہیں۔ ''ہمیں اپنے کچھ کاموں کے لئے فعال اور نوعمر لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری اب ایک پہچان بن چکی ہے۔ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں کہ میں جس گھر کی لڑکی کو چاہوں اپنے ساتھ لے کر کسی بھی پراجیکٹ پر جا سکتی ہوں۔

ثریا ماحولیات اور جنگلی حیات کے تحفظ کے سلسلے میں بھی سرگرم عمل رہتی ہیں۔ پودے اور پرندے پالنا ان کا اپنا شوق بھی ہے۔ انہیں اس ضمن میں انعامات بھی مل چکے ہیں۔

وہ پاک انڈیا پیپلز فورم کی رکن ہیں اور کلکتہ کنونشن کے لئے پاکستانی وفد میں شامل تھیں۔ اس کنونشن کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ثریا کہتی ہیں کہ علاقائی سلامتی اور امن کے لئے پڑوسی ممالک کے تعلقات بہتر ہونے چاہئیں۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ویزے کی پابندیاں نرم کی جائیں۔ ہماری نئی نسل کے ذہن میں جو ایک دوسرے کے ملک کے بارے میں تعصب ہے وہ ختم ہو اور دونوں ممالک کے درمیان ثقافت، ادب اور معلومات کا تبادلہ ہو۔

ثریا امیر الدین شادی شدہ ہیں۔ ان کے شوہر بھی تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ثریا کو اپنی تمام تر سرگرمیوں کے لئے اپنے شوہر کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ ثریا کا کہنا ہے کہ تدریس میری روزی ہے جبکہ عورتوں کے حقوق، انسانی حقوق، قیدیوں اور یتیم بچوں کے لئے میں جو اپنا وقت اور یتیم بچوں کے لئے میں جو اپنا وقت دیتی ہوں وہ صرف میرے دل کی تسکین کے لئے ہے۔

MashalBooks.org

# فوزیہ دیبا

''ایک بار ایک عورت میرے پاس آئی جس کی بچہ دانی پھٹ گئی تھی۔ ہم نے بمشکل اس کی جان بچائی اور اسے ہدایت کی کم از کم پانچ برس تک بچہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ مگر اگلے برس وہ پھر حاملہ ہو کر آ گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے سوچا کہ میرا کام ایسی عورتوں کے جسم کو صرف ٹانکے لگانا ہی نہیں ہونا چاہئے یہ کام تو کوئی بھی ڈاکٹر کر سکتی ہے۔'' میں جانتی تھی کہ یہ عورت اپنے شوہر کے سامنے بے بس ہے۔ وہ اس کے مطالبے کو ٹھکرانے کی جرأت نہیں رکھتی۔ عورت چاہے بیمار ہو، کمزور ہو، تھکی ہوئی ہو ایک فرض شناس بیوی کی طرح وہ مرد کو جذباتی تسکین پہنچانے پر مجبور ہے۔ یہی معاشرے کا المیہ ہے۔ عورت خیال کرتی ہے۔ ڈرتی ہے کہ اگر اس نے ہر حالت میں اپنے شوہر کی بات نہ مانی تو وہ بھٹک جائے گا۔ دوسری عورت کی تلاش میں نکل جائے گا۔ وہ عورت ازدواجی ریپ اور گھریلو تشدد کی ایک مثال تھی۔

جب میں نے یہ سوچ لیا کہ مجھے ایسی عورتوں کو سمجھانا ہے، انہیں ان کے حقوق کے بارے میں بتانا ہے۔ ان میں یہ شعور پیدا کرنا ہے کہ وہ بھی انسان ہیں، تو پھر مجھے کام کا ایک سمندر نظر آیا اور میں نے یہ راہ اختیار کر لی۔

فوزیہ دیبا پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی والدہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جس نے سکول کی شکل دیکھی تھی۔ والد سول سروس میں تھے۔ فوزیہ ابھی کم سن تھیں کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ایک بھائی تھا وہ بھی اٹھارہ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس وقت امی نے سوچا کہ جن لڑکیوں کے باپ اور بھائی نہیں ہوتے انہیں خود ہی کچھ کرنا چاہئے۔ ان میں اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔ میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ

MashalBooks.org

میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ اس پر خاندان بھر میں طوفان کھڑا ہو گیا لیکن والدہ نے سینہ سپر ہو کر مجھے ڈاکٹر بنایا۔

فوزیہ کے شوہر بھی ڈاکٹر ہیں۔ ان کا تعلق بلوچستان کے ایک پسماندہ گاؤں سے ہے۔

کہتی ہیں ''شہر میں رہ کر بہت سارے کام کر لئے جاتے ہیں۔ ہم دیہی عورتوں کی ترقی کی بات کرتے ہیں، انہیں پسماندہ روایتوں سے نکلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن جب میں خود گاؤں جاتی ہوں تو وہاں ایک دیہاتی لڑکے کی طرح رہنا پڑتا ہے۔''

فوزیہ نے جب ترقیاتی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تو کوئٹہ کے سیکرٹیریٹ میں جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتیں۔ شہر کے اس حصے میں جہاں تمام تر سرکاری دفاتر اور متعلقہ شعبے قائم ہیں وہاں پہلے پہل ہر طرف مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔

فوزیہ کا کہنا ہے کہ ''اب یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مختلف شعبوں سے منسلک اب سیکرٹریٹ میں بہت سی عورتیں نظر آتی ہیں، جو بہت سے ترقیاتی منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ بلکہ منصوبوں کے لئے ان کی تجاویز کو اہمیت دی جاتی ہے۔''

بلوچستان میں ترقیاتی کاموں کے دوران پیش آنی والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے فوزیہ دیبا کا کہنا ہے کہ ''ہمیں اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے مقامی لوگوں اور سرکاری اہلکاروں کو اعتماد میں لینا ہوتا ہے ورنہ ان کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ہم نے کسی گاؤں میں سکول یا ہیلتھ سنٹر قائم کر دیا اور مقامی لوگوں سے نہ پوچھا تو وہ عمارت کے دروازے کھڑکیاں غائب کر دیتے ہیں اور وہاں گدھے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم نے علاقے کے سرکاری عہدے دار سے اجازت نہ لی تو وہ ہر کام جو وہاں کی ترقی اور بہتری کے لئے ہوتا ہے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ ہمارے کام کو اپنے حلقہ اختیار میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔

فوزیہ کا تجربہ ہے کہ مشاورت کے لئے دیہی عورتوں تک رسائی مشکل ہے۔ ان کاموں کے لئے عورتوں کے گروپ نہیں ملتے۔ البتہ قہوہ خانوں میں اور دیہات میں مزارعوں کے گروپ مل جاتے ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اعتماد میں لے کر عورتوں تک پہنچا جائے۔

MashalBooks.org

فوزیہ دیبا اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ ماحولیاتی تنظیموں اور ویمن اینڈ ڈیویلپمنٹ (WID) کے ساتھ بطور کوآرڈینیٹر اور ایجوکیٹر منسلک ہیں۔فوزیہ کے تین بیٹے ہیں۔

MashalBooks.org

# ساجدہ قریشی

وقت کے ساتھ بلوچستان کے لوگوں میں یہ سوجھ بوجھ تو آ گئی ہے کہ اپنے وسائل کی بنا پر کاروبار کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کی زندگی میں تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود نچلے وسطی اور نچلے طبقے ہی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اسمگلنگ اور منشیات کے دھندے سے کچھ لوگ بہت خوش حال ہو گئے ہیں لیکن اکثریت کو آج بھی بنیادی ضروریات زندگی میسر نہیں ہیں۔

ساجدہ قریشی جو تدریس کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ صرف تعلیم ہی غریب عوام کو سماجی اور اقتصادی شعبے میں مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن پرائمری تعلیم کے فروغ کے لئے حکومتی کوششوں سے تمام وسائل حل نہیں ہو سکتے، کیونکہ غریب اور امیروں کے لئے تعلیمی معیار مختلف ہے۔

ساجدہ قریشی اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ انگلش بلاشبہ ایک بین الاقوامی زبان ہے اور یہ اقتصادی اور سماجی ترقی کا موثر ذریعہ ہے۔

ساجدہ قریشی تعلیم فاؤنڈیشن کی سرگرم کارکن ہیں۔ اس تنظیم کے تحت ژوب، ڈیرہ بگٹی اور گھریلو اور کوہلو وغیرہ میں انگلش میڈیم سکول کھولے گئے ہیں۔

اسکے علاوہ پاکستان انسانی حقوق کمیشن کوئٹہ کے علاوہ چند اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ بھی منسلک ہیں اور ان کے تحت چلائے گئے منصوبوں میں بھرپور انداز میں شرکت کرتی ہیں۔

ساجدہ قریشی کا تعلق قلات کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے تین بیٹیوں کی تربیت اس انداز سے کی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو

سکیں۔ بے شک بچیوں کی پرورش میں نانا کا تعاون بھی شامل تھا لیکن ساجدہ کی والدہ نے ملازمت کی اور خود کفیل رہیں۔

ساجدہ کا کہنا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام نئی نسل کو ملازمت اور ترقی کی سمت کی نشاندہی نہیں کرتا۔ ایک طرف ناخواندگی بڑا مسئلہ ہے لیکن متوسط یا نچلے طبقے کے بچے اگر پڑھ لکھ بھی جاتے ہیں تو روزگار کے موقع نہ ہونے کی وجہ سے گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔

''ہمارے علاقے میں انسانی وسائل کی ترقی کے لئے سنجیدگی سے کوششیں نہیں کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتوں کے قیام اور فروغ کے لئے بلوچستان کے باہر سے کارکن اور ماہرین منگوائے جاتے ہیں۔ اگر متوسط اور نچلے طبقے کے افراد کو تکنیکی تربیت کے مواقع فراہم کئے جائیں تو وہ اپنے ہی صوبے کی صنعتوں میں کام کر کے اپنے خاندان کی معاشی حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔''

ساجدہ نے پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ اور بلوچستان یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے کیا۔ ترقیاتی کاموں کے ضمن میں انہوں نے کینیڈا سے ایک سال کی تربیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ وہ حیدرآباد (ہندوستان)، تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش میں متعلقہ شعبوں کی تربیتی ورکشاپس میں شرکت کر چکی ہیں۔

خود انحصاری ساجدہ کی کامیابی کا راز ہے۔ کہتی ہیں خود کو ایک مکمل عورت خیال کرتی ہوں۔ مجھے جیسے گھرداری کے تمام کام آتے ہیں، ہر ذی حس انسان کی طرح پیار کرنا اور ناراض ہونا آتا ہے لیکن جب یہ سوچ لیا کہ اپنی زندگی خود بنانی ہے تو اپنے آپ میں طاقت بھی آتی گئی۔ اپنی ذات پر بھروسہ بڑھنے لگا۔

ساجدہ قریشی کوئٹہ میں ویمنز ووکیشنل ٹریننگ سینٹر کی سربراہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اس ادارے کی کامیابی کے لئے بھرپور محنت کی ہے۔ اس ادارے میں طالبات کو مختلف کورسز کروائے جاتے ہیں جس کے بعد وہ اپنا چھوٹا سا کاروبار یا ملازمت کر سکتی ہیں۔ غیر سرکاری طور پر شروع کئے گئے اس ادارے پر سرکاری تسلط بتدریج بڑھ رہا ہے۔

ساجدہ کا تجربہ ہے کہ بلوچستان کے عام مرد، عورتوں کی ترقی اور تعلیم و تربیت کے بارے میں بہت پسماندہ ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمیں بہرحال اپنی کوششوں کو

جاری رکھنا ہوگا تا کہ یہاں مرد اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔

ساجدہ نے شادی نہیں کی لیکن یہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں۔ ''کوئی ہم خیال مرد مل گیا تو شادی کر بھی سکتی ہوں۔''

MashalBooks.org

# سلمیٰ جعفر

عورتوں کی ترقی کے بارے میں ایک پراجیکٹ پر ڈھائی سال کام کیا تو بجائے اس کے کہ اس سے مجھے کسی ترقی کا احساس ہوتا ہر وقت دل کڑھتا رہتا۔ اس دوران میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ تھا ''ویمن ڈیویلپمنٹ'' کا نعرہ لگا کر میدان میں کود پڑنے سے عورتوں کے بارے میں تعصب کو ختم نہیں کر پائے۔ آج کل یہ بار بار سنائی دیتا ہے کہ کسی بھی منصوبے کی کامیابی کے لئے غیر سرکاری تنظیموں اور سرکاری اداروں کا باہمی تعاون ضروری ہے کیونکہ ہر سطح پر کسی نہ کسی حیثیت سے سرکاری اہلکار موجود ہیں اور وہ دخل انداز بھی ہوتے ہیں تو پھر کیوں نہ انہیں اپنے ساتھ ملا لیا جائے لیکن عملی طور پر ہر معاملے میں ان کے ساتھ ''یس سر'' والا ماحول بن جاتا ہے۔

سلمیٰ جعفر کا کہنا ہے کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسائل کیا ہیں۔ کیونکہ ہر صوبے اور علاقے کی عورتیں مختلف مسائل سے دو چار ہیں۔ پہلے ان مسائل کا باقاعدہ مطالعہ کیا جانا چاہئے۔ پھر کسی منصوبے کی تشکیل اور لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے ترجیحی بنیاد پر ان مسائل پر توجہ دی جانی چاہئے جو سب سے زیادہ سنگین ہوں۔

''لیکن''، سلمیٰ کہتی ہیں ''عورتوں کے مسائل کی نشاندہی کے بغیر پالیسی بنانا اور اسے زبردستی لاگو کرنا مناسب طرزِ عمل ہے۔''

سلمیٰ جعفر کا تعلق موسیٰ خیل کے پشتو قبیلے سے ہے۔ سلمیٰ کے والد بلوچستان کے ممتاز قانون دان اور سیاست دان تھے۔ سلمیٰ نے بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلی گئیں۔

سلمیٰ پیشے کے لحاظ سے تدریس کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترقیاتی منصوبے پر

MashalBooks.org

کام کرنے سے پہلے یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ بھی تھیں۔ لیکن اپنے علاقے کی عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرنے کی خواہش انہیں وہاں لے گئی جہاں جا کر احساس ہوا کہ ترقیاتی کاموں کے نام پر بہت سا روپیہ سیمیناروں اور ورکشاپس میں برباد کر دیا جاتا ہے اور غریب عورت کی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔

سلمٰی جعفر نام نہاد ترقیاتی کاموں سے دلبرداشتہ ہو کر یونیورسٹی میں واپس آ گئیں اور طالبات کے ساتھ ان کا رابطہ بحال ہو گیا۔ اس دوران انہوں نے ویمنز پولیٹیکل فورم قائم کیا۔ ان کے خیال میں عورتوں میں وقت کے ساتھ سیاسی شعور بڑھ رہا ہے۔ کوئٹہ میں کچھ خواتین مختلف سیاسی پارٹیوں کی رکن کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں اور یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ ویمنز پولیٹیکل فورم کا مقصد ان خواتین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے۔ وہ کسی بھی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ہوں علاقے کی عورتوں کی پسماندگی، ناخواندگی، صحت اور ماحولیاتی مسائل سب کی توجہ کے طلبگار ہیں۔

''عورت بہت مظلوم ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت کی عادی ہو چکی ہے۔ خاموش رہتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی اس خاموشی کو توڑا جائے۔ یہ زبان بندی اوپر سے مسلط کی گئی ہے جو پدر شاہی کے نظام کی ایک کڑی ہے۔ وہ اپنی مظلومیت میں سر چھپاتی ہے۔ ہمیں اسے خول سے باہر نکالنا ہے۔''

سلمٰی جعفر کا کہنا ہے ''این جی اوز کی کارکردگی کے بارے میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس لئے میں یونیورسٹی میں بطور ڈائریکٹر آف لبرل آرٹس کام کر رہی ہوں۔

''چونکہ مجھ پر گھر بار کی ذمہ داریاں نہیں ہیں اس لئے وقت تو ہے لیکن ایک روایت پسند خاتون خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے میں اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پاتی۔''

اس کے باوجود سلمٰی اپنی مصروفیت کے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے انگلش ٹیچرز کی تربیت اور زبان پر ان کے مکمل عبور کی خاطر فورم فار انگلش لینگویج ٹیچرز (FELT) بنائی۔

سلمٰی جعفر کا یونیورسٹی میں پڑھانا، عورتوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور انگلش کی ٹیچرز کی تربیت کرنا یہی ان کی زندگی کی پلاننگ ہے۔

’’ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اس لئے کہ بہت سی دوستوں کی شادیاں ٹوٹ گئیں۔ ہمارے خاندان میں صرف ’’اچھی‘‘ عورتوں کی شادیاں کامیاب ہیں۔ میں شاید اتنی اچھی نہیں ہوسکتی۔‘‘

MashalBooks.org

# مسرت ہلالی

''خواتین کے حقوق کی تنظیمیں اور ملک کے باشعور شہری گزشتہ کئی برسوں سے مارشل لا کے دور میں وضع کیے گئے عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ فوجی حکومت کے بعد جمہوریت بحال ہوگئی ہے۔ ہر آنے والی حکومت نے ان قوانین کو ختم کرنے کے وعدے کیے ہیں۔ لیکن یہ سب اس وقت کے دلاسے ہوتے ہیں جب کوئی سیاسی پارٹی حزب اختلاف میں ہوتی ہے۔ اقتدار میں آتے ہی یہ باتیں مصلحتوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب ہم کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر اپنے ملک میں عورتوں کی ترقی کی بات کر رہے ہوتے ہیں اور یہ سوال آتا ہے کہ پھر آپ کے ہاں عورت آدھی کیوں ہے تو اس وقت ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے سر پر پانی کی بالٹی انڈیل دی ہو۔''

مسرت ہلالی پیشے کے اعتبار سے ایڈووکیٹ ہیں۔ وہ ویمنز ایکشن فورم اور پاکستانی انسانی حقوق کمیشن کی سرگرم رکن ہیں۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی روایت پسند پسماندہ علاقے کی پیدائش، کسی بڑے شہر میں تعلیم، اعلیٰ تعلیم بیرون ملک، رہائش کسی بڑے شہر میں اس سیٹ اپ میں منظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا گرد و پیش بدلتا ہے۔ لیکن مسرت کی زندگی میں منظر نہیں بدلتے، ماحول نہیں بدلتا۔ زندگی ساتھ گزارنے والے لوگ وہی رہتے ہیں۔ ان کے وہی تقاضے ہیں، وہی پابندیاں، وہی مصلحت پسندی ہے۔ مسرت کی فرماں برداری اور رشتوں کے لحاظ اور رواداری میں فرق نہیں آتا لیکن وہ اپنے آپ میں خود مختار ہوتی ہے اور انہوں نے ایک کامیاب کارکن عورت کی حیثیت سے اپنی پہچان کروائی۔ ایک سیاسی اور انسانی حقوق کی

MashalBooks.org

ایکٹوسٹ کے طور پر شہر بھر میں جانی گئیں۔

مسرت کا تعلق ایک روایت پسند پٹھان گھرانے سے ہے۔ بقول ان کے گھر کا ماحول ابھی تک دیہاتی ہے۔ وہ یاد کرتی ہیں:

''میرے والد تحریک آزادی کے کارکن تھے۔ انہوں نے باچا خان کے ساتھ بھی کام کیا۔ وہ ایک ممتاز صحافی اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے اخبار پالیسی انگریزوں کے خاف ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اخبار اور پریس مضبوط ہو جاتے اور والد جیل چلے جاتے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً 9 برس جیل میں کاٹے۔ شاید میری زندگی پر انہی کی چھاپ ہے۔ انہی سے مجھے اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کے لئے، معاشرے کے مظلوم طبقوں کی بہتری کے لئے کام کرنے کی تحریک ملی۔

مسرت ایک مصروف وکیل ہونے کے لئے مختلف تنظیموں کے ساتھ کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ پشاور میں سرگرم عمل این جی اوز کے کردار سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں بہت سی شہری تنظیمیں دیہی عورتوں کی ترقی کے نام پر پیسہ کما رہی ہیں۔ دیہی عورتوں کے لئے اور ان کے گرد کھینچے ہوئے قبائلی قوانین کے سنگلاخ دائروں کو توڑنے کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا۔

''فاٹا اور پاٹا کے علاقوں میں شادی سے پہلے اب بھی عورت کا بھاؤ لگایا جاتا ہے۔ لڑکے والے وہ رقم لڑکی کے والدین کو نکاح سے پہلے ادا کرتے ہیں۔ پھر وہ لڑکی کے ساتھ مویشی کا سا سلوک کرتے ہیں۔'' مسرت کہتی ہیں:

''گھریلو تشدد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، جس کے کئی عوامل ہیں۔ افغان جنگ اور مہاجرین نے علاقے کی اقتصادی حالت پر دور رس منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ بیروزگاری، منشیات کا کاروبار اور استعمال، ہتھیاروں کی سہل دستیابی، ان حالات میں مرد عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس پر تشدد کرتا ہے۔ ایک بار میرے پاس ایسی عورت آئی جس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ بس شہ رگ بچ گئی تھی۔ زخم کاری تھا۔''

مسرت کا کہنا ہے کہ گزشتہ حکومت نے عورتوں کے پولیس سٹیشن اور فیملی کورٹس قائم کئے اور اس کارنامے پر انہیں بہت فخر تھا لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ اس اقدام سے عورت کا مقدر نہیں بدلا۔ قبائلی علاقوں میں خلع کے ایک کیس کا فیصلہ 20 سال میں دیا

گیا۔عورتوں کے پولیس سٹیشن نے ایک پولیس کانسٹیبل کے خلاف، جس نے اپنی بیوی کے ساتھ زیادتی کی تھی، ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ ایسے لوگوں کو بڑے افسروں اور سیاستدانوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔

مسرت کے والد روشن خیال تھے۔مسرت نے تعلیم مکمل کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا چاہا تو ماں کو اعتراض نہیں تھا لیکن............

’’میں اپنے گھر میں چھٹی بیٹی ہوں۔ایک بھائی ہے۔ ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ بھائی کی پرورش پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ جیسے بیٹیاں کوئی دوسری مخلوق ہیں۔ یہ احساس عمر بھر ساتھ رہا حالانکہ میرے کاموں اور سرگرمیوں کی بنا پر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے دس مردوں کو مار کر یہ ایک عورت پیدا کی ہے۔‘‘ یہ محض مذاق ہے، ورنہ آج بھی میں وہ کچھ نہیں کر سکتی جو کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

اپنی کامیابیوں کے بارے میں مسرت کہتی ہیں ’’ایک بار ایک کیس کے بارے میں میں نے پٹیشن دائر کی جس کے عدالتی فیصلے پر 500 قیدیوں کو جیل سے رہائی ملی۔ ابھی تک ان قیدیوں کے شکریے کے خط آتے ہیں۔ یہ ایک انسانی حقوق کا معاملہ تھا۔ یہ میری کامیابی تھی۔‘‘

مسرت نے شادی نہیں کی ’’یہ کام گھر والوں کا ہے۔ میں نے خود اپنا بر تلاش نہیں کیا۔ البتہ شادی کے لئے میری شرائط تھیں کہ وہ ایماندار ہو، عورت کی عزت کرتا ہو اور مجھے کام کرنے سے نہ روکے۔‘‘ شاید ایسا آدمی انہیں نہیں ملا۔

MashalBooks.org

# ناہیدہ صفدر

مختلف اقتصادی طبقوں، معیار تعلیم اور مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے، ورکشاپ کے شرکا کی متفقہ رائے تھی کہ بلوچستان کی موجودہ معاشرتی اور اقتصادی صورت حال میں یہاں کی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ پسی ہوئی ہیں۔ ثقافتی پابندیوں، قبائلی اور جاگیرداری روایتوں، وسائل پر پدری تسلط کی بنا پر وسائل تک رسائی میں درپیش دشواریاں بلوچستان کی عورتوں کی پسماندگی کے اہم اسباب ہیں۔

ناہیدہ کوئٹہ میں منعقد ہونے والی جینڈر ورکشاپ میں چند مرد حضرات کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ''ہم نے جب عورتوں کی ترقی اور عملی زندگی میں ان کے کردار کو موثر بنانے کی بات کی تو بہت سے اعلیٰ سرکاری افسروں کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ ایک طرف تو وہ ہم سے اتفاق کرتے ہیں کہ صوبے کی پسماندگی کو دور کرنے اور اس کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے ہر شعبہ زندگی میں عورتوں کی شرکت ضروری ہے، لیکن اس طرح کہ مرد کی بلادستی برقرار رہے۔

ہم نے ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا بلکہ یہ فیصلہ کرنا ضروری سمجھا کہ آئندہ کسی پلیٹ فارم سے، کسی موقع پر مرد وعورت کے مساوی حقوق کی بات کریں تو سرکاری افسروں کی سوچ تبدیل کرنے کے لئے کسی قسم کی براہ راست کوشش نہ کی جائے۔ یہ احتیاط اس لئے ضروری تھی کہ ہم جب عورت کی ترقی کی بات کرتے ہیں تو یہاں کا مرد لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے جس سے پورا ماحول مکدر ہو جاتا ہے۔ رویوں میں مثبت تبدیلی ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے۔

''ہم نے عملی طور پر اور تربیتی ورکشاپس میں بلوچستان کے دور افتادہ علاقوں کی

عورتوں سے بات کی تو یہ معلوم ہوا کہ کچھ عورتیں ان موقعوں پر کھل کر بات کرتی ہیں بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اب تک کسی نے ان کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ وہ اس موقع پر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہیں۔ بعض عورتوں کا ردعمل اور تاثر یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ہم سب کے درمیان آ کر کھو سی گئی ہوں۔ انہیں بار بار حاضر ہونے کی تاکید پڑتی ہے۔''

''ہمارے ہاں کی سادہ لوح عورتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ صوبے کی ترقی میں بھلا وہ کیا کر سکتی ہیں۔ کیونکہ آنکھ کھولتے ہی ان سے یہی توقع کی گئی اور یہی فرائض ان پر عائد کئے گئے کہ ان کا کام گھر کی دیواروں کے اندر رہ کر گرہستی سنبھالنا اور بچوں کی پرورش کرنا ہے۔ صوبے کی ترقی تو مرد کا کام ہے۔ بھلا عورتیں سڑکیں کیسے بنا سکتی ہیں۔

ناہیدہ نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے اور بلوچستان یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا اور پھر کوئٹہ ٹیلی ویژن کے ساتھ منسلک ہوگئیں۔ اس دوران انہوں نے بطور پروڈیوسر مختلف مقامی زبانوں میں بچوں اور عورتوں کے لئے پروگرام کئے۔ چودہ برس تک وہاں کام کیا مگر ترقی نہیں ہوئی۔

''ٹیلی ویژن پر میری وجہ سے، یعنی ایک عورت پروڈیوسر ہونے کی حیثیت سے لڑکیوں اور عورتوں کی ٹی وی تک رسائی آسان ہوگئی تھی اور جب میں نے ٹی وی کی ملازمت سے کنارہ کشی کی تو بہت سے لوگوں نے پروگرام میں جانے کے لئے اپنی عورتوں کو روک دیا۔'' ناہیدہ کو یاد ہے'' کچھ عرصہ قبل ایک مالیاتی ادارے نے ایک ڈچ خاتون کو دو سال کے لئے کوئٹہ میں بطور ایڈوائزر متعین کیا۔ اس کے ماتحت مردوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ مگر وہ ہمت نہیں ہاری میں چونکہ اس سے بہت قریب تھی لہٰذا میں نے بہت کچھ سیکھا کہ مردوں کو کس طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانے کے کیا طریقے ہیں۔''

ناہیدہ کہتی ہیں کہ'' کوئٹہ میں برسوں کام کرنے کے بعد ایک مثبت تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب پالیسیوں میں عورتوں اور بچوں کے معاملات کو شامل کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی ترقی سے یہ مراد نہیں کہ مردوں کو نظر انداز کیا جائے جس سے وہ خواہ مخواہ حریف بن جاتے ہیں۔ ضروری یہ ہے کہ لائحہ عمل میں مرد بدستور شامل رہیں۔ وہ اسی طرح عورت کی اہمیت کو تسلیم

MashalBooks.org

کریں گے اور مل کر کام کرنا سیکھیں گے۔

ناہیدہ وِڈ (WID) کے ایملان پراجیکٹ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایسوسی ایشن آف بزنس، پروفیشنل اور ایگری کلچرل ویمن بلوچستان کی چیئر پرسن بھی ہیں۔

ناہیدہ نے 1995ء میں ساؤتھ ایشیا پارٹنر شپ کے زیر اہتمام کولمبو (سری لنکا) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں اپنی ایسوسی ایشن کے بارے میں تفصیل سے یہ ذکر کیا کہ پاکستان کے روایت پسند اور پسماندہ معاشرے میں ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں عورت کی قوت کو بتدریج تسلیم کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف غیر سرکاری ادارے بلوچستان کے دیہاتوں اور کلیوں میں عورتوں کو آمدنی بڑھانے کی تکنیکی تربیت اور چھوٹے کاروبار کرنے کے لئے قرضے فراہم کر کے انہیں خودکفیل بننے کی ترغیبات دیتے ہیں اور اس کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔

ناہیدہ جو بنیادی طور پر ایک تربیت یافتہ استاد ہیں، ان کا ایک کمال مولانا صاحب سے اجازت لے کر ایک مذہبی مدرسے میں پرائمری سکول کا قیام ہے۔ اس سکول میں 85 کے قریب بچے ہیں جو اب چوتھی جماعت تک پہنچ گئے ہیں۔

ناہیدہ کو اپنی ذات سے نکل کر، اپنے مفاد سے قطع نظر، دوسروں کی بہتری کے لئے اپنا وقت نکالنے کی تحریک والدہ سے ملی، جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آنے والوں کی آبادکاری کے لئے بہت محنت کی تھی۔ ناہیدہ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر سرگرمیوں کے لئے شوہر کے تعاون کا اعتراف کرتی ہیں لیکن شاید چند برس پہلے صورت حال اتنی خوش آئند نہ تھی۔ یہ ناہیدہ کی کامیابی ہے۔

MashalBooks.org

# فرخندہ اورنگزیب

جھولے میں آج ایک اور بچہ بلک رہا تھا۔ اسے اٹھایا، سینے سے لگایا۔ ٹھنڈی دنیا میں ہاتھوں کی نرمی، ممتا کی گرمی، وہ ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ اس کی معصوم نظروں میں کئی سوال تھے: میں کہاں آ گیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا؟

فرخندہ اورنگزیب نے ہمیشہ کی طرح اسے بچے کو نہلایا، صاف ستھرے کپڑوں میں لپیٹا، دودھ دیا، اسے چمکارا ''تم محفوظ ہو۔ اب تم ہماری ذمہ داری ہو۔ معاشرتی مجبوریوں نے تم سے ممتاز کی جو گود چھین لی ہے وہ کہیں نہ کہیں تمہیں ضرور مل جائے گی۔''

بھلا کیا عمریں ہوں گی ان بچوں؟ پانچ سے دس سال تک۔ غربت نے ان کے کندھوں پر خالی تھیلے اور بوریاں لٹکا دیں۔ یہ تھیلے شاید کبھی بھی کتابوں کے بستے نہ بن سکیں۔ یہ بچے کھیل کے میدانوں میں فٹ بال یا کرکٹ کھیلنے کے بجائے کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں سے کھیلتے ہیں اور اپنے گول بناتے ہیں۔ کون جیتا؟ کس نے غلاظت کے ڈھیروں میں سے کاغذوں کے ٹکڑے، کپڑے کے چیتھڑے، کانچ اور ٹین کے خالی ڈبے زیادہ چنے؟ جس کا تھیلا زیادہ بھرا ہوا ہوگا، اسی کو زیادہ اجرت ملے گی۔ یہ سارے کے سارے بچے شام کو ریزگاری اپنی ماؤں کے ہاتھ میں رکھ دیں گے۔ آٹا خریدنے کے لئے۔

فرخندہ نے ان بچوں کے ہاتھوں کو دستانوں سے ڈھانپ دیا کہ غلاظت کے جراثیم ان کے جسم کو بیمار نہ کر دیں۔ انہیں ناشتہ کروا دیا۔ صبح صبح پیٹ کو سہارا مل جائے تو وہ زیادہ مشقت کر سکیں گے۔ بچوں کی مشقت............ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ تیسری دنیا میں یہ محنت کش بچے کیوں ............؟ یہ سوال ہوا میں معلق ہے۔

کوئٹہ میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی شاخ کھلی تو اس میں شرکت کی

MashalBooks.org

پیشکش ہوئی۔ پتھریلے پہاڑوں، کھردرے مزاجوں اور پتھریلی روایتوں کا بنا ہوا علاقہ۔ وہاں انسانی حقوق کی بات کی جائے یا گھریلو تشدد کے خلاف آواز اٹھائی جائے، بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ایسا ہر کام شروع شروع میں مشکل معلوم ہوتا ہے مگر کسی کو تو سنگلاخ چٹانوں میں راستہ بنانا ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر، اسی ارادے سے فرخندہ نے انسانی حقوق کمیشن میں شمولیت حاصل کر لی۔

فرخندہ اورنگ زیب ان لوگوں میں سے ہیں جو مختلف اور نسبتاً روشن ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔ ان کی سوچ میں کشادگی اور ارادوں میں پختگی ہوتی ہے۔ پھر وہ اگر نسبتاً پابند اور روایت پسند ماحول میں بسیں تو شعوری اور لاشعوری طور پر مثبت تبدیلی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ ویسے بھی مقامی پابندیاں اور رکاوٹیں ان پر عائد نہیں ہوتیں کہ ''وہ ہمارے قبیلے کی عزت و ناموس ہیں، ہمارے مہمان ہیں، انہیں عزت دو۔''

فرخندہ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ وہ سنہ 1981ء سے بلوچستان یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ ہیں اور انگلش ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ نیز لا کالج کوئٹہ میں اعزازی لیکچرار بھی ہیں۔ انہوں نے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی ایون سٹان، الی نوائے امریکہ سے ایک مختصر تربیتی کورس بھی پاس کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئٹہ اور اس کے نواح میں بہت سے ترقیاتی ادارے سرگرم عمل ہیں اور انہوں نے مقامی آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے نمایاں اقدام کئے ہیں۔ لیکن جب بلوچستان یونیورسٹی میں ویمنز اسٹڈیز سینٹر کے قیام کے بعد عورتوں کی ترقی کے حوالے سے تجزیہ کیا گیا تو یہ ظاہر ہوا کہ ان کاموں میں بہتری کی خاصی گنجائش ہے۔ اس کے پیش نظر بلوچستان کے تمام چھ اضلاع میں تحقیق کے لئے پراجیکٹ مرتب کئے گئے ہیں جن کا بنیادی مقصد یہ جاننا ہے کہ عورتوں کو کس قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ عورتوں کی اقتصادی قوت بڑھانے کے لئے کون سے اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ انہیں کون کون سی سہولتیں اور مواقع فراہم کئے جائیں؟ اس مطالعے کے بعد ترقیاتی ترجیحات کا تعین اور عملی کام کے لئے حکمت عملی کی سفارشات کی جائیں گی۔ اس سے ان تنظیموں اور اداروں کی رہنمائی بھی ہو سکے گی جو پہلے ہی سے برسرپیکار ہیں۔

MashalBooks.org

فرخندہ اورنگزیب بلوچستان یونیورسٹی ویمنز سٹڈیز سینٹر کی ڈائریکٹر ہیں اس لئے اس کے تحت جاری پراجیکٹس کی نگرانی کے علاوہ انسانی حقوق ایکٹوسٹ کے طور پر کوئٹہ جیل میں عورتوں کی حالت کی بہتری کے لئے بھی مصروف ہیں۔ وہ ایدھی ہوم کوئٹہ کی انچارج، انرو ہیل کلب کوئٹہ کی وائس پریذیڈنٹ ہونے کے علاوہ اپوا کے ساتھ بھی مختلف حیثیتوں میں کام کرتی ہیں۔

فرخندہ اورنگزیب متعدد ایشیائی ممالک میں عورت کے حوالے سے منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور ورکشاپس میں شرکت کر چکی ہیں۔ انہوں نے تشدد اور غیرانسانی سزا، بچوں کی مشقت اور قومی ترقی میں عورت کا کردار اور بلوچستان میں براہوئی علاقوں کی اہمیت کے موضوعات پر تحقیق کی اور مقالات پیش کیے۔

فرخندہ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ انہیں تمام تر سرگرمیوں کے لئے اپنے شوہر کا بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی میسر ہے۔ کہتی ہیں ''میں اکثر کانفرنسوں میں اپنے بچوں کو ہمراہ لے کر جاتی ہوں تا کہ ان میں اپنے ملکی مسائل کے بارے میں شعور پیدا ہو اور ان کی ذہنی تربیت ہو سکے۔

# پروین سکندر

ہماری تنظیم کوئٹہ کے قریب کلی رجب میں کچھ ترقیاتی کام کرنا چاہتی تھی۔ ہمارا مقصد تھا کہ ہم اس علاقے کی عورتوں کو اپنے ساتھ ملائیں تا کہ مقامی سطح پر ہنرمندی کی تربیت، عورتوں کو اقتصادی طور پر خودمختار کرنے، سکول کا قیام اور دیگر ایسے کاموں کے لئے ان کا تعاون حاصل کرسکیں۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو مقامی مردوں نے برابر برابر قطار میں کھڑے ہوکر دیوار بنالی کہ آپ کس طرح اندر جاکر ہماری عورتوں سے مل سکتی ہیں۔

پروین سکندر کا کہنا ہے کہ ''گزشتہ کئی برسوں سے فیلڈ میں کام کرنے کا ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بلوچستان کی عورت کام کرنا چاہتی ہے۔ اس میں صلاحیت بھی ہے اور شوق بھی۔ وہ اپنے گرد کھینچی ہوئی روایتوں کی فرسودہ دیواروں کو توڑ کر عملی زندگی میں قدم رکھنے کی خواہش مند ہے۔ لیکن ان کے مرد حائل ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ میڈیا اور این جی اوز کی کوششوں سے عورتیں اب باشعور ہوگئی ہیں۔ سماجی ڈھانچے میں یہ تبدیلی سست رفتار ضرور ہے لیکن صورت حال بتدریج تبدیل ہو رہی ہے۔ ایسی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں کہ عورتوں نے خود فیصلے کئے۔ مردوں کی مخالفت کا مقابلہ کیا اور اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔

''ایک اور کلی نیو نچاری میں جب ہم نے چھ برس پہلے کام شروع کیا تو اس وقت وہاں کی آبادی چودہ ہزار تھی۔ اب بیس ہزار ہوگئی ہے۔ چھ سال قبل وہاں کوئی سکول نہیں تھا۔ مگر ہم نے جو سکول قائم کیا تھا اس میں 185 لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ پرائمری سکول مکمل ہوگیا ہے۔ اب کچھ بچیاں چھٹی کلاس میں جائیں گی۔ نیز اسی کلی میں عنقریب ایک چھوٹی فیکٹری لگائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل ہم عورتوں کو انٹر پرنیور کی تربیت دلوا چکے ہیں۔ اس فیکٹری میں کون مہندی، دھاگہ، الاسٹک وغیرہ بنانے کی مشینیں لگائی

جائیں گی۔ اس فیکٹری میں تربیت یافتہ عورتیں کام کریں گی اور برسر روزگار ہو جائیں گی۔

اسی طرح علاقے کی دیگر کلیوں میں ہمارے ترقیاتی منصوبے جاری ہیں جن میں سے کچھ مکمل ہو چکے ہیں۔ مثلاً کلی عالم خان میں ایک میٹرنٹی ہوم قائم کیا ہے۔ کلی بنگلزئی میں یتیم بچوں کا ہوسٹل ہے۔ یہ بنیادی طور پر مدرسہ الاشرافیہ نے قائم کیا تھا۔ اس میں بچوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم نے اسی سکول میں پرائمری تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ کلی کوتوال میں ہم نے ایک خاندان کے تعاون سے ایک کمرہ حاصل کر لیا ہے۔ یہاں بالغوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کلی میں پڑھی لکھی لڑکیوں کی تعداد خاصی ہے۔ لہٰذا وہاں ایک لائبریری بھی قائم کر دی ہے۔ عنقریب ہیلتھ سنٹر کھولنے والے ہیں۔

پروین سکندر ایک بڑے فوجی افسر کی بیوی تھیں۔ زندگی گھر اور فوجی کالونیوں میں لیڈیز کلب کی کافی پارٹیوں اور دیگر سرگرمیوں میں خاصی مصروف تھی۔ کچھ محدود فلاحی کام بھی ہو جاتے تھے۔ مگر بقول ان کے ''میں نہ گھر سے نکلتی تھی اور نہ شوہر کے بغیر کہیں جانے کی عادت تھی۔'' شوہر کی اچانک موت کے بعد زندگی بے مقصد نظر آنے لگی۔ لگتا تھا جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے۔ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی تھی۔ اس دوران ان کا رابطہ چند تنظیموں اور انجمنوں سے ہوا۔ یہی وہ دن تھے جب ترقیاتی کاموں کے لئے ان کے رجحان کا احیا ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کامیابیوں نے جینے کا بہانہ فراہم کیا۔ سوچ کا رنگ تبدیل ہوا۔ عملی زندگی میں بہاؤ آ گیا۔ پروین سکندر نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنا مدعا دوسروں تک پہنچایا کہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لئے عورتیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کی شمولیت کے بغیر ترقی اور خوشحالی کا حصول محض ایک خواہش ہی ہو سکتی ہے۔

خواتین منظم ہو کر ایک دوسرے کی مشکلات، مسائل اور وسائل تک رسائی پر تبادلہ خیال کریں تو روایتی گھرانوں کی گھٹن ایک آزاد فضا میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

عورتیں اپنے شوہروں کی مدد حاصل کر کے ماحول کی آلودگی کے خلاف عملی اقدامات کر سکتی ہیں۔

وقت کا تقاضا ہے کہ کمیونٹی کے لئے کام کیا جائے تا کہ ذہنی بالیدگی اور شعور کی بیداری ہو۔ اس کے لئے ثابت قدمی اور محنت کی ضرورت ہے تا کہ ہر شخص اپنی اہمیت جان کر بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔

ایسے کاموں کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب دو سے زیادہ افراد اکٹھے ہوتے ہیں ان کے درمیان ایک تعلق قائم ہوتا ہے۔ ان کا نصب العین مشترک ہوتا ہے کیونکہ ان کی سماجی اور اقتصادی حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔ آبادی کے کمزور طبقوں کی بہتری کے لئے انفرادی عمل خاطر خواہ نتائج نہیں پیدا کرتا۔ ترقیاتی کوششوں کی کامیابی کے لئے کمیونٹی کے ارکان کا اکٹھا ہونا لازمی ہے۔

پروین سکندر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز 1979ء میں بلوچستان کے ایک ویمن ڈیویلپمنٹ پراجیکٹ سے کیا۔ سنہ 91ء سے انجمن تجارت و ملازمت و زراعت پیشہ خواتین کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس دوران انہوں نے ساؤتھ ایشیا انٹرن شپ میں بھی کام کیا۔ اس کے تحت بلوچستان بھر میں سروے کیا گیا کہ نچلی سطح پر کون کون سے ترقیاتی ادارے سرگرم عمل ہیں۔

پروین کی تعلیم بی۔اے ہے۔ انہوں نے ٹیکساس (امریکہ) انٹرنیشنل لیڈیز گروپ کی میٹنگ میں ''پاکستانی ثقافت اور عورتیں'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ساؤتھ ایشیا پارٹنر شپ کے تحت ڈھاکہ اور کولمبو میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ پروین سکندر کے دو بچے ہیں۔

MashalBooks.org

# بشریٰ گوہر

کالام میں غیر رسمی سکولوں کے قیام اور دیہی ترقی کے منصوبوں کے مقامی آبادی، خصوصاً عورتوں پر اثرات، ہزارہ ڈویژن میں ماحولیاتی بہتری کے پروگراموں کا تجزیہ، صوبہ سرحد میں افغان مہاجرین کی بستیوں میں روزگار کے وسیلے، روایت پسند علاقوں میں تبدیلی کے لئے دیہی عورتوں کا کردار، چارسدہ میں سماجی و اقتصادی صورت حال اور ترقیاتی پروگراموں کے اثرات۔

بشریٰ گوہر اپنے صوبہ سرحد میں مقامی تنظیموں، غیر ملکی مالیاتی اداروں اور سرکاری محکموں کے مابین ایک رابطے کا نام ہے۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے مختلف منصوبوں کے سلسلے میں تحقیق و مطالعہ میں مصروف ہیں۔

بشریٰ کا تعلق صوبہ سرحد کے ایک علاقے صوابی کے جاگیردار گھرانے سے ہے۔ انہوں نے جب ہوم اکنامکس بی ایس سی کے بعد پڑھنا چاہا تو والد نے سختی سے منع کر دیا۔ بشریٰ نے ہار نہیں مانی اور اپنے ارادہ پر ڈٹی رہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ "اس دوران مجھے ایک امریکی سکالر شپ مل گیا۔ اس وقت تک میں نے طے کر لیا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ میں نے کیا کرنا ہے۔ والد کا اصرار تھا کہ وہ میری تعلیم بند کر کے اپنی مرضی سے میرا راشتہ طے کر دیں لیکن وہ ڈیمنگٹن کالج ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں ایم ایس سی کرنے کے لئے امریکہ چلی گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے لاس اینجلس میں ڈول فوڈ کمپنی میں انٹرن شپ کی۔

"میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھی لیکن گھریلو حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے واپس آنا پڑا۔"

امریکہ روانگی سے قبل مختلف ترقیاتی اداروں کے ساتھ منسلک رہیں۔ اس دوران

انہیں مردوں کے روایتی رویوں سے دو چار ہونا پڑا۔بعض اوقات یہ بات بہت ناپسند ہوتی تھی کہ ایک عورت جو بے شک ان سے زیادہ قابل اور زیادہ پڑھی لکھی ہے ٹیم کی لیڈر بنے۔ اس لئے وہ اس کے خلاف مختلف سازشیں تیار کرنے لگتے ہیں۔ اپنے کام کے آغاز میں جب انہیں مختلف منصوبوں کے دوران اس نوعیت کی مخالفتوں سے دو چار ہونا پڑتا تو وہ اسے ترک کر دیتیں۔

بیرون ملک سے پڑھ کر اپنے علاقے میں واپس آ کر کام کرنے کے بارے میں بشریٰ کا کہنا ہے کہ ''باہر سے پڑھ کر آئیں تو وہ تعلیم یہاں کام نہیں دیتی لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خود اعتمادی بڑھ گئی۔ یہ شعور بھی ہوا کہ حکومتی پالیسیاں کس طرح عام لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ہماری بنیاد نچلی سطح کے افراد ہیں وہی لوگ ہمارے وسائل ہیں۔ ہمارے ہاں نت ایک پالیسی بنتی ہے جو عموماً عوام کے حق میں نہیں ہوتی۔ ہر آنے والی حکومت عوام کی بھلائی کے نعرے لگاتی ہے۔ ملک کی معاشی حالت بہتر بنانے کے دعوے کرتی ہے لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کیا جاتا ہے اس سے عام شخص کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ہمارا کام پالیسی سازوں کو عوام کے بارے میں معلومات فراہم کرنا بھی ہے۔''

''صوبہ سرحد میں افغان جنگ کے دوران بہت سے غیر ملکی امدادی ادارے سرگرم عمل رہے۔ انہیں اپنے منصوبوں اور پروگراموں کے لئے مقامی لوگ درکار تھے۔ ان میں عورتوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی۔ اس سے عام تنگ نظری میں مثبت تبدیلی آئی اور عورتوں کے لئے کام کرنا قدرے سہل ہو گیا۔

بشریٰ اعتراف کرتی ہیں کہ ''اطراف کا ماحول پرسکون اور اطمینان بخش ہے جس سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور مزید کام کرنے اور ترقیاتی منصوبوں کو جاری رکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں کے لئے کوئی باقاعدہ سپورٹ سسٹم نہیں ہے۔ اب صوبے میں بہت سی تنظیمیں برسرِ پیکار ہیں۔ ان میں عورتیں ہی سربراہ بھی ہیں اور کارکن بھی لیکن عورتیں جو کچھ کر رہی ہیں اپنے زور پر کر رہی ہیں۔

بشریٰ گوہر ہیومن ادارہ ریسورس مینجمنٹ اینڈ ڈیولپمنٹ سینٹر (HRMDC) کی ڈائریکٹر ہیں۔ انہوں نے یہ ادارہ 1966ء میں قائم کیا۔ اس کا بنیادی مقصد مقامی عورتوں

اور مردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے تا کہ وہ ترقیاتی پروگراموں میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس مقصد کیلئے انہیں تربیت دی جاتی ہے۔

''ہمارا بنیادی مقصد مسائل کو اٹھانا اور پھر ان کے حل کے لئے ماڈل تیار کرنا ہے۔ مثلاً ہمارا ایک پراجیکٹ شہری کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔ اس میں ہم نے گھریلو عورتوں کو ملوث کیا۔ پشاور کے پسماندہ علاقوں کے تقریباً 100 گھر شامل ہیں۔ گھریلو کچرے کو ہفتے میں تین بار اکٹھا کر کے کمپوزیٹنگ کے لئے لے جاتا ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی کے اس مرکز کے تحت عورتوں کو چھوٹے کاروبار کے لئے تربیت اور کمیونٹی سکولوں کے قیام کے علاوہ ترقیاتی منصوبوں میں پشاور میں مزدور بچوں پر تحقیق شامل ہے۔ صوبہ سرحد میں یہ ایک عام روش ہے کہ بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی رجسٹریشن نہیں کروائی جاتی۔ اس ضمن میں ایک وسیع سروے کیا گیا اور رپورٹ تیار کی گئی۔

بشریٰ گوہر اپنے علاقے کی عورتوں کو متحرک کرنے اور انہیں مختلف منصوبوں میں شامل کرنے کو ترجیح ضرور دیتی ہیں لیکن وہ اس سے بھی اتفاق کرتی ہیں کہ ہر منصوبے کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ مردوں کو بھی اس کام میں شامل کیا جائے'' مثلاً ہم نے ٹانک میں ایک سکول بنایا۔ یہ ایک بہت پسماندہ علاقہ ہے۔ ہم نے اس کام میں مردوں کو شامل کیا تو کامیابی آسان ہوگئی۔

بشریٰ نے شادی نہیں کی۔ ''ہم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہاں یہ ایک روایت تھی کہ لڑکی کی شادی والدین کی پسند سے ہوگی۔ اگر میں اس وقت باپ کی بات مان لیتی تو میری شادی بھی ہو جاتی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں سیاسی شادیاں ہوتی ہیں۔ ایک جاگیردار کے لڑکے کی شادی دوسرے جاگیردار کی لڑکی کے ساتھ یا ایک سیاسی گھرانے کی لڑکی کی شادی دوسرے سیاسی گھرانے کے لڑکے کے ساتھ۔ میں اس نوعیت کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ شوہر مجھے میرے باپ کی طرح اپنے کنٹرول میں رکھے۔ ویسے بھی ہمارے علاقے میں مرد پڑھی لکھی لڑکیوں سے شادی کرنے سے گھبراتے ہیں اور پھر یہ بات تو کسی طرح قابل برداشت نہیں کہ لڑکی اپنی پسند سے شادی کر لے۔

# فرحت پروین

مزدور تحریک میں عورتوں کے کردار کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور کارکن خواتین کو اعداد و شمار میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پائلر (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ) کے ایک سروے کے مطابق بیشتر خواتین یہ بھی نہیں جانتیں کہ ٹریڈ یونین کیا ہے اور ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔

فرحت پروین کا کہنا ہے کہ ''ایک تحقیق کے مطابق 96 فیکٹریوں میں سے صرف دس فیکٹریوں میں ٹریڈ یونین تھی لیکن ان فیکٹریوں کی ٹریڈ یونین کے ڈھانچے میں عورتیں کہیں نظر نہیں آئیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ٹریڈ یونین تحریک میں کارکن عورتوں کو موثر نمائندگی دینے کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کے پروگرام بنائے جائیں۔

فرحت پروین گزشتہ ایک دہائی سے پائلر کے ساتھ منسلک ہیں۔ پائلر مزدور طبقے میں ایک مقبول نام ہے۔ اس ادارے نے عملی طور پر، تحقیق کے وسیلے سے اور مزدوروں کے لئے تربیتی پروگراموں کے ذریعے مزدوروں میں ان کے حقوق کا شعور پیدا کرنے کے علاوہ اپنی اشاعتوں کے ذریعے عام لوگوں اور مزدوروں کے مسائل نیز پاکستان کے صنعتی شعبے میں کام کرنے والوں کے بارے میں آگہی پیدا کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔

فرحت نے 1988ء میں بی۔اے کے فوراً بعد کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں تین ماہ کے ایک پراجیکٹ پر کام کیا۔ اس میں ملازمت کی ناموزونیت، فاضل تعداد اور قلت کے بارے میں سروے شامل تھا۔ دوسری بڑی اسائنمنٹ کراچی کی کیمیاوی صنعتوں میں مزدوروں کی صحت اور تحفظ کی صورت حال جانچنے کے لئے تحقیق تھی۔

فرحت نے جب اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تو ان کے والدین کے لئے یہ ایک

حیران کن بلکہ پریشان کن بات تھی کہ ایک جوان لڑکی مزدوروں کے گھر جائے اور ان کے ساتھ کام کرے۔ انہیں زیادہ تر یہ خیال ستاتا تھا کہ محلے والے اور رشتے دار کیا کہیں گے۔

فرحت کو کام کرتے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں لیکن بقول ان کے والدین کی سوچ میں نمایاں مثبت تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ البتہ خاندانی سطح پر رویوں میں یہ فرق پڑا ہے کہ جب فرحت نے گریجویشن کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا تو اس کی اجازت نہیں ملی تھی جبکہ اب ان کے خاندان کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھنے لگی ہیں۔

فرحت اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے ملازمت اختیار کی۔ ماں کو فکر تھی کہ یہ خودمختار ہوگئی تو کسی مرد کے ساتھ کیسے نباہ کرے گی۔ نیز انہیں یہ بھی پریشانی رہتی ہے کہ کہیں ان کی تصویر اخبار میں نہ چھپ جائے یا آواز ریڈیو پر نہ آ جائے۔

فرحت نے ان تمام رکاوٹوں کے باوجود نہ صرف اپنا کام جاری رکھا بلکہ انہوں نے 95-1994ء میں انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز ہیگ (نیدر لینڈ) سے ویمنز اینڈ ڈویلپمنٹ میں ایم۔اے کیا۔

فرحت کو مزدوروں کے ساتھ کام کرنے میں بہت لطف آتا ہے ''مجھ میں اور کارکن طبقے کے افراد میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ صرف تعلیم کا فرق ہے۔'' البتہ انہیں اس دوران جو تکلیف دہ مسئلہ درپیش رہا، وہ یہ کہ مردوں کے ساتھ انہیں برابری کا احساس نہیں ہوتا۔ مرد ہمہ وقت اپنی بالادستی، حاکمیت اور تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ مزدور مرد کو بھی عورت کے مقابلے میں زیادہ باصلاحیت قرار دیا جاتا ہے۔ جب کھڈیوں کی جگہ مشینوں نے لی تو عورتوں کو جننگ اور ویونگ کے شعبوں سے علیحدہ کر دیا گیا کہ وہ مشین نہیں چلاسکتیں۔ انہیں معاوضے بھی کم دیئے جاتے ہیں۔ نہ ہی انہیں سوشل سکیورٹی کے قانون کے تحت علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتیں لیبر فورس کا ایک اہم حصہ ہونے کے باوجود ٹریڈ یونین میں موثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تنظیم سازی میں عورتوں کی شمولیت میں ان کے خاندان، معاشرتی روایات اور ٹریڈ یونین کے مرد ارکان کی طرف سے ناپسندیدگی اور مخالفت آڑے آتی ہے۔

نیز 1988 ء کے بعد گزشتہ دس برسوں کے دوران یونین سازی کا عمل پرائیویٹائزیشن اور دیگر مزدور دشمن پالیسیوں کی وجہ سے سست ہوا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ پیداواری شعبے میں 72 سے 80 فیصد تک یہ کام انفارمل سیکٹر میں ہو رہا ہے۔ جبکہ 5 فیصد سے بھی کم مزدور منظّم ہیں۔

مزدوروں کے معاملات میں مسلسل دلچسپی، ان کی بھلائی کے لئے تحقیقی رپورٹس تیار کرنا فرحت کا فرض منصبی بھی ہے اور ان کا طرز زندگی بھی۔ انہوں نے جن منصوبوں پر کام کیا اور رپورٹس تیار کیں ان میں ٹیکسٹائل کے شعبے میں کنٹریکٹ مزدور اور کراچی کے فیکٹری کارکنوں اور گھریلو صنعت کے کارکنوں کا تقابلی جائزہ قابل ذکر ہے۔ وہ پاکستان ورکرز کنفیڈریشن کے عورتوں کے معاملات کی اعزازی سیکرٹری ہیں۔

انہیں تھیٹر سے گہری دلچسپی ہے۔ انہوں نے مزدوروں کے موضوع پر کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ فرحت نے شادی نہیں کی کہ کوئی ایسا مرد ہی نہ ملا جو ایک کارکن بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

MashalBooks.org

# شکیلہ عبدالقادر

''ہم نے جب اپنے علاقے کی بدحالی کو سنوارنے کے لئے کام کا آغاز کیا اور اس غرض کے لئے کمیونٹی سے رابطہ کیا تو گھر کے مرد کہتے تھے کہ یہ مردوں کے کام ہیں۔ اگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تو بھلا عورتیں سرکاری دفتروں میں کس طرح دھکے کھا سکتی ہیں۔ یہ سب ختم کرو۔ یہ کام ٹھیک نہیں ہیں۔ ویسے بھی یہاں زیادہ تر دہلی سوداگران کے خاندان رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں پردے کی سخت پابند ہیں۔ لہٰذا جب ہم ان کے پاس جاتے تو وہ دروازہ نہیں کھولتی تھیں۔ اندر سے آواز آتی ''ہمارے مرد کہیں گے تو ہم بات کریں گے'' ہم نے بمشکل ان سے درخواستوں پر دستخط کرائے کہ باقی کام ہم خود کرلیں گے۔ آپ علاقے کی نمائندگی کرتے ہوئے صرف دستخط کر دیں۔''

کراچی ویمنز ویلفیئر سوسائٹی (KAWWS) کی صدر شکیلہ عبدالقادر ماحولیاتی بہتری اور علاقے کے لوگوں کو بنیادی شہری سہولتیں فراہم کرنے کے ضمن میں عورتوں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

''ہمارے خلاف مولویوں نے فتویٰ دیا کہ یہ عورتیں جو کچھ کر رہی ہیں یہ نامناسب ہے۔ یہ مردوں کے کام ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ گھروں میں بیٹھیں۔ نیز مساجد سے اعلانات کئے گئے کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

کراچی ایڈمنسٹریشن ایمپلائز کوآپریٹو سوسائٹی کی عورتوں نے جن ناجائز کاموں کا آغاز کیا تھا ان میں ٹوٹی ہوئی سڑکوں کی مرمت، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر اٹھوانے، گندے نالے کے گرد دیوار بنوانے اور اندھیری گلیوں میں بجلی کی روشنیوں کا انتظام وغیرہ شامل تھا۔ ان ''خراب'' عورتوں میں شکیلہ عبدالقادر بھی شامل تھیں۔

MashalBooks.org

شکیلہ عبدالقادر کی تعلیم میٹرک ہے۔ ان کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے لیکن خاصے عرصے سے کراچی میں مقیم ہیں۔ جب سفینہ صدیقی کی سربراہی میں کوز کا آغاز ہوا تو شکیلہ اس کی بنیادی رکن بنیں۔ وہ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں رضاکارانہ شرکت کرنے والوں کے لیے ایک مثال ہیں۔

شکیلہ عبدالقادر کے بارے میں تنظیم کے ارکان متفقہ رائے یہ ہے کہ ان کے پاس نہ زیادہ تعلیم تھی، نہ ہی کام کرنے کا تجربہ تھا، لیکن ایک شعور تھا کہ بہتر طرز زندگی اور صاف ستھرا ماحول ہر ایک کا حق ہے۔ شکیلہ نے سنہ 88ء سے لے کر 98ء تک انتھک محنت کی جس کے نتیجے میں 200 ایکڑ کے رقبے میں نوے فیصد سڑکوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ علاقے کے پانچ پارکوں اور کھیل کے میدانوں پر تجارتی تعمیرات کو روکا گیا۔ عورتوں اور بچوں کے لئے ایک خصوصی پارک کی دیکھ بھال جاری ہے۔ شکیلہ نے ان تمام کاموں کے لئے کبھی کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا اور نہ ہی کسی اور ذاتی مفاد کو ملحوظ خاطر رکھا۔

شکیلہ کا کہنا ہے کہ ''ہماری تنظیم اگرچہ بہت چھوٹی ہے، لیکن اس کی کارکردگی کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے کہ پاکستان میں ماحولیات پر کام کرنے والی یہ واحد تنظیم ہے جس میں صرف عورتیں کام کر رہی ہیں۔ بے شک اب ہمیں اپنے علاقے کے مردوں کا تعاون حاصل ہے لیکن تمام تر کاوشیں اور پیش قدمی عورتوں نے کی تھی۔

شکیلہ نے اپنی تنظیم کے طریقہ کار کے بارے میں یہ بتایا کہ بہرحال ہم عورتوں کو گھرداری کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر ہماری کسی رکن کو کسی روز ضروری طور پر گھر پر رہنا مقصود ہو تو اس کی جگہ دوسری عورت کو وہ کام سپرد کیا جاتا ہے۔ اس طرح باہمی تعاون نے بھی فروغ پایا۔

شکیلہ نے 1995ء میں بیجنگ کانفرنس کے حوالے سے بنکاک میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں اپنی تنظیم کی صدر کی حیثیت سے شرکت کی۔

شکیلہ عبدالقادر شادی شدہ ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

# حنیفہ بی بی

ایبٹ آباد میں اثر ریسورس سینٹر کے زیر اہتمام ایک ورکشاپ منعقد کی جا رہی تھی۔ ملک بھر سے مختلف تنظیموں کی ارکان کے علاوہ دیگر جنوب ایشیائی ممالک کی خواتین بھی اس میں شریک تھیں۔

اجلاس کے دوران ایک طرف سے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ کارروائی میں خلل پیدا ہو رہا تھا لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کسی کے چہرے پر ملال نہیں آیا۔

یہ بچہ ماں کی گود میں تھا۔ ''اثر'' کی ایک کارکن حنیفہ بی بی اپنے بچے کو بہلاتے ہوئے بڑے دھیان سے باتیں سن رہی تھی۔ جنوب ایشیائی ممالک میں عورتوں کے مسائل، عورتوں پر تشدد، عورتوں کی ملکی سیاست میں شرکت کے مواقع اور بہت سی باتیں اور بحث مباحثے۔

حنیفہ بی بی پنجاب کے ایک ضلع میں تحصیل شکر گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ والد مسجد کے مولوی تھے۔

حنیفہ بیجنگ کانفرنس میں شریک ہونے والی دنیا بھر کہ ان 35 ہزار عورتوں میں شامل تھیں جو اپنے اپنے ممالک کی عورتوں کے مسائل کی زبان بن کر آئی تھیں۔

''میں نے شروع شروع میں ورکشاپس میں شرکت کی تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ مجھے ان کی باتیں بہت مشکل لگتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے معانی سمجھ میں آئے۔ پتہ چلا کہ ویف (WAF) کیا ہے۔ وہ کس طرح بنی۔ اس کا مقصد کیا تھا۔'' حنیفہ کہتی ہیں۔

MashalBooks.org

لاہور میں بیجنگ کانفرنس سے پہلے ایک میٹنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حسبِ معمول اجلاس سے پہلے شرکا کا تعارف ہوا۔ حنیفہ کی باری آئی۔ ان کی آواز بھر آئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

حنیفہ کی تعلیم میٹرک ہے۔

حنیفہ کو کسی موقع پر یہ احساس ہوا تھا کہ اگر ان کی تعلیم زیادہ ہوتی تو ترقی کے مواقع بڑھ جاتے۔ کچھ مرحلے آسان ہو جاتے۔

بیجنگ کانفرنس کے بعد لاہور میں ''اثر'' کے زیر اہتمام بیجنگ فالو اپ، کے نام سے ایک ملک گیر کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ وہ تمام خواتین جو بیجنگ کے عمل میں شریک تھیں وہ پھر ایک بار جمع ہوئی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بیجنگ کے بعد کیا کرنا ہے۔ اس کانفرنس میں عورتوں کی بہتری کے لئے جو فیصلے کئے گئے ہیں ان کے اطلاق کو یقینی بنانے کے لئے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

حنیفہ پھولوں کا ہار لئے سٹیج پر آئیں۔ انہوں نے اپنے ادارے کی سربراہ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم نے جو سوچا تھا انہوں نے کر کے دکھا دیا'' بیجنگ کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے لئے شعور پیدا کرنے کی مہم میں حنیفہ اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ بھرپور طریقے سے سرگرم عمل تھیں۔

حنیفہ نے واجبی تعلیم اور روایتوں کی رکاوٹ کے باوجود اپنے لئے آگے بڑھنے کی راہیں اختیار کیں۔ ناسازگار حالات کو اپنی محنت اور لگن سے موافق بنایا۔ اس یقین کے ساتھ کہ زندگی کو پسماندگی سے نکالنے کا تہیہ کر لو تو گردوپیش کے منظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اندر کی قوت کو بروئے کار لانے کا سلیقہ لو تو زمانہ ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔

محلے والے حنیفہ کی سرگرمیوں کے مخالف تھے۔ اب بیٹیوں کی شادی اور دیگر معاملات میں وہ حنیفہ سے مشورہ لیتے ہیں۔

حنیفہ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز دواؤں کی ایک کثیر القومی کمپنی میں ملازمت سے کیا تھا۔ ایکٹوزم سے تعارف اپنی کمپنی کی یونین سے ہوا جب انتظامیہ نے کئی کارکنوں کو ملازمت سے نکال دیا تھا۔ یونین کے مطالبات پورے نہیں ہو رہے تھے۔ انہی سرگرمیوں کی بنا پر حنیفہ کی اپنی ملازمت بھی جاتی رہی لیکن ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ اپنے اور دوسروں

کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنا ہی زندگی ہے۔

حنیفہ کے شوہر ایک سکول ٹیچر ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ حنیفہ کہتی ہیں ''زندگی کی ایک بڑی خواہش تھی کہ اپنا مکان ہو۔ وہ میں نے بنا لیا ہے اور یہ ''اپنا گھر'' میری محنت کا صلہ ہے۔

MashalBooks.org

# مصنفہ کا تعارف

ش-فرغ صحافی، کالم نویس، سفرنامہ نگار ہیں- بی-اے گورنمنٹ کالج فارویمن لائل پور (فیصل آباد) سے اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے جغرافیہ میں ایم-اے کیا۔ پانچ سال تک گورنمنٹ کالج فارویمن ساہیوال اور اسلامیہ کالج (آرٹش اینڈ کامرس) کراچی میں لیکچرر رہیں- گزشتہ 37سال سے کراچی میں مقیم ہیں-1969ء سے صحافت وسیلہ روزگار ہے- 24سال تک ''اخبار خواتین'' اور''مشرق'' کراچی سے منسلک رہیں- آج کل فری لانس کالم نویسی کے علاوہ خواتین سے متعلقہ امور اور دیگر معاشرتی مسائل پرفیچر سروس میں مشغول ہیں:

## مصنفہ کی دیگر کتب:

1- نئی دنیا پرانی دنیا
2- اواگون
3- زرخیز پتھر ـــــ سفرنامے
4- وہ جارہا ہے کوئی (تعزیتی مضامین)
5- ماحولیات' قانون اور ہم (تحقیق)
6- پرزے (کالموں کا مجموعہ) زیرطبع

MashalBooks.org